ذخیرۃ المجالس
(دوم)
افتخار بک ڈپو (رجسٹرڈ) اسلام پورہ لاہور۔ پوسٹ کوڈ 54000
Iftikhar
BOOK DEPOT

مجلسوں کے کورس کی دوسری کتاب

ذخیرۃ المجالس

(حصّہ دوم)

ماہِ محرم کا پورا عشرہ پڑھنے کے لیے ایک ہی آیت پر
سولہ ۱۶ مجالس اور تاریخوار مصائب

— تصنیف —

جناب حکیم سیّد غلام حیدر کرّار (مرحوم)

— بتجدیدِ نظر —

سیّد اعجاز محمّد فاضل (مرحوم)

— ناشر —

افتخار بُک ڈپو (رجسٹرڈ) اسلام پورہ لاہور

فہرست

عنوان	ذکرِ مصائب	صفحہ
مجلسوں کے کورس کی تفصیل، ہدایات، خطبات، دعا، زیارات		۳ تا ۱۳
پہلی مجلس	ہلالِ محرم اور امام حسینؑ کا ولید کے گھر جانا	۱۴
دوسری "	مدینے سے روانگی کے وقت جناب زینبؑ اور جناب صغراؑ کا حال	۲۵
تیسری "	امام حسینؑ کا روضۂ رسولؐ پر رخصت کے لئے جانا	۳۲
چوتھی "	کربلا میں آنا اور جناب حبیب ابن مظاہر کو بلانا	۳۹
پانچویں "	جناب مسلمؑ کا حال	۵۲
چھٹی "	پسرانِ حضرت مسلمؑ کا حال	۶۵
ساتویں "	شہادت حضرت عونؑ و محمدؑ	۸۰
آٹھویں "	شہادت حضرت قاسمؑ	۹۷
نویں "	حضرت عباسؑ کے حالات اور پانی کے لئے اجازت لینا	۱۱۳
دسویں "	شہادت حضرت عباسؑ	۱۲۷
گیارھویں "	شہادت حضرت علی اکبرؑ	۱۳۹
بارھویں "	شہادت حضرت علی اصغرؑ	۱۶۳
تیرھویں "	شہادت حضرت امام حسینؑ اور ذوالجناح کا حال	۱۷۶
چودھویں "	شام غریباں	۱۹۳
پندرھویں "	فوج کی روانگی	۱۹۹
سولھویں "	اسیری اہل حرم	۲۱۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

مجلسوں کے کورس کی تفصیل

میں اور والد صاحب یہ منصوبہ لے کر اُٹھے تھے کہ مجلسوں کا ایک ایسا کورس شائع کیا جائے جس کی مدد سے دینی مدرسوں کے طلباء کو خصوصاً اور عام لوگوں میں سے مبتدی حضرات کو عموماً زینہ بہ زینہ مجلیس پڑھنا سکھاتے ہوئے انہیں ہزاروں کے مجمعے میں منبر پر لا کر بٹھا دیا جائے اور وہ ایسی مجلیس پڑھیں کہ لوگ ذرا بھی اکتانے نہ پائیں بلکہ لحہ بہ لحہ تازگی اور فضائل محمد و آلِ محمد علیہم السلام سے بشاشت محسوس کریں اور جب وہ مصائب پڑھیں تو لوگوں میں اتنی رقت طاری ہو کہ سیدۂ کونین کو صحیح معنوں میں پرسہ دیا جا سکے۔

لہٰذا سب سے پہلے ضروری تھا کہ ہم آپ کو مجلیس پڑھنا سیکھنے کا صحیح طریقہ بتائیں تاکہ آپ مجلیس پڑھنا سیکھنے کی بنیاد تیر بہدف طریقہ جاننے کے بعد رکھ سکیں۔ ورنہ ڈر ہے کہ کہیں آپ غلط طریقہ سے مجلیس پڑھنا سیکھنا شروع کر دیں جس سے محنت بھی زیادہ کرنی پڑے اور پھر بھی مجلس پڑھنا نہ آئیں۔ اس لئے کتاب "خطابت مجالس سیکھنے اور نامور خطیب بننے کے طریقے" شائع کی گئی۔ آپ مجلیس پڑھنا سیکھنے سے پہلے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کر لیجئے گا۔ اس کے بعد ذخیرۃ المجالس حصہ اول سے مجلیس پڑھنا سیکھنا شروع کیجئے گا۔ اس کے علاوہ نامور خطیب بننے کے ہر مرحلے میں آپ کو رہنمائی ضرورت پڑے گی اس لئے ہم نے اس کتاب میں ہر مرحلے میں آپ کی رہنمائی کا مضمون لکھ دیا ہے۔ آپ ہر مرحلے میں، اس سے متعلق رہنمائی حاصل کر لیا کیجئے گا۔ اگر آپ نے یا کسی خطیب نے ابھی تک یہ کتاب نہیں پڑھی ہے تو فنِ خطابت کی پوری تفصیل معلوم کرنے کے لئے اب یہ کتاب پڑھ لیجئے گا۔

جناب ہم نے اس کتاب کو کورس کی پہلی کتاب قرار نہیں دیا ہے کیونکہ یہ ذخیرۃ المجالس سے سیکھنے والوں کے علاوہ بھی ہر اس شخص کے لئے بہت کارآمد معلومات فراہم

کرتی ہے جو خطابت کرتا ہو، خواہ وہ درمیانی خطیب ہو یا بڑا خطیب ہو۔ اس لئے اس کتاب کو ذخیرۃ المجالس کے طلباء کے علاوہ بھی بہت لوگ پڑھیں گے۔ تو یہ ایک الگ مستقل کتاب ہے۔

پھر مجلسوں کے کورس کی پہلی کتاب ذخیرۃ المجالس حصہ اول شائع کی گئی۔ اس میں چھوٹی چھوٹی ایسی مجلسیں ہیں جو مشہور علماء و واعظین کی ہزاروں کے مجمعے میں پڑھی ہوئی مجالس کو مختصر کر کے بنائی گئی ہیں تا کہ نیا خطیب اپنی پسند کے رنگ والی مجلس سے پڑھنا سیکھنا شروع کر سکے، سامعین کے سامنے کمزور مضمون کا شکار نہ ہو سکے، نیز ان مجالس میں یہ صفت بھی رکھی گئی ہے کہ عربی عبارت بہت کم آئے تا کہ نو آموز خطیب کو آیتوں اور حدیثوں کی عربی عبارت میں اٹکنے سے بچایا جا سکے۔ رہے مصایب تو ان پر اتنا زور دے دیا گیا ہے کہ رقت ہو سکے۔ اس کے بعد کورس کی دوسری کتاب ذخیرۃ المجالس حصہ دوم طبع کرائی گئی۔ اس میں محرم کا پورا عشرہ پڑھنے کے لئے ایک ہی آیت پر سولہ مجالس پیش کی گئیں اور مصائب، محرم کی تاریخوں کے حساب سے تاریخ وار پڑھنے کے لئے مہیا کئے گئے ہیں تا کہ نئے خطیب کو محرم کا پورا عشرہ پڑھنے کے قابل بنایا جا سکے اور اسے مصائب پڑھنے، زیارت علم وغیرہ برآمد کرانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

ہم نے اپنے طالب علم کے زینے کی تین سیڑھیاں بنانے کے بعد اسے چوتھی سیڑھی دینے کے لئے یہی پرانا طریقہ کار اختیار نہیں کیا کہ اسے حصہ دوم کے بعد حصہ سوم دے دیتے اور اس میں ذرا بڑی مجالس لکھ دیتے بلکہ ہم نے اپنے طالب علم کو آگے بڑھانے کے لئے یہ ٹیکنیک استعمال کی کہ کورس کی تیسری کتاب ذخیرۃ المجالس کے حصہ سوم میں اسے ذرا بڑی مجالس بھی دیں اور اسے اپنے پروں پر اُڑانے کے لئے تاریخ طبری کا خلاصہ کر کے بھی دے دیا تا کہ وہ جناب رسول خداؐ سے لے کر جناب مختار کے ذریعے امام حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے تک کے واقعات سے واقف ہو جائے اور تاریخ اسلام سے متعلق سوال کرنے والوں کو جواب دینے کے قابل بن جائے۔

ان تین کتابوں سے طلباء اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ خود مجالس کا مضمون بنا کر

مجلسیں پڑھ سکیں لیکن جس طرح بچے کی شروع شروع میں چلنے میں ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں اور چلنے پر پوری گرفت نہیں ہوتی اسی طرح طلباء کی مجلسیں پڑھنے پر پوری گرفت نہیں ہوتی۔ انہیں مجلسوں پر پوری گرفت حاصل کرنے کے لئے حصہ چہارم میں ایسی گیارہ مجلسیں مہیا کی گئی ہیں جو ذخیرۃ المجالس حصہ سوم کی مجالس سے ذرا بڑی ہیں۔ اس لئے اس کتاب کے بعد طلباء نامور خطیب ہزاروں کے مجمع میں مضمون پڑھتے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کے بعد طلباء نامور خطیبوں کی طرح خود مضمون بنا کر ہزاروں کے مجمع میں مجلسیں پڑھا کریں گے۔ اس لئے یہ اس کورس کی آخری کتاب ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل و کرم سے اور محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کے صدقے سے اب ہمارا مجلسیں پڑھنا سکھانے کا منصوبہ مکمل ہوگیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کے صدقے میں ہمارے اس ہدیئے کو قبول فرمائے اور اس کورس سے مجلسیں پڑھنے والے خطیبوں کو نامور خطیب بنائے۔ آمین۔

☆☆☆☆

اس کتاب سے مجلسیں پڑھنا سیکھنے کے طریقے

کتاب خطابت مجالس سیکھنے اور نامور خطیب بننے کے طریقے اور ذخیرۃ المجالس حصہ اوّل سے مجلسیں پڑھنا سیکھنے کے بعد اب ظاہر ہے کہ آپ اس کتاب سے نہ مجلسیں رٹیں گے اور نہ اپنے الفاظ میں اپنی کاپی پر لکھیں گے۔ بلکہ اس کتاب سے کسی مجلس کا مطالعہ کریں گے اور اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں مجلس پڑھیں گے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب کا مضمون آپ کا اپنا مضمون نہیں ہوتا۔ مجلس پڑھتے وقت بھی وہ کتاب ہی کا مضمون ہوتا ہے۔ اور کوئی مقرر جب کتاب کا مضمون مجلس میں پڑھتا ہے تو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اس مضمون کو ہضم نہ کرلے اور اپنا مضمون نہ بنا کر پڑھے۔ علم تاثر کی رو سے وہ مضمون سامعین میں جذب نہیں ہوتا۔

جب مقرر کتاب کے مضمون کا مفہوم اپنے اندر واضح کر لیتا ہے اور وہ اسے اپنا مضمون بنا کر مجلس میں پڑھتا ہے، تب کامیابی ہوتی ہے۔ تب وہ مضمون سامعین میں جذب ہوتا ہے۔ خطیب کھل کر پڑھتا ہے۔ دب کر نہیں پڑھتا۔ اس کی آواز کا اُتار چڑھاؤ، چہرے کے تاثر، لہجہ اور اشارے وغیرہ سب کچھ سامعین میں جذب ہوتا چلا جاتا ہے۔ خطیب و سامعین ایک جان اور محو ہو کر رہتے ہیں۔

لہٰذا اس کتاب کی کسی مجلس کا انتخاب کر لیجئے۔ اسے غور سے اور کم رفتار سے پڑھیئے۔ جب ایک نکتے کا مضمون ختم ہو جائے تو وہ نکتہ اپنی کاپی میں نوٹ کر لیجیئے۔ بہتر نتیجہ نکالنے کے لئے اس مضمون کو تین چار مرتبہ پڑھیئے۔ پھر نکتہ اپنی کاپی میں لکھیئے۔ پھر کاپی میں لکھی ہوئی تحریر کو رٹ لیجئے۔ گویا ساری مجلس آپ کو زبانی یاد ہو گئی ہے۔ اب اس مجلس کو تنہائی میں پڑھ کر مشق کیجیے۔ کئی دفعہ مجلس پڑھنے کی مشق سے مضمون بہت اچھا پیدا ہو جائے گا۔ (جتنی جگہ لفاظی ہے تو لفاظی کو رٹ لیجیئے۔)

ایک مجلس سے کام نہیں چلے گا۔ چار، چھ مجالس کے نکتے لکھ لیجئے۔ آپ کو خود مضمون بنانا آ جائے گا۔

☆☆☆

مجلسیں پڑھنا سیکھنے کا طریقہ

اس کتاب میں تو ہم مجلسیں پڑھنا سیکھنے کا طریقہ، مختصر ہی لکھ سکتے ہیں۔ تفصیل سے معلومات حاصل کرنے کے لئے کتاب "خطابت مجالس سیکھنے اور نامور خطیب بننے کے طریقے" ملاحظہ فرمالیجئے گا۔

۱۔ کامیاب مجلس پڑھنے کے لئے عمر کی یہ بات یاد رکھئے کہ بغیر پہلے سے تیاری کئے ہوئے ہرگز مجلس مجلس نہ پڑھیئے۔

۲۔ پوری مجلس کی ایک دم تیاری نہ کیجئے اور نہ ہی پورا پورا صفحہ ایک دم یاد کیجئے بلکہ ابتدا ایسے کیجئے کہ پہلے یا تو کتاب سے کوئی خطبہ پسند فرمالیجئے یا مختلف خطبوں سے تھوڑا تھوڑا مضمون لے کر اپنی پسند کا خطبہ بنالیجئے۔ پھر اسے اپنی نوٹ بک میں لکھ کر زبانی یاد کرلیجئے۔

۳۔ خطبہ یاد کرنے کے بعد اس کا لہجہ متعین کرنا ہے کہ کس لہجے میں ادا کیا جائے۔ پہلے خطبے کا ایک فقرہ لیجئے اور تنہائی میں اسے مختلف لہجوں میں ادا کرکے دیکھئے، جو لہجہ پسند آجائے اس پر خوب مشق کیجئے، یہاں تک کہ آواز پھٹنے کا نقص اور لہجے سے ہٹ جانے کا نقص دور ہو جائے۔۔ آگے سبق لینے میں جلدی نہ کیجئے بلکہ چار دن یا ایک ہفتہ اسی فقرے کا لہجہ خوب پکا یئے یہاں تک کہ بلا ارادہ زبان سے خود بخود صحیح طرز میں ادا ہونے لگے۔

۴۔ پھر اگلے فقرے پر لہجہ پکایئے جب اس پر مہارت ہو جائے تو اسی طرح ایک ایک فقرے پر مشق کر کے مکمل خطبہ تیار کرلیجئے۔

۵۔ آیت کو بھی زبانی یاد کرلیجئے اور اس کی ادائیگی کا لہجہ پسند کر کے اس پر بھی خوب مشق کیجئے۔ اپنے پسندیدہ خطیبوں کے لہجے کو بغور سنیئے اور کسی کی طرز ادائیگی کو اپنالیجئے۔

۶۔ اب اُردو میں ترجمہ اور مضمون شروع ہو جائے گا۔ یہاں آپ نے چست ہو کر بیٹھنا ہے۔ صلواۃ وغیرہ بھجوا کر سامعین کو خوب چست کرنا ہے۔ تقریر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں وغیرہ سے اشارے بھی کرنے ہیں اس لئے کمرہ بند کر کے کرسی یا منبر پر بیٹھئے۔ ہر فقرے کو مختلف فطری لہجوں میں (جس طرح کی بات چیت کے درمیان کسی کو متاثر کرنے

کے لئے بولا جاتا ہے) ادا کر کے دیکھئے۔ اور دیکھئے کہ کس لہجے اور کس اشارے کا زیادہ اثر ہوتا ہے اُسی کی مشق کر لیجئے۔ یاد رکھیئے فضائل میں بشاش چہرہ رکھیئے کیونکہ مجلس ہو یا باہر، لوگ بشاش چہرہ دیکھنا اور ہنسانے والی باتیں پسند کرتے ہیں۔ خوب چُست ہو کر اور مجمع سے اس طرح مانوس ہو کر بولیئے کہ وہ آپ کو دیکھنے اور آپ کی باتوں میں کھو جائیں۔ جتنی آپ سامعین کے ذہنوں سے دلچسپی لیں گے، اتنی ہی وہ آپ میں دلچسپی لیں گے۔ یہ کبھی نہ کہیئے کہ میرا گلا خراب ہے یا میں بیمار یا تھکا ہوا ہوں ورنہ مجمع بددل ہو جائے گا۔

۷۔ تھوڑے تھوڑے فقرے لیکر ان پر تیاری اور مشق کر کے پوری مجلس یاد کر لیجیئے۔

۸۔ کامیاب مصائب پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے اوپر مصائب آلِ محمدؐ کا اثر طاری کیجئے یہاں تک کہ آپ کا دل بھر آئے، تب آپ کی آواز میں خود بخود کرب اور سوز پیدا ہو جائے گا۔ غمزدہ ہو کر خوب کھلی آواز سے مصائب پڑھیئے اگر آپ واقعی سامعین کو رُلانے کا تہیہ کر کے مصائب پڑھیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ نہ روئیں۔

۹۔ اگر آپ ادائیگی کا لہجہ اور اشارے سیکھنے کے لئے کوئی دوسرا شخص اپنے ساتھ کمرے میں رکھیں جو آپ کی اصلاح کرتا جائے تو یہ بہت زیادہ بہتر ہوگا۔

۱۰۔ یہ ریاض صرف شروع شروع میں کرنے کی ضرورت ہے پھر خود بخود آپ اپنے اختیار کردہ رنگ پر رواں ہو جائیں گے۔

اعجاز محمد (فاضل) مرحوم

کتاب کے مؤلف اعجاز محمد (فاضل) کچھ عرصہ قبل بقضائے الٰہی وفات پا چکے ہیں۔ خداوند عالم بحق محمد و آلِ محمدؐ ان کی مغفرت فرمائے۔ اِدارہ ان کے پسماندگان کو تعزیت پیش کرتا ہے

(ادارہ)

خطبہ (۱)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ اللَّعِیْنِ الرَّجِیْمِ ؕ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِ نْسَانَ وَعَلَّمَہُ الْبَیَانَ وَشَرَّفَہٗ عَلٰی سَائِرِ الْحَیَوَانِ بِالنُّطْقِ وَالْبَیَانِ وَکَرَّمْنَا وَفَضَّلْنَا عَلَی الْاُمَمِ السَّابِقَۃِ بِالتَّصْدِیْقِ وَالْاِیْمَانِ وَھُوَ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ۔ ثُمَّ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ ، خَیْرُ الْمُبَشِّرِیْنَ وَالْمُنْذِرِیْنَ ، شَفِیْعِ الْمُذْنِبِیْنَ وَالْمُجْرِمِیْنَ ، اَلْمُخَاطَبُ بِطٰہٰ وَالْیٰسِیْنَ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ ، اَلَّذِیْ قِیْلَ فِیْ شَانِہٖ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ، ثُمَّ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی وَلِیِّہٖ وَوَصِیِّہٖ وَ خَلِیْفَتِہٖ وَوَزِیْرِہٖ وَصَاحِبِ لِوَاءِہٖ وَصَاحِبِ مِنْبَرِہٖ اَلَّذِیْ قَالَ سَلُوْنِیْ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ عَلِیْ اِبْنِ اَبِیْ طَالِبٍ سَیِّدُ الْوَصِیِّیْنَ ، ثُمَّ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْغُرِّ الْمَیَامِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ ، وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِھِمْ اَجْمَعِیْنَ مِنْ یَوْمِنَا ھٰذَا اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنَ ، اٰمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ، اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِ اُمُبِیْنِ وَ ھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ وَقَوْلُہُ الْحَقُّ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ اس کے بعد وہ آیت پڑھیے جسے عنوانِ بیان قرار دیتا ہو۔

خطبہ (۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ اللَّعِیْنِ الرَّجِیْمِ ہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَشَرَّفَہٗ عَلٰی سَائِرِ الْحَیْوَانِ وَفَضَّلْنَا وَکَرَّمْنَا عَلَی الْاُمَمِ السَّابِقَۃِ بِالتَّصْدِیْقِ وَالْاِیْمَانُ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَی الرَّسُوْلِ الْمُسَدَّدِ اَلْمُصْطَفٰے اَلْاَمْجَدِ اَلْمَحْمُوْدِ الْاَحْمَدِ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ ثُمَّ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اِبْنِ عَمِّہٖ وَوَزِیْرِہٖ وَوَصِیِّہٖ وَخَلِیْفَتِہٖ وَصَاحِبِ لِوَائِہٖ عَلِیِّ اِبْنِ اَبِیْ طَالِبٍ غَالِبٌ عَلٰی کُلِّ غَالِبٍ مَطْلُوْبِ کُلِّ طَالِبٍ اِمَامَ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ ثُمَّ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی فَاطِمَۃَ الزَّھْرَاءِ سَیِّدَۃِ النِّسَاءِ الْعَالَمِیْنَ الَّتِیْ قَالَتْ بَعْدَ وَفَاتِ اَبِیْھَا یَا اَبَتَاہُ : صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّھَا ہ صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا ہ ثُمَّ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی وَلَدِھَا الْحُسَیْنِ الْغَرِیْبِ الْعَطْشَانِ الْمَظْلُوْمِ الْمَذْبُوْحِ الَّذِیْ حِیْنَ صَارَ وَحِیْداً فَرِیْداً فَقَالَ نَاظِراً یَمِیْناً وَشِمَالاً ھَلْ مِنْ نَاصِرٍ یَنْصُرُنَا ھَلْ مِنْ مُغِیْثٍ یُغِیْثُنَا ثُمَّ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَی السَّیِّدِ السَّجَّادِ الْحَزِیْنِ الْاَسِیْرِ الَّذِیْ قَالَ : اُقَادُ ذَلِیْلاً فِیْ دِمَشْقَ کَاَنَّنِیْ ہ مِنَ الزَّنْجِ عَبْدٌ غَابَ عَنْہُ نَصِیْر ، وَلَعْنَتُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِھِمْ اَجْمَعِیْنَ مِنْ یَوْمِنَا ہ ھٰذَا اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اٰمِیْن یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ ط

مجلس کے بعد مانگنے کے لئے دعا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ؕ اَللّٰهُمَّ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ الرْزُقْنَا بِهِمْ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَالدْفَعْ عَنَّا بِهِمْ شَرَّ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَللّٰهُمَّ الرْزُقْنَا فِيْ الدُّنْيَا زِيَارَتَ الْحُسَيْنِ وَفِي الْاٰخِرَةِ شِفَاعَتَ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا فِيْ مُحَبَّتِ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ جْعَلْنَا مِنْ اَنْصَارِ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ جْعَلْنَا مِنَ الْبَاكِيْنَ فِيْ عَزَاءِ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ اَحْشُرْنَا فِيْ تَحْتَ لِوَاءِ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ اُحْشُرْنَا فِيْ زُمْرَةِ شِيْعَةِ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ اَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مِنْ بَابِ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَتَوَصَّلْنَا اِلٰى مُرَادِنَا وَمَطْلُوْبَنَا بِحَقِّ الْحُسَيْنِ اَللّٰهُمَّ لَاتُفَرِّقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ طَرْفَةَ عَيْنٍ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ؕ

ترجمہ

یا اللہ! تجھے صدقہ محمدؐ و آل محمد علیہ السلام کا، پروردگار تو ہمیں ان کے صدقے میں دنیا و آخرت کا بہترین رزق عطا فرما۔ یا اللہ! ان کے صدقے میں تو ہم سے دُنیا و آخرت کے شر کو دور رکھنا۔ پالنے والے! ہمیں دُنیا میں زیارت حسین علیہ السلام اور آخرت میں

شفاعتِ حسینؑ علیہ السلام نصیب ہو۔ یا اللہ! ہمارے دلوں میں محبتِ حسینؑ کو زیادہ کر۔ پروردگار! ہمیں مرنے کے بعد انصارِ حسینؑ میں شمار کرنا۔ پالنے والے ہمیں عزائے حسینؑ میں رونے والا قرار دینا۔ یا اللہ! حشر کے دن ہم لواءِ حسینؑ کے نیچے ہوں۔ بارالہا! ہمیں امام حسینؑ کے شیعوں کے زُمرے میں محشور کرنا۔ پروردگار! ہمیں جنت میں بابِ حسینؑ سے داخل کرنا۔ یا اللہ! حسینؑ مظلوم کے صدقے میں ہمارے گناہوں کو معاف کردے اور ہمیں ہماری مرادوں اور حاجات کو پہنچادے۔ پروردگار! ہمیں دُنیا و آخرت میں پلک جھپکنے کے وقت کے برابر بھی محمدؐ و آلِ محمدؐ کے دامن سے جدا نہ کرنا۔ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن۔

زیارتِ حضرت امام حسین علیہ السلام

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَامَوْلَایَ اَبَاعَبْدِاللّٰہِ ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَابْنَ اَمِیْرِالْمُؤْمِنِیْنَ وَابْنَ سَیِّدِ الْوَصِیِّیْن ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا بْنَ فَاطِمَۃَ الزَّھْرَاءِ سَیِّدَۃَ النِّسَآءِ الْعٰلَمِیْن ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَابْنَ خَدِیْجَۃُ الْکُبْرٰی ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ وَعَلٰی جَدِّکَ وَاَبِیْکَ وَعَلٰی اُمِّکَ وَاَخِیْکَ ،اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ وَعَلٰی سَائِرِ الْمُسْتَشْھِدِیْنَ مَعَکَ جَمِیْعًا فَیَالَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزُ فَوْزاً عَظِیْمًا. اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ہ

زیارتِ حضرت اِمام علی رضا علیہ السّلام

اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا غَرِیْبَ الْغُرَبَآءِ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا مُعِیْنَ الضُّعَفَآءِ وَالْفُقَرَآءِ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا شَمْسَ الشُّمُوْسِ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا اَنِیْسَ النُّفُوْسِ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَآ یُّھَا الْمَدْفُوْنِ بِاَرْضِ طُوْسَ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا مُغِیْثَ الشِّیْعَۃِ وَالزُّوَّارِفِیْ یَوْمِ الْجَزَاءِ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا سُلْطَانَ الْعَرَبِ وَالْعَجَمْ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا اَبَا الْحَسَنِ یَا عَلِیَّ بْنَ مُوْسَی الرِّضَاوَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ہ

زیارت حضور صاحب الامر امامِ زمانہ

عجل اللہ فرجہٗ

اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا صَاحِبَ الْعَصْرِ وَالزَّمَانْ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا شَرِیْکَ الْقُرْاٰنْ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا مَظْھَرَ الْاِیْمَانْ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا خَلِیْفَۃَ الرَّحْمٰنْ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا اِمَامَ الْاِنْسِ وَالْجَانْ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا اِمَامِ زَمَانِنَا ھٰذَا ، عَجَّلَ اللّٰہُ تَعَالٰی فَرَجَکَ وَسَھَّلَ اللّٰہُ تَعَالٰی مَخْرَجَکَ وَظُھُوْرَکَ ، وَجَعَلْنَا مِنْ عَوَانِکَ وَاَنْصَارِکَ ، اَلسَّلامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ہ

☆☆☆

پہلی مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ؕ

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ تم سے تبلیغِ رسالت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ میرے اقرباء سے محبت کرو۔

ایک وقت تھا کہ کفارِ مکہ نے خود رسولؐ اللہ کو مال، دولت اور حکومت پیش کی تھی کہ جو چاہیں لے لیجیے، مگر تبلیغ اسلام کرنا چھوڑ دیجیے لیکن رسولؐ اللہ نے یہ منظور نہیں کیا تھا اور آج وہ وقت ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اجرِ رسالت کا سوال کر رہے ہیں۔ جو شخص ملنے پر بھی کچھ نہ لیتا ہو، وہ اگر سوال کرے تو یقیناً وہ سوال اہم ہوگا۔ رسولؐ اللہ نے اقربا کی محبت کا سوال کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اقربا کی محبت دُنیا کی تمام مال و دولت اور سلطنت سے کوئی بڑی چیز ہے۔

محبت کیا چیز ہے؟ حدیثِ کساء میں ارشاد ملتا ہے کہ میں نے آسمان کی چھت کو نہیں تانا، اور زمین کا فرش نہیں بچھایا، سورج و چاند کی قندیلیں نہیں لٹکائیں اور چکر کھانے والے افلاک کو نہیں بنایا، سمندروں کو روانی نہیں دی اور اس میں پھرنے والی کشتیاں نہیں بنائیں مگر ان پانچ حضرات کی محبت میں جو زیرِ کساء ہیں۔۔ تخلیقِ کائنات کا سبب محبتِ پنجتن پاک علیہم السلام ہے۔

ہر شخص اپنی قوت کے مطابق محبت یا دشمنی کا کام کرسکتا ہے۔ خدا کو محبت تھی، اُس نے اپنی قدرت سے ان کی محبت میں ایک وسیع و عریض دنیا خلق فرمادی۔ لیکن ہم خاک کے بندے ہیں اور قدم قدم پر محتاج ہیں۔ ہم اتنی بڑی دُنیا پیدا نہیں کرسکتے لہٰذا ہمارے لئے ارشاد ہوا: زَيِّنُوْا مَجَالِسَكُمْ بِذِكْرِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ لِاَنَّ ذِكْرَهٗ ذِكْرِيْ وَذِكْرِيْ ذِكْرُ اللّٰهِ وَذِكْرُ اللّٰهِ عِبَادَةٌ ۔ یعنی اپنی مجلسوں کو علی ابن ابی طالب کے ذکر سے زینت دو کیونکہ ان کا ذکر میرا ذکر ہے اور میرا ذکر اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کا ذکر

عبادت ہے۔ ہم چھوٹے تھے، ہماری طاقت کم ہے لہٰذا ہمیں بتایا گیا کہ تم ان کی محبت میں مجلسیں کیا کرو اور ان کا ذکر کیا کرو۔

جناب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے: مَنْ بَکیٰ عَلَی الْحُسَیْنِؑ اَوْ اَبْکیٰ اَوْ تَبَاکیٰ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّة۔ جو شخص حسینؑ پر روئے یا رُلائے یا رونے کی صورت بنائے اس پر جنت واجب ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حسینؑ پر صرف رو لینے سے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ رونا صرف وہی شخص کرتا ہے جسے محبت ہوتی ہے آپ نے بھلا کسی دشمن کو بھی اپنے حریف کی مصیبت پر روتے دیکھا ہے۔ نہیں، دشمن تو ہمیشہ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا، میرے حریف کو نقصان پہنچا۔ لیکن جو محبت والے ہوتے ہیں، ان سے اپنے پیارے کی مصیبت سُنی نہیں جاتی۔ ان کا دل بے قرار ہو جاتا ہے اور رو پڑتے ہیں۔ تو گویا اب حدیث کا مطلب یہ نکلا کہ جو حسینؑ پر روتا ہے وہ حسینؑ سے محبت رکھتا ہے اور جو ان سے محبت رکھتا ہے، اللہ اور رسولؐ اُسے پسند کرتے ہیں اور جسے اللہ و رسولؐ نے پسند کرلیا، اس کے جنت میں جانے میں بھلا کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ (صلواۃ)

خدا نے ان کی محبت میں زمین و آسمان خلق فرمائے مگر اس کی قدرتِ کاملہ دیکھیے کہ اس نے ان میں کیسا نظام قائم کیا۔ پہلی بات تو یہی کہ اُس نے انھیں گردش دی اور قائم و ساکن نہیں رکھا۔ اس گردش کا نتیجہ یہ نکلا کہ سورج و چاند اپنے آپ نکلنے اور غروب ہونے لگے۔ دن اور رات باری باری اپنا نظارہ دینے لگے۔ موسم خود بخود اپنے وقت پر آنے جانے لگے۔ گویا آٹومیٹک نظام قائم ہوگیا۔ اب بار بار چیزوں کو خلق کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہر درخت سے اسی قسم کے درخت نکل رہے ہیں، ہر پرندے سے اسی جیسے پرند پیدا ہو رہے ہیں۔ ہر حیوان سے اس کی نسل چل رہی ہے۔ آج دنیا میں بابا آدمؑ موجود نہیں لیکن اولادِ آدمؑ اتنی تعداد میں موجود ہے (ذرا ہنس کر) کہ منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں!

آسمان کی یہ چکی چلتے ہوئے کتنا طویل عرصہ ہوگیا لیکن ابھی تک اس کی چال میں

کوئی خرابی نہیں آئی۔ اس کا کوئی پُرزہ ابھی تک نہیں گھسا۔ اس کی چادر پُرانی اور کمزور نہیں ہوئی۔ نہ وہ کسی ایک طرف کو زیادہ جھکا نہ گرا۔ یہاں تک کہ اس کا رنگ بھی اب تک ویسا کا ویسا ہی ہے۔

انسان مضبوط سے مضبوط چیزیں بناتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ مرمت طلب ہو جاتی ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں اور پلوں کی آئے دن مرمت ہوتی رہتی ہے۔ ہم نے کئی بار سڑکوں پر تختہ لگا ہوا دیکھا ہے کہ "سڑک مرمت کے لئے بند ہے"۔ لیکن ہم نے کبھی یہ خبر نہیں سُنی کہ آسمان کی گردش روک دی گئی ہے کیونکہ اس کی چکّر کھانے والی گراری خراب ہو چکی ہے اور اب نئی بدلی جائے گی یا یہ کہ آسمان کی چادر مرمت طلب ہے اور اس میں پیوند لگائے جائیں گے۔ آسمان کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے اور پینٹنگ کا کام ہو رہا ہے!! آپ ایسی خبریں کبھی نہیں سُن سکتے۔ آسمان ہمیشہ نیا رہے گا، اس پر چمکتے ہوئے ستارے روز جھلملائیں گے۔ اور اس کی گردش جاری و ساری رہے گی۔ اس نظام کو نظامِ قدرت کہتے ہیں۔۔ اور یہ قہری نظام ہے۔

دوسرا نظام، نظامِ شریعت ہے۔ یہ صرف انسانوں کے محور پر گردش کرتا ہے۔ اور اختیاری حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انسان کو کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان نیک اعمال کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے اور جب گناہ کرتا ہے تو سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نظام بھی قہری ہوتا تو انسان کے جوہر نہیں کھل سکتے تھے۔ فرشتے بھی عبادت کرتے ہیں لیکن نہ انھیں بھوک ہے، نہ پیاس ہے، نہ تھکن ہوتی ہے اور نہ دوسرے دُنیاداری کے کام ہیں۔ جو فرشتہ سجدے میں ہے وہ حکمِ قدرت سے سجدے ہی میں رہے گا۔ جو رکوع میں ہے وہ رکوع میں ہی رہے گا۔ اِس لئے انھیں کوئی ثواب نہیں۔ لیکن فرشتوں کے برخلاف انسان کو بھوک و پیاس بھی لگتی ہے۔ تھکن بھی ہوتی ہے اور دُنیا کے کام کاج بھی مانع ہوتے ہیں۔ پھر اگر وہ ان تکالیف سے منہ موڑ کر خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے تو اُسے ثواب کا حق پہنچتا ہے اور اُس کی تھوڑی دیر کی عبادت فرشتوں کی برسوں کی عبادت سے بڑھ جاتی ہے۔

جس طرح نظامِ قدرت میں میوے، غلے وغیرہ اپنے اپنے موسم پر آتے ہیں، اسی طرح نظامِ شریعت میں بھی فصلیں ہیں۔ کبھی ماہِ رمضان میں روزوں کی فصل آتی ہے۔ کبھی ذوالحجہ میں حج کی فصل آتی ہے، کبھی عید قربان میں گوشت کی فصل آتی ہے، کبھی میٹھی عید پر کپڑوں اور سویوں کی فصل آتی ہے اور اسی طرح ماہِ محرم میں مجالس کا موسم سمجھ لیجیے یہ دس دن غمِ حسینؑ میں ماتم کرنے کے لئے مخصوص ہیں۔

جس طرح نظامِ قدرت ہر خلق کی ہوئی چیز کو نسلوں اور پیداوار کے ذریعے قائم رکھ رہا ہے اسی طرح نظامِ شریعت والے اپنے ہر کام کی حفاظت کر رہے ہیں۔ حضرت آدمؑ کو رخصت ہوئے سینکڑوں سال گزر گئے مگر بنی آدم آج بھی موجود ہے۔ گندم کا وہ دانہ جو اوّل خلق ہوا تھا۔ آج موجود نہیں لیکن اس کی جگہ ہزاروں من گندم موجود ہے۔ اسی طرح نظامِ شریعت کو دیکھ لیجیے قرآن ایک تھا لیکن آج اس کے بے شمار نسخے دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ رسولؐ کے دہنِ مبارک سے حدیثوں کے نکلے ہوئے الفاظ فضا میں گونج کر ختم ہو گئے لیکن آج سینکڑوں کتابوں کے سینوں میں وہ حدیثیں موجود ہیں۔ آپ نے نظامِ شریعت کی حفاظت کرنے والوں کو دیکھا کہ جب اسلام پر وقت آپڑا تو امام حسینؑ اور جنابِ زینبؑ نے مدینے سے نکل کر کربلا اور کوفے کے بازاروں میں اسلام کی مدد کی اور اسے مٹنے سے بچا لیا۔ حسینؑ نے خدا کے دین کو بچایا اور قدرت حسینؑ کے نام کو مٹنے سے بچا رہی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دنیا میں حسینؑ کے نام کو مٹانے کے لئے جتنی کوشش کی گئی اتنی کوشش کسی اور کے نام کو مٹانے کے لئے نہیں کی گئی۔ خلفائے بنی عباس نے تو حکومت کی سطح پر شیعوں کی نسل ہی ختم کرنے کی ٹھان لی تھی اور شیعوں کا قتلِ عام کیا جاتا تھا۔ ان کے خون سے گارا بنایا جاتا تھا اور ان کے سروں سے دیوار چنی جاتی تھی اور بعض کو زندہ ہی دیوار میں چن دیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ متوکل بادشاہ اپنے گھوڑے پر سوار جنگل میں جا رہا تھا۔ شام کا وقت ہو گیا۔ محرم کا چاند نظر آیا۔ کہنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مرتبہ کوئی محرم میں حسینؑ کا نام لینے والا نہیں ہے۔ اتنے میں کسی جانب سے مجلس کی آواز سنائی دی۔ متوکل نے آواز کی

سمت گھوڑا بڑھا دیا۔ دیکھتا ہے کہ کچھ شیعہ عورتیں چھپ کر پہاڑ کے ایک غار میں جمع ہوئی ہیں اور ایک عورت پتھر پر کھڑی ہو کر ذکرِ حسینؑ کر رہی ہے۔ دشمنِ اہل بیت یہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور اُس ذاکرہ کے نیزہ مارا جس سے اُس مومنہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ دیکھا آپ نے کہ اتنی سختیاں ہونے کے باوجود حسینؑ کا نام لینا جاری رہا۔

اب بھی یہی ہوتا ہے کہ جہاں محرم کا چاند نظر آیا۔ شیعوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سیاہ کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ امام باڑوں میں مجلسیں ہو رہی ہیں۔ لوگوں نے کام کاج سے رُخ موڑ لیا ہے۔ ایک مجلس سے دوسری مجلس میں جاتے ہیں، دوسری مجلس سے تیسری مجلس میں جاتے ہیں۔ عورتیں ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لئے ہوئے مجلس کرنے کے لئے گھروں سے نکل کھڑی ہوئی ہیں۔ مریض اپنا مرض بھول جاتے ہیں اور مجلسوں میں آ جاتے ہیں۔ بوڑھے اپنے بڑھاپے کو اعتنا میں نہیں لاتے۔ بیچارے لاٹھیاں ٹیک ٹیک کر آتے ہیں اور مجلسوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر ایک شخص حسینؑ کے غم میں غمگین ہے، ہر فرد حسینؑ کے حال پر نوحہ کناں ہے کہ یہی وہ محرم کا چاند ہے جس کی دو تاریخ کو امام حسینؑ کربلا میں وارد ہوئے تھے۔ جنابِ زینبؑ نے جب یہ چاند دیکھا تھا تو امام حسینؑ سے کہا تھا کہ بھائی! اس چاند کو دیکھ کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اور مجھ پر حزن و ملال کی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ جنابِ فاطمہ صغراؑ کو جب مدینے میں محرم کا چاند نظر آیا تو بیمار بچی نے ننھے ننھے کمزور ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیئے۔ بارالٰہا! میرے بھائی علی اکبرؑ کو اپنی حفاظت میں رکھنا اور ان کا بیاہ مجھے دیکھنا نصیب ہو۔ یا اللہ! گرمی کا موسم ہے، میرے چھوٹے بھائی علی اصغرؑ کو گرمی سے بچانا اور جیتا جاگتا رکھنا۔ پروردگار! کل مسافر اپنے گھروں کو بھرے پُرے واپس آئیں اور ہمارے گھر والے بھی خیر و سلامتی سے جلد اپنے گھر مدینہ واپس آئیں۔

۲۸۔ رجب ۶۰ھ کو حضرت امام حسینؑ مدینے سے روانہ ہوئے تھے، یزید لعین نے امام حسینؑ سے بیعت کیوں طلب کی تھی اِس کے لئے تاریخ کا مفہوم[1] یہ ہے کہ جس طرح جنابِ رسولِ خداؐ اسلام کے سربراہ تھے اسی طرح مکے میں دشمنانِ اسلام کا سربراہ

[1] تاریخ طبری

ابوسفیان تھا اور جتنی جنگیں، اُحد، خندق، بدر اور خیبر وغیرہ ہوئیں اُن سب کے لئے ابو سفیان ہی لشکر جمع کر کے لایا تھا۔ آخر کار جب اللہ کی مدد سے ہر مقام پر فتح حاصل ہوئی یہاں تک کہ مکہ بھی فتح ہو گیا۔ تو ابوسفیان کو اسلام قبول کرنے کے سوا چارہ نہ رہا اور وہ اسلام لے آیا۔

رسولؐ اللہ کے زمانے میں اسلام اتنا پھیلا کہ وسیع علاقے پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ آپؐ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان حضرت علیؑ کے پاس مسجد میں آیا اور کہنے لگا۔ یا علیؑ! رسولؐ کے بعد خلافت کا حق آپ کا ہے لیکن حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہو گئے ہیں۔ لہٰذا آپ خلافت کے لئے اُٹھیے اور اگر آپ کی مخالفت کی گئی تو میں مدینے کی سڑکوں اور گلیوں کو پیادہ اور سوار فوجوں سے بھر دوں گا۔ حضرت علیؑ ابوسفیان کی اسلام دشمنی جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ اس طرح اسلام میں تفرقہ ڈال کر کشت و خون کرانا چاہتا ہے تاکہ مسلمان آپس میں کٹ مر کر کمزور ہو جائیں۔ اس لئے آپ نے صرف اتنا کہا۔ ابوسفیان! تم اسلام کے کب سے ہمدرد ہو گئے ہو؟ میں تو دنیا کو بکرے کی ناک کے پانی کے برابر سمجھتا ہوں۔

کتاب "حیدرِ کرّار" میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمر کا زمانہ آیا تو ایک دن ابوسفیان حضرت عمر کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں مکے میں بڑی عزت و وقار سے زندگی گزارتا رہا ہوں لیکن اب ایک عام آدمی کی طرح رہتا ہوں۔ لہٰذا مجھے یا میرے بیٹے معاویہ کو بھی کوئی عہدہ دے کر کرم نوازی کیجیے۔ حضرت عمر نے اس کے بیٹے معاویہ کو شام کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔

لیکن جب حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے معاویہ کو معزول کر کے اُس کی جگہ دوسرا شخص گورنر مقرر کیا۔ معاویہ نے یہ حکم نہ مانا اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ وہ تقریباً پچاس ہزار فوج لے کر حضرت علیؑ سے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ حضرت علیؑ نے بھی اعلانِ جہاد کر دیا اور لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر حضرت علیؑ کے ساتھ چل دیے۔ یہ بھی تقریباً پچاس ہزار آدمی تھے۔ دونوں فریقین میں زبردست جنگ ہوئی۔ معاویہ کے

اکثر آدمی مارے گئے تو اُس نے پھر پچاس ہزار کا لشکر کمک کے لئے بھیجا مگر اس لشکر کو بھی سخت جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ آخر کو اس شرط پر صلح ہو گئی کہ ایک نمائندہ معاویہ کا ہو اور ایک نمائندہ حضرت علیؑ کا ہو اور یہ دونوں نمائندے مل کر جو فیصلہ کردیں وہ دونوں فریقوں کو قبول کرنا ہوگا۔ حضرت علیؑ کے لوگوں نے ابوموسیٰ اشعری کو نمائندہ بنانا چاہا جو کہ ایک بوڑھے بزرگ آدمی تھے۔ لیکن حضرت علیؑ نے منع کیا کہ یہ بیوقوف آدمی ہیں اور یہ پہلے مخالف گروہ کے آدمی تھے لیکن لوگوں نے نہ مانا اور اصرار کیا۔ آخر حضرت علیؑ نے ابوموسیٰ اشعری کو نمائندہ بنادیا اور معاویہ کی طرف سے عمر بن عاص نمائندہ مقرر ہوا۔ ان دونوں نمائندوں نے علیحدہ جگہ میں یہ بات طے کی کہ معاویہ اور حضرت علیؑ دونوں ہی کو معزول کر دیا جائے اور لوگوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ نیا خلیفہ چن لیں۔ پھر یہ دونوں اعلان کرنے کے لئے مجمع عام میں آئے۔ حضرت علیؑ کے نمائندے ابوموسیٰ اشعری نے معاویہ کے نمائندے عمر بن عاص سے کہا کہ اعلان کردو۔ مگر اس نے جواب دیا کہ آپ مجھ سے بزرگ ہیں اس لئے میں آپ پر سبقت نہیں کرسکتا پہلے آپ اعلان فرمائیے۔ حضرت علیؑ کے نمائندے ابوموسیٰ اشعری نے منبر پر بیٹھ کر اعلان کردیا کہ ہم حضرت علیؑ اور معاویہ دونوں خلیفوں کو معزول کرتے ہیں اور لوگوں کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ کسی اور شخص کو اپنا خلیفہ منتخب کرلیں۔ یہ کہہ کر وہ منبر سے اُتر آئے۔ پھر عمر بن عاص منبر پر گیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ اے لوگو! حضرت علیؑ کے نمائندے نے انھیں معزول کردینے کا اعلان کردیا ہے۔ لیکن وہ میرے خلیفہ کو معزول کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ میں اپنے خلیفہ امیر معاویہ کو معزول کرنے کا اعلان نہیں کرتا ہوں۔۔۔ لہٰذا اب امیر معاویہ ہی سب کے واحد خلیفہ رہ گئے ہیں۔ اِس اعلان پر بڑی گڑ بڑ مچی۔ کچھ لوگ حضرت علیؑ کو چھوڑ کر الگ بھی ہو گئے۔ لیکن جن لوگوں نے حضرت علیؑ کو نہیں چھوڑا وہ شیعہ کہلائے اور پھر جنگیں چھڑ گئیں۔ یہاں تک کہ جب حضرت علیؑ کی شہادت ہوئی اس وقت بھی دونوں فریقوں کے لشکر ایک دوسرے کے مدمقابل پڑے تھے۔ حضرت امام حسینؑ کا زمانہ آیا تو دونوں میں صلح ہو گئی۔ حضرت امام حسینؑ دین چاہتے تھے انھیں دین مل گیا اور معاویہ حکومت چاہتا تھا

اُسے حکومت مل گئی۔

سارا علاقہ معاویہ کے پاس چلا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ خاندان رسالت کی مقبولیت کی وجہ سے حضرت امام حسینؑ سے خطرہ ہی محسوس کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک عورت کے ذریعہ جو امام حسنؑ کے گھر میں آیا جایا کرتی تھی۔ ان کی ایک بیوی جعدہ سے یہ ساز باز کر کے کہ وہ اسے بہت سارا روپیہ دے گا اور اپنے بیٹے یزیدؒ سے اس کی شادی کرے گا حضرت امام حسنؑ کو زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔ اس نے جعدہ کو روپیہ تو دے دیا۔ لیکن یزیدؒ سے شادی کرنے کے لئے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تو اپنے شوہر کو زہر دے سکتی ہے تو یزیدؒ کو بھی مار دے گی۔

اس کے بعد معاویہ نے یہ کوشش کی کہ اس کے بعد اس کا بیٹا یزیدؒ خلیفہ بنے چنانچہ اُس نے اپنی زندگی ہی میں یزیدؒ کے لئے لوگوں سے بیعت طلب کی جسے سب نے مان لیا مگر تین اشخاص نے انکار کر دیا۔ یہ تین انکار کرنے والے شخص حضرت امام حسینؑ، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن زبیر تھے۔

جب معاویہ کے انتقال کے بعد یزیدؒ تختِ خلافت پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے ان تینوں ہی سے بیعت لینے کے احکام نافذ کر دیے اور ولید حاکم مدینہ کو لکھا کہ اگر یہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دے۔

امام حسینؑ مسجد میں شام کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ولید کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا کہ آپ کو حاکم مدینہ نے اسی وقت بلایا ہے۔ آپ گھر آئے اور جناب زینبؑ سے ذکر کیا۔ جناب زینبؑ حاکموں کی دشمنی کو خوب جانتی تھیں۔ بچپن ہی سے دیکھا تھا کہ رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ماں فاطمہؑ پر دروازہ گرایا گیا تھا، باپ علیؑ کے سر پر سجدے کی حالت میں تلوار ماری گئی تھی۔ بھائی حسنؑ کو زہر دلوا کر شہید کرایا گیا تھا اور جنازے پر تیر برسائے گئے تھے۔ بھائی حسینؑ کی جان کی طرف سے ہر وقت خطرے کا ڈر لگا رہتا تھا ذرا دیر کی جدائی سے وسواس آنے لگتے تھے لہٰذا سمجھ گئیں کہ ولید کے یہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن منع بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ روایت ہے کہ بنی ہاشم کے جوانوں نے کہا

کہ ہم آپ کو رات کے وقت تنہا نہیں جانے دیں گے۔ اٹھارہ بنی ہاشم امام حسینؑ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ تاریخ میں پوری تفصیل بیان نہیں ہوا کرتی خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اٹھارہ بنی ہاشم جناب زینبؑ کے پاس بیٹھے تھے جو فوراً امام حسینؑ کے ساتھ چل دیئے؟ نہیں۔ بات یہ ہوئی ہوگی کہ جناب زینبؑ نے کہا ہوگا کہ بھیا! اماں کی وصیت ہے، حسینؑ کو تنہا نہ چھوڑنا۔ حسینؑ! میں تمہارے ساتھ ولید کے دربار پر چلوں گی۔ جب امامؑ نہ مانے ہوں گے تو دوڑ کر بیٹوں سے کہا ہوگا۔ عونؑ و محمدؑ! ماموں کے ساتھ جاؤ۔ چھوٹی چھوٹی تلواریں گلے میں حمائل کر دی ہوں گی۔ یہ دیکھ کر حضرت عباسؑ دوڑ کر آ گئے ہوں گے۔ کہا ہوگا۔ بہن زینبؑ کیا بات ہے۔ رو کر فرمایا ہوگا۔ بھیا عباسؑ! ولید نے بھائی حسینؑ کو بلایا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ حاکم ظالم ہے۔ زمانہ حسینؑ کا دشمن ہے۔ میں حسینؑ کو تنہا نہ جانے دوں گی۔ عونؑ و محمدؑ کے تلواریں حمائل کر کے بھیج رہی ہوں کہ اگر ماموں پر کوئی خطرہ ہو تو پہلے اپنی جانیں قربان کر دینا۔ جب حضرت عباسؑ نے سُنا ہوگا۔ تو وہ بھی ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے ہوں گے۔ بنی ہاشم کے گھروں میں تلاطم آ گیا ہوگا۔ جب حضرت قاسمؑ گھر سے نکل کھڑے ہوئے ہوں گے۔ جناب مسلمؑ کے بچے تڑپ کر بھاگے ہوں گے۔ ہر بی بی نے اپنے بچوں کو امامؑ کے ہمراہ جانے کے لئے بھیجا ہوگا۔ تبھی تو آناً فاناً میں اٹھارہ بنی ہاشم مسلح ہو کر آ گئے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب امام حسینؑ ولید کے دربار میں گئے تو اٹھارہ بنی ہاشم ہمراہ تھے لیکن جب کربلا میں گئے تو وہاں ۱۹ کی تعداد لکھی ہے یعنی ان اٹھارہ کے علاوہ ایک اور بھی ہے جو کربلا کے میدان میں تو موجود ہے لیکن ولید کے دربار تک نہ گیا۔ غور کریں کہ وہ اُنیسواں کون ہے۔۔ ہائے اولاد والو! وہ ننھا علی اصغرؑ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ علی اصغرؑ بھی مچلے ہوں گے کہ بابا! ہمیں بھی ساتھ لے چلیئے۔۔ مگر حسینؑ نے بہلایا ہوگا۔ بیٹا! یہ میدان تیرے قابل نہیں ہے۔ ہائے جب کربلا کا میدان ہوگا۔ چھ لاکھ فوجیوں کا مجمع ہوگا۔ سب جوان موت کی آغوش میں پہنچ چکے ہوں گے۔ تب تجھے میدان میں لاؤں گا۔ فوج یزید کے بے حیا سپاہیوں کے سر تو ہی تو جھکائے گا۔ تو ہی تو میری بے گناہی کا سب

سے بڑا گواہ ہے۔

غرض اٹھارہ بنی ہاشم امام حسینؑ کے ساتھ روانہ ہوئے، جب ولید کا دربار آ گیا تو امام حسینؑ نے جوانوں سے کہا کہ ولید نے صرف مجھے بلایا ہے تمھیں نہیں بلایا لہٰذا میں ہی تنہا اندر جاؤں گا۔ البتہ اگر کوئی خطرہ ہوا تو میں بلند آواز سے بولوں گا، اس وقت تم سب اندر آ جانا۔ تمام بنی ہاشم باہر رُک گئے اور صرف امام حسینؑ ولید کے پاس پہنچے۔ ولید نے یزید کا خط پڑھ کر سُنایا اور کہا کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے اور یزید جانشین بن گیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ حسینؑ سے کہو کہ یا تو وہ میری بیعت کر لیں ورنہ اُن کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔

امام حسینؑ نے مصلحتاً کہا کہ بیعت کا معاملہ دن کو اور علی الاعلان ہونا مناسب ہے۔ یہاں پوشیدہ اور رات کے وقت بیعت لینے سے کیا فائدہ؟ یہ سن کر ولید تو مطمئن ہو گیا۔ مگر مروان جو اس وقت وہاں بیٹھا تھا، ولید سے کہنے لگا کہ اِسی وقت ان سے بیعت لے لے ورنہ سر قلم کر لے۔ اگر تو اس وقت چوک گیا تو یاد رکھ کہ حسینؑ کا سر قلم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ سُننا تھا کہ امام حسینؑ نے غصے سے فرمایا۔ تیری کیا مجال ہے جو تو حسینؑ کا سر قلم کر سکے۔ ذرا آواز کا بلند ہونا تھا کہ اٹھارہ بنی ہاشم آناً فاناً دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے اور حضرت عباسؑ سب سے آگے تھے اُنھوں نے مروان کو دبوچ کر اُٹھا لیا کہ زمین پر پٹخ کر ماردیں لیکن امام حسینؑ نے منع کر کے چھڑوا دیا۔

امام گھر واپس آئے دیکھا کہ جناب زینبؑ دروازے پر کھڑی انتظار کر رہی ہیں بہن کو حالات معلوم ہوئے۔ جس چیز کا ڈر تھا وہی حالات سامنے تھے۔ یعنی حاکم وقت نے بیعت طلب کر کے ایک مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ طے پایا کہ مدینہ کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن چھوڑیں کیسے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ۔ جناب صغریٰؑ بیمار، بی بی زادیوں کو سفر در پیش ہے۔ جناب قاسمؑ، جناب علی اکبرؑ جناب عباسؑ، سے مدینے کی گلیاں چھٹ رہی ہیں۔ پیارے نانا جناب رسولؐ خدا کی قبر سے جُدا ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ والدۂ گرامی جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی قبر مبارک چھوڑ کر کیسے چلے جائیں۔

قاعدہ ہے کہ مسافر کو وطن چھوڑنے میں تکلیف ہوتی ہے لیکن جس کامیابی کی اُمید اُسے منزل پر پہنچنے میں ہوتی ہے اس کے سبب سے وطن چھوڑنے کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ لیکن امام حسینؑ جس سفر پر جا رہے تھے اس میں کونسی راحت و آرام تھا کہ جس کے سبب سے مدینہ چھوڑنے میں کچھ آسانی ہو جاتی۔ حسینؑ جانتے تھے کہ یہ خوب رو کڑیل جوان میرے خاندان کی زینت ہیں تہ تیغ کر دیے جائیں گے۔ یہ بچے جو ماؤں کی آرزوئیں ہیں اپنی ماؤں سے جُدا کر دیے جائیں گے۔ یہ عورتیں جو سورج کو کبھی بھی اپنا سر نہیں دکھاتیں، کوفے کے بھرے بازاروں میں قیدی بنا کر اور ہاتھ پشت کی طرف باندھ کر اونٹوں پر ننگے سر پھرائی جائیں گی۔ کبھی شام کا بازار ہوگا۔ کبھی یزید کا دربار ہوگا۔ دکھ بھرے یتیم بچوں اور بیبیوں کے لئے تنگ و تاریک قید خانہ ہوگا۔ زمین کا فرش اور کھانے کے لئے بھنا ہوا خشک غلہ اور چند روٹیاں ہوں گی۔ پانی اتنا کم دیا جائے گا کہ بچے بھی پوری طرح سیراب نہ ہو سکیں گے۔

ایک دفعہ جناب امام زین العابدینؑ نے جناب زینبؑ کو دیکھا کہ تیمم کر کے بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہیں۔ آپؑ نے سبب پوچھا تو جناب زینبؑ نے فرمایا۔ "ہم قیدیوں کو اتنا کم کھانا اور پانی ملتا ہے کہ بچے سیراب نہیں ہوتے اس لئے میں اپنے حصے کا کھانا اور پانی بچوں کو دے دیتی ہوں۔ کمزور ہوں بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہوں اور پانی نہیں اس لئے تیمم سے نماز پڑھ رہی ہوں"۔

اَلَا لَعْنَتُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْن ؕ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْآ اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْن ؕ

☆☆☆

دوسری مجلس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ (صلواۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کے اجر کا اس کے سوا کوئی سوال نہیں کرتا ہوں کہ میرے اقرباء سے محبت کرو۔

سوال اُسی وقت کیا جاتا ہے جب کوئی بغیر مانگے نہیں دیتا۔ مثلاً آپ نے کسی کا کام کیا اور اُس نے اُجرت نہ دی تو آپ اخلاق کے طور پر کچھ عرصے تک خاموش رہیں گے اور اس انتظار میں رہیں گے کہ شاید خود ہی اُجرت دے دے گا۔ لیکن جب آپ اس کے رویّے سے دیکھ لیں گے کہ یہ تو ٹھنڈا ہے اور اسے دینے کا فکر نہیں ہے تو پھر آپ سوال کریں گے کہ جناب والا فلاں کام کی اُجرت دلوایئے۔ یہاں بھی معاملہ کچھ اسی طرح کا معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے جب تبلیغ کا کام ختم کر دیا تو وہ اس انتظار میں رہے کہ لوگ خود ہی اجر ادا کر دیں گے۔ مگر لوگ بالکل ہی ٹھنڈے۔ انھیں اجر دینے کی فکر ہی نہ تھی۔ اس لیے اللہ نے رسولؐ سے کہا کہ انھیں ذرا چوکاؤ۔ یعنی ان سے اُجرت کا سوال کرو۔

سوال کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ رسولؐ رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ تھے اس لئے شاید ان کی رحمت کی وجہ سے لوگ یہ سمجھتے کہ تبلیغ مفت کی گئی ہے اور وہ اجر ادا کرنے کی طرف سے بے فکر رہے۔ خدا نے ان کی غلط فہمی دُور کرنے کے لئے رسولؐ سے کہلوا دیا کہ جناب! یہ مفت کا مال نہیں ہے۔ اگر اسلام لائے ہو تو تبلیغ رسالت کا معاوضہ بھی ادا کرو۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی کسی چھوٹے آدمی کے فائدے کا کام کرتا ہے تو وہ اس کے بدلے اسے خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے کام کرتا ہے۔ مگر دوسری طرف یہی شخص اس کے عزیز و اقربا سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے جس سے اسے بھی تکلیف پہنچتی ہے اور آخر وہ تنگ آ کر کہتا ہے کہ بھائی! مجھے اپنے لئے تم سے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس یہ ہے کہ تم میرے عزیزوں کو نہ ستاؤ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسولؐ اللہ کو تو خوش کرنے کے

لئے خوب خوب کام کرتے ہوں گے مگر دوسری طرف ان کے اقربا کو ستاتے ہوں گے لہٰذا رسولؐ نے فرمایا کہ تبلیغ کے بدلے میں تم جو مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہو مجھے یہ نہیں چاہیئے۔ مجھے اس بات کا اطمینان چاہیئے کہ تم میرے اقرباء کو نہ ستاؤ۔ محبت کا حکم اسی لئے دیا گیا تاکہ ستانا بند ہو جائے۔

علم نفسیات کا مسئلہ ہے کہ جب[1] کوئی شخص عرصے تک کسی کی چیز نہیں دیتا ہے تو اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس کا نفس اس چیز کو پسند کرتا ہے اور وہ اس پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس سے اپنی چیز مانگ کر حاصل کر لو مبادا کہیں وہ اسے ہڑپ کر جائے۔۔۔ کار رسالت میں رسولؐ اللہ کے علاوہ رسالت کے آبائؑ اور نفسوں نے خدمات انجام دی تھیں لیکن عقیدت صرف رسولؐ اللہ کو ادا کی جارہی تھی لہٰذا آپؐ نے ان کی محبت کا سوال کر دیا تاکہ وہ لوگ جو ان کا حق ادا کرنا نہیں چاہتے تھے دیر تک حق دبا کر انھیں اس اجر سے محروم نہ کر سکیں۔ (صلواۃ)

اُجرت کے متعلق جگہ جگہ سمجھایا گیا ہے کہ اس کی ادائیگی کتنی ضروری ہے۔ اُجرت نہ دو گے تو تمہارا عمل قابلِ قبول نہ ہوگا۔ مثلاً نمازہی کو لے لیجیے اگر نماز غصبی جگہ پر پڑھی جائے تو قبول نہ ہوگی، اسی طرح اگر لباس غصبی ہوگا یا فرش غصبی ہوگا، یہاں تک کہ اگر لباس کا دھاگہ بھی غصبی ہوگا تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ درزی کی سلائی نہ دی تب بھی نماز باطل ہے، حالانکہ دیکھا جائے تو کپڑا حلال کی کمائی سے خریدا گیا ہے، نماز میں قرآن کی تلاوت کی گئی ہے، رکوع و سجود بجالایا گیا ہے۔ خطا صرف اتنی ہے کہ درزی کو سلائی نہیں دی ہے۔ اس کی پاداش یہ ہے کہ نماز ہی باطل ہے۔ اب اندازہ کیجیے اگر کسی نے احکام نماز پہنچانے والے ہی کا معاوضہ ادا نہیں کیا تو اُس کی نماز کا کیا ہونا چاہیئے؟ پھر رسولؐ اللہ کی تبلیغ صرف نماز ہی پر تو موقوف نہیں بلکہ سارے اعمال بتائے ہیں۔ ایمان اور اسلام سب کچھ رسولؐ ہی کا تبلیغ کیا ہوا ہے۔! اب ذرا رسولؐ کا معاوضہ غصب کر کے دیکھ لیجیے۔ ایمان قابلِ قبول نہیں رہے گا۔ اسلام لانا باطل ہو جائے گا۔ غصبی لباس والے کی تو صرف نماز ہی گئی اور یہاں ایمان و اسلام دونوں رخصت۔۔ دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

[1] تجزیہ نفس۔ برٹرینڈ رسل

میں آپ کو قرآن سے بتاؤں کہ اقرباء سے محبت تو کیا، ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ "اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اُس نور پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے۔" آیت میں اللہ، رسولؐ کے علاوہ ایک نور پر بھی ایمان لانے کا حکم ہے جسے اس نے نازل کیا۔۔ یہ نور کون ہوسکتا ہے؟ آیا یہ رسولؐ کے خاکی جسم کے رشتہ دار ہیں؟ لیکن ان میں سے تو کوئی نوری نہیں تھا اور یہاں نوری ہونے کا لفظ ہے۔ آیا اِس سے مراد قرآن ہے؟ لیکن ہمیں ایک اور آیت ملتی ہے: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ یعنی اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور اور کتاب مبین آئی۔ معلوم ہوا نور اور چیز ہے اور کتاب اور چیز ہے۔ پہلی آیت میں رسولؐ اور نور آیا تھا۔ لہٰذا یہ نور قرآن اور رسولؐ کے علاوہ کوئی تیسری چیز ہے۔

رسول کی حدیث ہے: اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَاحِدٍ۔ میں اور علیؑ ایک نُور سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ رسُولؐ کے نورانی رشتہ دار یہ ہیں۔: اَلْفَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ۔ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔ یعنی میں نور ہوں تو فاطمہؑ بھی میرا نُورانی ٹکڑا ہے۔ امام حسینؑ کے لئے فرمایا۔ لَحْمُكَ لَحْمِیْ دَمُكَ دَمِیْ۔ تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔ تیرا خون میرا خون ہے۔ اپنے نورانی اقرباء کو خوب وضاحت کر کے پہنچوا دیا۔ اور میدانِ مباہلہ میں تو بالکل عملی کام ہو رہا تھا۔ ہر شخص خواہ وہ دوست ہو یا دشمن یہ پہچان رہا تھا کہ رسالت کی اقرباء یہ معزز ہستیاں ہیں جنہیں رسولؐ ساتھ لائے ہیں لیکن ان کے اجر کی ادائیگی اُمت نے کس طرح کی؟ یہ وہ واقعات ہیں کہ ان پر تیرہ سو سال سے رونے کے باوجود صبر حاصل نہیں ہوا اور نہ قیامت تک حاصل ہوسکتا ہے۔

جس علیؑ نے بے دھڑک اسلام کے لئے جنگیں لڑی ہوں اور مرحب وعنتر جیسے قوی وخطرناک دشمنوں سے مسلمانوں کو نجات دلائی ہو۔ ہائے اُمت اُس کا یہ بدلہ دے کہ مسجد میں سجدے کے وقت فریب سے اُس کے سر مبارک پر تلوار کی ضرب لگائی جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت علیؑ کی وفات کے بعد کتنے محتاج اور مسکین روئے ہیں

کہ ہمیں تو اب پتہ چلا کہ وہ علیؑ تھے جو ہمیں اندھیرے میں کھانا لا کر شفقت اور محبت سے کھلایا کرتے تھے۔ اندازہ کیجیے کہ ایسے ہمدرد آدمی کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے۔

رسولؐ کی پارۂ جگر جناب فاطمہؑ کے لئے کونسا ایسا لمحہ چھوڑا ہے جس میں وہ روئی نہ ہوں اور بے چین نہ ہوں۔ غموں کی بہتات نے دختر رسولؐ کو زیادہ عرصے جینے نہ دیا اور جلد ہی وہ اپنے پدر بزرگوار سے جا ملیں۔ بی بی ایک شعر فرماتی ہیں:

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّهَا صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

اے بابا! آپ کے بعد مجھ پر ایسے مصائب پڑے کہ اگر دنوں پر پڑتے تو راتوں کی طرح تاریک ہو جاتے اور امام حسینؑ کے اتنے دشمن بڑھ گئے تھے کہ باہر تو کیا گھر میں بھی دشمنوں سے محفوظ نہ تھے اور بیوی ہی دشمنِ جاں بنی ہوئی تھی۔

پنجتن پاک کی پانچویں اور آخری ہستی جناب امام حسینؑ باقی رہ گئے تھے، جو مدینے میں رہتے تھے۔ لیکن ان پر عرصۂ عافیت اتنا تنگ کیا گیا کہ شدید گرمی کے موسم میں انھیں عورتوں اور بچوں کو لے کر مدینے سے نکلنا پڑا۔

آپ نے وہ محضر جس میں سفر پر ہمراہ جانے والوں کے نام تھے منگوا کر پڑھا تو اس میں جناب زینبؑ کا نام نہیں پڑھا اور اس میں جناب صغریٰ کا نام ہی نہیں تھا۔ جناب زینبؑ نے گھبرا کر پوچھا۔ بھائی! کیا غضب ہے میرا نام فہرست میں نہیں ہے۔ میں تو ہرگز آپ کو تنہا جانے نہیں دوں گی۔ اپنی والدہ کو کیا منہ دکھاؤں گی جنہوں نے مجھے آپ کو اکیلے نہ چھوڑنے کی وصیت کی تھی۔ حضرت نے فرمایا بہن! اپنے شوہر سے اجازت لے کر چل سکتی ہو۔ یہ سُنتا تھا کہ جناب زینبؑ نے فوراً ردا سر پر رکھی اور گھر کی طرف چلیں۔ شکر ہے، ردا تھی۔ ایک وقت وہ آیا جب اشقیاء نے سب کی ردائیں چھین لی تھیں اور سر برہنہ عورتوں کو اونٹوں پر پھرایا جا رہا تھا۔

جناب زینبؑ گھر جا تو رہی تھیں مگر طرح طرح کے وسوسے دل میں آتے تھے۔ یہ سفر عارضی دس بیس دن کا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے مدینہ چھوڑنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شوہر اس سفر کے لئے اجازت نہ دیں۔ اور اگر اجازت نہ ملی تو بھائی کے بغیر کیسے رہ

سکوں گی۔ اماں نے اپنا نائب بنایا ہے اور ہدایت کی ہے کہ جہاں جہاں حسینؑ جائیں زینبؑ تم بھی ساتھ ساتھ جانا۔ یہی سوچتے سوچتے گھر آگیا۔ ڈرتی ڈرتی گھر میں داخل ہوئیں۔ دیکھا کہ جناب عبداللہ بیٹھے ہیں۔ اپنے مطلب کو زبان پر نہ لاسکیں۔ ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر جناب عبداللہ کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ جناب عبداللہ حضرت زینبؑ کی بہت قدرومنزلت کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ یہ فاطمہؑ کی بیٹی، علیؑ کی چہیتی اور رسولؐ کی نواسی ہیں لہٰذا جب اُنھوں نے جناب زینبؑ کو اس حال میں دیکھا تو گھبرا کر پوچھنے لگے۔ بنتِ فاطمہؑ! یہ کیا حال ہے؟ **هَلْ لَكِ حَاجَةٌ** " کیا تمہیں مجھ سے کوئی حاجت ہے؟ یہ سُنتا تھا کہ جناب زینبؑ اپنے ہاتھ جناب عبداللہ کے پاؤں کی طرف بڑھانے لگیں۔ عبداللہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے اور کہا۔ اے زینبؑ مجھے گنہگار نہ کرو۔ جلدی بیان کرو کیا چاہتی ہو؟ جناب زینبؑ نے کہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے بھائی حسینؑ پر کیسا وقت ہے۔ دشمن ان کو وطن میں رہنے نہیں دیتے۔ اب وہ سفر کر رہے ہیں۔ میں اس سفر میں اماں کی نائب ہوں لیکن آپ کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکتی ہوں لہٰذا مجھے اجازت دے کر احسان فرمایئے! جناب عبداللہ نے جناب زینبؑ کو اجازت دے دی جناب عبداللہ اس وقت بیمار تھے اس لئے خود نہیں جاسکتے تھے۔ اس لئے کہا کہ میرے دونوں فرزند عونؑ اور محمدؑ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ اگر حسینؑ پر کوئی وقت پڑ گیا تو انھیں میری طرف سے قربان کردینا۔ جناب زینبؑ خوشی خوشی بھائی کے پاس آئیں اور امام حسینؑ ان کو سفر میں ہمراہ لے جانے کے لئے رضامند ہو گئے۔

اس کے بعد جناب امام حسینؑ جناب صغریٰؑ کے پاس گئے۔ دیکھا کہ بیمار ہیں اور ماں پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ جناب صغریٰؑ نے جب امام کو آتے دیکھا تو تعظیم کے لئے اُٹھنا چاہا لیکن کمزوری سے اُٹھا نہ گیا۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ بیٹی! اُٹھو نہیں۔ یہ بتاؤ اب کیسی طبیعت ہے۔ ہم تو رات میں بھی کئی دفعہ تمہیں دیکھنے کے لئے آئے مگر تم بیہوش تھیں اور غفلت میں کراہ رہی تھیں۔ مجھے تمہاری طرف سے بہت فکر ہے۔ مجھے سفر کرنا ضروری ہے اور تمہاری ایسی حالت ہے کہ نہ ساتھ لے جاسکتا ہوں اور نہ چھوڑنے کو دل چاہتا ہے۔

جناب صغریٰ نے بابا کی طرف ہاتھ بڑھا کر بلائیں لیں اور کہا۔ بابا! میں تو ضرور ساتھ چلوں گی۔ آج میری حالت اچھی ہے۔ یہ ہاتھ دیکھئے اب بخار بھی کم ہے۔ امام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جناب صغریٰ سمجھ گئیں کہ ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ فوراً بولیں۔ بابا! آپ کو میری محبت نہیں ہے۔ آپ کو تو جناب سکینہ سے محبت ہے۔ دیکھئے بابا! اگر آپ نے مجھے چھوڑا تو میں رو رو کر مر جاؤں گی۔ حضرت نے فرمایا۔ میرے حال سے اللہ واقف ہے۔ میں تو تمہیں خوشی سے لے چلتا مگر خدا کی مرضی یہی ہے۔ ہاں اگر کوفہ والوں نے وفا کی تو تمہیں ضرور بلواؤں گا۔ جناب صغریٰ نے ماں کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہا۔ اماں جان! کیا بیماری میں آپ بھی مجھے تنہا چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ جناب بانو نے سمجھایا۔ بیٹی! ایسی بات نہیں ہے۔ اگر مصلحت نہ ہوتی تو تمہارے بابا تمہیں ضرور اپنے ساتھ لے جاتے۔ جناب صغریٰ کو غصہ آگیا۔ ماں کی گود سے جدا ہو کر بیٹھ گئیں۔ کانوں سے بندے بھی نکال کر پھینک دیئے اور کہا۔ لو اماں! ہم تمہاری بیٹی نہیں ہیں۔ یہ بندے بھی سکینہ کو دے دو۔ اب میں آپ سے نہیں بولوں گی۔ قسم لیجئے۔ کل سے دوا بھی نہ پیوں گی۔ آپ کے بستر پر بھی نہیں سوؤں گی۔ جناب بانو نے سمجھایا۔ بیٹی! ماں کی کچھ خطا نہیں ہے۔ میں تو خود تمہاری طرف سے بے چین ہوں۔ مگر مصلحت سے مجبور ہوں۔ جناب زینبؑ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ بیٹی! تم تو سمجھدار ہو۔ اپنے باپ کو تنگ نہ کرو۔ وہ مجبور ہیں۔ اگر مجبور نہ ہوتے تو وہ ضرور تم کو ساتھ لے جاتے۔ یہ سُننا تھا کہ جناب صغریٰ چیخیں مار مار کر رونے لگیں اور کہا پھوپھی جان! آپ بھی مجھے تنہا رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ ہائے! میں کیا کروں۔ کوئی میری طرفداری نہیں کرتا۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ اور پھر امام حسینؑ کی طرف رُخ کر کے کہا۔ بابا! میں سمجھ گئی۔ آپ مجھے سواریوں میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں لے جانا چاہتے۔ میں آپ سے سواری نہیں مانگوں گی۔ بابا! مجھے جناب فضہ کی سواری میں بٹھا دینا۔ امام حسینؑ غم میں ڈوبے ہوئے خاموش رہے۔ کیا کرتے۔ آخر بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا، پیار کیا اور چپ کرانے کی کوشش کی۔

جب رات ہوئی تو سب رسولؐ اللہ کے روضے پر آخری رخصت کے لئے گئے۔

سب نانا ؐ کے روضے پر رو رہے تھے اور رخصت ہو رہے تھے۔ گریے کا ایک شور بلند تھا کہ دروازے سے آواز آئی۔ کسی نے کہا۔ ارے سنو سنو! دروازے پر کیسا شور ہے؟ دیکھا تو صغریٰ ؑ دروازے کے قریب آہستہ آہستہ بیٹھی آرہی ہیں۔ رسولؐ اللہ کے روضے پر آکر جناب صغریٰ نے بلند آواز میں رو کر کہا۔ نانا! سب گھر والے آپ سے رخصت ہونے کے لئے آئے ہیں۔ نانا! میں فریاد لے کر آئی ہوں، مجھے کوئی لے کر نہیں جا رہا۔ ہائے سب نے انکار کر دیا ہے۔

جناب صغریٰ ؑ سے جُدائی امام حسینؑ کے لئے بڑی مصیبت تھی۔ ہائے جب قافلہ مدینے سے روانہ ہوا تو سب عزیز دور تک رخصت کرنے آئے۔ جب رخصت کر کے واپس جانے لگے تو جناب صغریٰ بھی ایک ایک کے پاس رخصت کرنے کے لئے آئیں۔ جب حضرت علیؑ اصغر کے پاس آئیں تو بھائی کو گود میں لینے کے لئے ہاتھ پھیلائے۔ جناب علیؑ اصغر ہمک کر بہن کی گود میں آگئے۔ جناب صغریٰ نے خوب پیار کیا، گلے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جناب علیؑ اصغر کی والدہ نے بچہ واپس لینے کو کہا۔ جناب صغریٰ ؑ نے والدہ کی طرف بچہ بڑھا دیا۔ ماں نے بچہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ ایک دم حضرت علیؑ اصغر نے منہ پھیر لیا اور بہن کو چمٹ گئے۔ ماں نے بہت خوشامد کی مگر بچے نے جناب صغریٰ ؑ کی گود نہ چھوڑی۔ آخر ایک ایک بی بی نے حضرت علیؑ اصغر کو گود میں لینے کی کوشش کی مگر وہ کسی کی بھی گود میں نہ آئے۔ جناب امام حسینؑ بڑھے۔ حضرت علیؑ اصغر ان کی گود میں بھی نہ آئے۔ اُدھر جناب صغریٰ ؑ کہہ رہی تھیں کہ جب تک علیؑ اصغر خود کسی کی گود میں نہ جائیں، میں علیؑ اصغر کو کسی کو نہ دوں گی۔ قافلہ رُکا کھڑا تھا۔ حضرت علیؑ اصغر کا انتظار تھا۔ جب حضرت علیؑ اصغر کسی طرح بھی امام حسینؑ کی گود میں نہ آئے تو ایک مرتبہ امام حسینؑ نے جناب علیؑ اصغر کے کان میں کچھ کہا۔ بچہ ہمک کر فوراً امام حسینؑ کی گود میں آگیا۔ ہائے! امامؑ نے کہا ہوگا۔ علیؑ اصغر! اگر تم ہمارے ساتھ نہ جاؤ گے تو کربلا میں حرملہ کا تیر کون کھائے گا؟ بیٹا! میری بے گناہی کی گواہی تم ہی نے دینی ہے۔ جب حضرت علیؑ اصغر نے یہ سُنا فوراً بہن کی گود میں ہمکے، امام نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اونٹ کی طرف چلے۔ ہائے

جناب صغریٰ پچھاڑیں کھانے لگیں رو رو کر رخصت کے لئے ہاتھ ہلایا۔ بابا! خدا حافظ!۔ بھیا علی اکبرؑ خدا حافظ، چچا عباسؑ! خدا حافظ۔ اے قافلے والو! خدا حافظ۔!!

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ہ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْآ اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ہ

☆☆☆

تیسری مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ
قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ہ (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تبلیغ رسالت کے بدلے میں سوائے میرے اقرباء سے محبت کرنے کے اور کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔"

قرآن حکیم میں بہت سے احکام آئے ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنے کے لئے حکم آیا، روزے رکھنے کے لئے حکم آیا لیکن ان میں صورت یہ ہے کہ جو فرض ادا کر دیا، اس کا ثواب ملے گا اور جو فرض ادا نہ کیا اُس کے لئے گنہگار رہے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ اگر نماز پڑھی اور روزہ نہ رکھا تو روزے کی وجہ سے نماز کا ثواب بھی نہ ملے گا یا حج کیا اور نمازیں نہ پڑھیں تو حج کا ثواب بھی ضبط کر لیا جائے گا۔ مگر محبتِ اقرباء میں یہ بات ہے کہ اگر اقرباء سے محبت نہ کی تو پھر چاہے جتنے روزے رکھے، کتنے ہی حج کرے، رات بھر نمازیں پڑھتا رہے، کسی بات کا ثواب بھی نہ ہو گا کیونکہ جب تک عوض ادا نہیں ہو گا کوئی عمل شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔

اگر قرآن میں یہ ہوتا کہ لوگو! تم پر نماز واجب ہے۔ روزے واجب ہیں، حج واجب ہے اور رسولؐ کے اقرباء سے محبت واجب ہے، تو جو شخص نماز پڑھتا اور روزے نہ

رکھتا تو وہ روزے نہ رکھنے کا گنہگار ہوتا لیکن نماز پڑھنے کا اسے ثواب ضرور ملتا اسی طرح جو شخص حج کرتا اور رسولؐ کے اقرباء سے محبت نہ کرتا تو وہ محبت نہ کرنے کا گنہگار ہوتا مگر اسے حج کرنے کا ثواب ضرور ملتا۔ لیکن یہاں تو صورت معاوضہ کی ہے۔ اگر معاوضہ ادا کر دیا تو رسولؐ سے حاصل کیے ہوئے اعمال کا ثواب مل جائے گا ورنہ بغیر قیمت ادا کیے ہوئے مال پر تصرف جائز نہیں ہے۔

ایک دفعہ چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے کسی میوہ فروش کی دکان سے اس کی آنکھ بچا کر دو انار اُٹھا لئے۔ پھر آگے چلا اور ایک نان فروش کی دکان سے دو روٹیاں چرا لیں۔ پھر آگے بڑھا اور ایک مریض مفلس بیکس کو وہ دونوں انار اور دونوں روٹیاں دے دیں۔ امامؑ نے اس سے فرمایا کہ تو نے ایسا کیوں کیا کہ ایک جگہ سے چوری کی اور دوسری جگہ سخاوت دکھائی؟ اس نے جواب دیا۔ یا ابن رسولؐ اللہ! آپ تو جانتے ہیں کہ انسان کے ایک گناہ کے عوض میں ایک گناہ لکھا جاتا ہے اور ایک نیکی کے بدلے میں دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ پس میں نے دو انار اور دو روٹیاں اس محتاج کو دے دیں اس لئے چار کی جگہ چالیس نیکیاں لکھی گئیں۔ اب چالیس میں سے چار گناہ نکال دیجیے چھتیس نیکیوں کے ثواب کا مستحق ہوا۔

امامؑ نے فرمایا کہ تو غلط حساب لگا رہا ہے۔ درست حساب اس طرح ہے کہ تو نے چار چیزیں چرائیں، تجھے چار گناہ ہوئے۔ یہ چار گناہ تو اس بات کے ہیں کہ تو نے غیر کے مال پر غصبی قبضہ کیا۔ اب سُن! تجھے غیر کے مال پر تصرف کرنے کا حق بھی تو حاصل نہیں تھا۔ تو نے وہ مال محتاج کو دے کر اس پر ناجائز تصرف کیا اور ناجائز تصرف نیک کام نہیں ہے۔ لہٰذا تیری نیکی تو ایک بھی نہ ہوئی بلکہ ناجائز تصرف کے چار گناہ تو نے اپنے اوپر لے لئے۔ اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اگر رسولؐ کی تبلیغ کا عوض دیے بغیر نماز پڑھی جائے یعنی تصرف کیا جائے تو ثواب ہوگا یا گناہ۔ (صلواۃ)

زیر بحث بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقرباء سے محبت کی

جائے۔ اقرباء کہتے ہیں رشتہ داروں کو۔ اور رشتے پانچ قسم کے ہوتے ہیں نمبر ایک: باپ کی طرف سے رشتہ دار جیسے باپ، دادا، دادی، پردادی وغیرہ۔ نمبر دو: ماں کی طرف سے رشتہ دار جیسے ماں، نانی، نانا، ماموں وغیرہ۔ نمبر تین: بھائی بہن کی طرف سے رشتہ دار جیسے بھائی، بہن، بھتیجا، بھانجا وغیرہ۔ نمبر چار: بیوی کی طرف سے رشتہ دار جیسے سسر، ساس، سالا، سالی وغیرہ (ہنس کر) سب چھوٹے سین سے رشتے ہیں۔ نمبر پانچ: بیٹا اور بیٹی کی طرف سے رشتہ دار جیسے بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی وغیرہ۔

آیئے! رسولؐ اللہ کے رشتہ داروں میں تلاش کریں کہ کن رشتہ داروں کو اجرِ رسالت ادا کریں۔ ان سب رشتہ داروں میں سب سے کچا رشتہ بیوی کا ہوتا ہے کیونکہ لڑکی کسی گھر میں پلتی ہے اور لڑکا کسی اور گھر میں پروان چڑھتا ہے۔ جب جوان ہوتے ہیں ماں باپ رشتہ کر دیتے ہیں۔ مولوی صاحب آ کر نکاح پڑھ دیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ رشتہ داری وجود میں آتی ہے۔ کوئی سسر بن جاتا ہے، کوئی سالا بن جاتا ہے، کوئی ساس بنتی ہے اور کوئی سالی ہو جاتی ہے۔ جب تک میاں بیوی میں نبھاؤ ہو رہا ہے یہ سالا، سالی سب قائم ہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ دونوں میں کوئی ناچاقی ہو جائے اور طلاق تک نوبت آ جائے تو جیسے ہی مولوی صاحب نے طلاق کا صیغہ جاری کیا ویسے ہی سب رشتے ختم۔ اب نہ بیوی، بیوی ہے۔ نہ سُسر، سسر ہے، نہ سالا، سالا ہے۔ ساری رشتہ داری رخصت ہو گئی۔

اب بتایئے! وہ معاوضہ جس پر نماز، روزہ، حج، جہاد یعنی جان کی قربانی کا انحصار ہے، وہ اگر بیوی کے رشتہ داروں کو دے دیں اور خدانخواستہ طلاق آ جائے تو محبت کرنے والوں کا کیا بنے گا؟ کیونکہ جب شوہر بیوی ہی سے خوش نہیں اور اُسے طلاق دے بیٹھا تو وہ بیوی کے رشتہ داروں سے محبت کرنے والوں کو کب پسند کرے گا۔

آیئے! یہ معاوضہ ماں کی طرف کے رشتہ داروں کو دے دیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بسا اوقات ماں اور ذات کی ہوتی اور باپ دوسری ذات کا مثلاً ماں پٹھانی ہے اور باپ سید۔ تو اولاد تو سید ہی ہو گی کیونکہ رشتہ باپ کی طرف سے چلتا ہے لہٰذا ماں جدا

ذات کی ہو سکتی ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ ماں کو مسلمان کیا ہو یعنی نانا جان اور ماموں صاحب کافر ہوں۔ لہٰذا اس لائن کے رشتہ داروں کو بھی معاوضہ دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

چلیئے! بھائی کی طرف کے رشتہ داروں کو معاوضہ دے دیتے ہیں لیکن اس میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات باپ اپنے بیٹے کو عاق کر دیتا ہے۔ اگر کوئی عاق شدہ بھائی کا ساتھ دینے لگے تو اُسے یہ ڈر ہے کہ کہیں باپ اس کو بھی عاق نہ کر دے لہٰذا ادھر بھی چلنے سے کام نہیں چلتا۔

اب آیئے! رسولؐ کے باپ کی طرف کے رشتہ داروں کو معاوضہ دے دیجیئے۔ رسولؐ کے والد ماجد جناب عبداللہ کے پاس چلیئے۔ معلوم ہوا، ان کا انتقال تو رسولؐ کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ سوچا کہ پھر رسولؐ کے چچا ہی کو عوض ادا کر دیں۔ معلوم ہوا کہ آپؐ کے چچا ابولہب ہیں۔ جیسے ہی ابولہب کی طرف چلے، قرآن نے آواز دی: تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ یعنی ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ خوف آیا کہ ایسے کو اجرِ رسالت دیں جسے قرآن کوس رہا ہے؟

پانچویں رہ گئے بیٹا اور بیٹی کی طرف کے رشتہ دار۔ بیٹا تو کوئی رسولؐ اللہ کے ہے نہیں۔ صرف ایک بیٹی جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں۔ لہٰذا قرآن سے پوچھتے ہیں کہ آیا ہم اجرِ رسالت رسولؐ کی بیٹی کی طرف کے رشتہ داروں کو دے دیں یا نہیں۔ جواب ملے گا: فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝ یعنی (اے رسولؐ) کہہ دو کہ تم اپنے بیٹوں کو لاؤ۔ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں۔ تم اپنی عورتوں کو لاؤ ہم اپنی عورتوں کو لائیں۔ تم اپنے نفسوں کو لاؤ ہم اپنے نفسوں کو لائیں اور پھر جھوٹے گروہ پر خدا کی لعنت پڑھیں۔ قرآن نے رسولؐ کے رشتہ دار بتا دیئے اور رسولؐ نے عملاً تفسیر کر کے دکھا دی کہ بیٹوں کی جگہ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کو لے گئے، عورتوں کی جگہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو لے گئے اور نفسوں کی جگہ حضرت علیؑ کو لے گئے۔ نصرانیوں نے مباہلہ نہ کیا اور کہا کہ ان میں وہ صورتیں نظر آ رہی ہیں کہ اگر پہاڑ کو بھی

حکم دیں تو اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔(صلواۃ)

رسولؐ اللہ نے ایک ہی عمل سے نصرانیوں کو سبق دے دیا کہ ہم سچے ہیں اور مسلمانوں کو بتا دیا کہ رسالت کے عزیز و اقارب یہ ہستیاں ہیں۔ جناب امام حسنؑ کو سمجھا دیا کہ بیٹا جب دشمن صلح کی پیش کش کرے تو جنگ نہ کرنا اور حضرت امام حسینؑ کو ہدایت فرمادی کہ اے میرے پیارے نواسے! جب دشمن اسلام کو جھوٹا کرنے پر تل جائے تو جس طرح میں تم جیسے چھوٹے بچوں کو تمہاری پردہ نشین ماں کو گھر کی چہار دیواری سے میدان میں لے آیا ہوں تم بھی اسی طرح بچوں اور عورتوں کو کھلے میدان میں لانے سے دریغ نہ کرنا۔

غرض نصرانی ڈر گئے اور ان کے عالموں نے کہا کہ ہرگز ان سے مباہلہ نہ کرنا۔ اگر انھوں نے جھوٹوں پر اللہ کی لعنت پڑھ دی تو یاد رکھو کہ ساری دنیا میں ایک نصرانی بھی زندہ نہ بچے گا۔ چنانچہ انھوں نے جزیہ دینا قبول کرلیا اور اپنی جان بچائی۔ رسولؐ اللہ فتح و کامرانی کے ساتھ اپنے اقرباء کو لئے ہوئے خیر و سلامتی سے گھر واپس آئے۔

وقت گزرتا گیا۔ زمین و آسمان اپنے محور پر گردش کرتے رہے۔ دن اور رات ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہے۔ موسموں نے کتنے ہی چکر کھائے۔ بہاریں اور خزائیں کتنی ہی بار آئیں اور چلی گئیں۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بچے بوڑھے ہو گئے اور بوڑھے دُنیا سے چل بسے، سن ساٹھ ہجری آیا۔ اب نہ رسولؐ اللہ دُنیا میں باقی ہیں، نہ فاطمہؑ ہیں، نہ علیؑ ہیں اور نہ حسنؑ۔ پنجتن پاک میں صرف امام حسینؑ کی ذات باقی ہے۔ وہ حسینؑ جو مباہلے میں سب سے چھوٹے بچے تھے، آج اپنے خاندان میں سب سے معمر شخص ہیں۔ اس وقت جناب رسولؐ خدا سربراہ خاندان تھے۔ لیکن اب سن ساٹھ ہجری میں امام حسینؑ سربراہِ خاندان ہیں۔ اُس وقت نصرانیوں نے رسولؐ کو جھوٹا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور اب سن ساٹھ ہجری میں یزیدؑ امام حسینؑ سے بیعت طلب کر رہا ہے۔ رسولؐ اللہ نصرانیوں کے مقابلے میں عورتیں، بچے اور جوان لے کر میدان میں نکل آئے تھے اور یہاں امام حسینؑ عورتوں، بچوں اور جوانوں کو میدانِ کربلا میں لے آئے ہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ ۲۶۔ رجب ۶۰ھ کو بیعت طلب کی گئی اور ۲۷۔ رجب کو امام حسینؑ نے سامانِ سفر تیار کرلیا اور ۲۸۔ رجب کو روانہ ہوگئے۔ اس سے آپ امام حسینؑ کی پریشانیوں کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ جو شخص عورتوں اور بچوں کے ساتھ اتنے طویل سفر پر جارہا ہو وہ صرف ایک دن میں سفر کی تیاری کرلے! معلوم ہوتا ہے کہ یہ قافلہ اضطراب کی حالت میں مدینے سے نکلا ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ جب اہلِ مدینہ نے اچانک یہ سُنا کہ امام حسینؑ مدینے سے ہجرت کررہے ہیں تو بہت سی عورتیں اور مرد امامؑ کے گھر آئے اور سفر نہ کرنے کے لئے بہت کچھ سمجھایا۔ جناب عبداللہ بھی امامؑ کے گھر آئے تھے اور سمجھاتے رہے کہ اس گرمی میں سفر نہ کیجئے لیکن امامؑ نے فرمایا۔ بھائی عبداللہ! وہ شخص کیا کرے جسے دشمن وطن میں رہنے نہ دیں۔ پھر جناب عبداللہ نے کوشش کی کہ امام حسینؑ عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جائیں کیونکہ ان کو سفر میں بہت تکلیف پہنچے گی۔ مگر امامؑ نے فرمایا کہ نہ تو یہ عورتیں ہی مجھے چھوڑ کر یہاں رُکنے پر آمادہ ہیں اور دوسرے مجھے جناب رسولؐ خدا کی وصیت بھی یہی ہے کہ میں انھیں ساتھ لے جاؤں۔ اس پر جناب عبداللہ نے مشورہ دیا کہ تو پھر آپ مکہ تشریف لے جایئے اور مکے کے حاکم پر سفارش پہنچوائی کہ وہ امامؑ کی عزت وحفاظت کرے۔

غرض ۲۷۔ تاریخ کا تمام دن سامانِ سفر تیار کرنے میں گزرا۔ شب میں سب حضرات روضۂ رسولؐ میں رخصت کے لئے تشریف لے گئے۔ بیبیوں اور بچوں نے رسولؐ کی قبر کو گھیر لیا۔ ہر طرف سے فریاد و بکا کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ امامؑ نے عرض کیا۔ اے نانا جان! کیا آپؐ کو معلوم ہے کہ آج میں کس مقصد کے لئے آپؐ کے روضۂ مبارک پر آیا ہوں۔ نانا جان! آپ کی اُمت نے ہمیں بہت ستا رکھا ہے۔ جب سے آپؐ کا سایہ اُٹھا ہے، ہم نے ایک پل چین سے نہ پایا۔ سب ہی ہم سے بدل گئے۔ آپؐ کے بعد لوگ ہمارے گھر پر چڑھ آئے اور ہماری والدۂ گرامی پر دروازہ گرادیا۔ اُنھوں نے ہماری والدہ کو اتنا ستایا کہ جب تک زندہ رہیں، روتی رہیں، نانا جان! آپ کے بعد زمانہ اتنا بدلا کہ ہمارے پدر بزرگوار کے سر پر صحنِ مسجد میں بحالت نماز تلوار کا وار کیا گیا۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد میرے بھائی امام حسنؑ کو زہر دغا سے شہید کیا گیا۔ اور نانا جان! آج مجھ سے بھی بیعت کا سوال کیا گیا ہے اور سر مانگا گیا ہے۔ یا رسولؐ اللہ! میں کیا کروں، کدھر نکل جاؤں۔ نہ بستی میں چین ہے، نہ جنگل میں پناہ ہے۔ یہ وسیع و عریض دنیا میرے لئے تنگ ہو چکی ہے۔ دشمن مجھے مدینے میں نہیں رہنے دیتے۔ میں رخصت کے لئے آیا ہوں، میں آخری سلام کے لئے آیا ہوں۔

نانا جان! ان عورتوں کو کہاں لے جاؤں، ان بچوں کی جانیں کیسے بچاؤں۔ اب تو دُنیا سے دل بھر گیا ہے، جینے کو دل نہیں چاہتا۔ پیارے نانا! اب تو اپنے نواسے کو اپنی قبر میں چھپا لیجئے۔

امام حسینؑ فریاد کرتے کرتے غش کر گئے۔ خواب میں جناب رسولؐ اللہ کو دیکھا کہ قبر شق ہو گئی ہے اور آپؐ قبر سے باہر نکل کر کہہ رہے ہیں۔ اے حسینؑ! آؤ میں تمہیں چھاتی سے لگا لوں۔ پیارے نواسے! تیری مصیبتوں سے تو نانا بھی بے چین ہو گیا۔ امام حسینؑ نے عرض کیا۔ نانا جان! ساری دُنیا میری دشمن ہو گئی ہے۔ سب میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میں اب دنیا میں رہنا نہیں چاہتا۔ نانا! اب تو مجھے آپ اپنے پاس بلا لیجئے۔ آواز آئی۔ ہاں ہاں حسینؑ! تم سچ کہتے ہو لیکن یہ بتاؤ کہ وعدۂ طفلی ادا کر چکے ہو؟ ذبح عظیم پر عمل کر لیا ہے؟ کربلا کے ظلم سہہ لئے ہیں؟ اسلام کی حفاظت تکمیل کو پہنچی یا نہیں؟ اُمت کی نجات کا وسیلہ بنا ہے یا نہیں؟ حسینؑ! یہ بتاؤ۔ پیاسے ہو کہ سیراب ہو؟ وطن میں ہو یا پردیس میں ہو؟ آبادی میں ہو یا جنگل میں؟ اپنوں میں ہو یا دشمنوں میں؟ تنہا ہو یا عورتیں اور بچے ساتھ ہیں؟ امن کا وقت ہے یا جنگ کے نیزے اور تلواریں چمک رہی ہیں؟۔ اچھا حسینؑ! نانا کو یہ بتا دو کہ ظہر کا وقت ہے یا عصر کا؟

امام حسینؑ خاموش ہیں۔ رسولؐ نے فرمایا۔ بیٹا! میں خود قبر سے نکل کر تیرے ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ حسینؑ کی آنکھ کھل گئی۔ قبلہ کی طرف رُخ کر کے عرض کیا۔ یا اللہ! مجھے ایسا صبر دے کہ کسی کو نہ ملا ہو۔ لاشوں کو اُٹھا اُٹھا کر لاؤں اور تیرا شکر ادا کروں۔ بچوں کی العطش العطش کی آوازیں سنوں اور تیرا شکر ادا کروں۔ علی اکبرؑ کے سینے سے برچھی

نکالوں اور تیرا شکر ادا کروں۔ علی اصغرؑ کے گلے سے تیر کھینچوں اور تیرا شکر ادا کروں۔ قاتل سینے پر ہو اور زبان پر تیرا نام ہو۔ جب گردن کاٹی جائے تو تیرا سجدہ ادا کر رہا ہوؤں۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْآ اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

☆☆☆

چوتھی مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ۝ (صلواۃ)

خداوند عالم اپنے کلام بلاغت نظام میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

(اے رسولؐ) کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کے عوض میں سوائے اپنے اقرباء کی محبت کے اور کوئی سوال نہیں کرتا۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ جب آیۂ مودۃ القربیٰ نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا اے رسولؐ مقبول! وہ کون سے آپ کے قرابت دار ہیں جن کی محبت کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ (صلواۃ)

رسولؐ اللہ نے تبلیغ اسلام کا اجر طلب فرمایا ہے اور خدا فرماتا ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ جب اسلام ہی خدا کا دین ہے تو جو نبی بھی خدا کی طرف سے آئے گا اس کے لئے ضروری ہوگا کہ صرف اسلام ہی کی تبلیغ کرے۔ حضرت آدمؑ نبی بن کر آئے تو اسلام ہی کی تبلیغ کرتے رہے۔ حضرت نوحؑ نبی خدا تھے، اسلام کو پھیلاتے رہے۔ جناب موسیٰؑ کا زمانہ آیا، لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیتے رہے۔ حضرت عیسیٰؑ آئے۔ دینِ اسلام کے اصولوں سے لوگوں کو آگاہ

کیا۔ غرض جب خدا کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے تو پھر ہر نبی کا دین اسلام ہی ہوگا۔ اب یہ سمجھنا کہ دینِ اسلام نیا دین ہے اور محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے شروع ہوا بالکل غلط ہے بلکہ دین اسلام محمدؐ کے اس وقت سے ہے جب آپؐ نے فرمایا تھا: کُنْتُ نَبِیًّا آلادَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْن ہ میں اس وقت بھی نبی تھا جب حضرت آدمؑ پانی اور مٹی کے درمیان تھے یعنی پانی پانی تھا اور مٹی مٹی تھی۔

یہ اور بات ہے کہ ہر نبی کا دین اسلام ہو مگر احکام زمانے کے لحاظ سے جدا ہوں۔ مثلاً کسی نبی کے زمانے میں سارے سال کے روزے واجب ہوں اور کسی نبی کے زمانے میں صرف ایک ماہ کے۔ کسی کے زمانے میں پچاس نمازیں یومیہ واجب ہوں اور کسی کے زمانے میں صرف پانچ نمازیں روز واجب ہوں۔ کسی کا کلمہ ہو لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ اٰدَمَ صَفِیُّ اللّٰہ، تو کسی کا کلمہ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلُ اللّٰہ ہو۔ کسی کے زمانے میں لوگ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ مُوْسیٰ کَلِیْمُ اللّٰہ کلمہ پڑھتے ہوں اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں۔۔۔ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ عِیْسٰی رُوْحُ اللّٰہ کلمہ رائج ہو اور کسی کے زمانے کا کلمہ ہو لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰہ اور آج کے زمانے کے لوگ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰـہ بھی کہہ دیتے ہوں۔ معلوم ہوا لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ تو ہر زمانے کے لئے ضروری رہا اور آگے کا فقرہ ہر نبی کے لحاظ سے بدلتا رہا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اسلام رسولؐ اللہ کے زمانے سے شروع ہوا تو رسولؐ کے باپ دادا کے مذہب کا کیا ہوگا۔ ان کے واقعات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ اللہ کے باپ دادا مسلمان تھے۔ تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ " جب رسولؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا زمزم کنواں کھودنے کے وقت قریشِ مکہ سے جھگڑا ہوا اور ان کو دبنا پڑا تو انھوں نے نذر مانی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوئے اور وہ ان کی حمایت کے قابل ہو گئے تو وہ ان میں سے ایک کو کعبہ میں اللہ کے لئے قربان کردیں گے۔ چنانچہ دس بیٹے ہوئے اور آپ نے قربانی کے لئے ان کے ناموں کا قرعہ ڈالا۔ قرعہ حضرت عبداللہ کے نام کا نکلا۔ وہ حضرت عبداللہ کو کعبے پر قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن انھیں مشورہ دیا گیا کہ

انسان کا خون بہا بھی دیا جا سکتا ہے لہٰذا عبداللہ کے بدلے میں اونٹ ذبح کر دو۔ قرعہ ڈالا گیا کہ کتنے اونٹ عبداللہ کے بدلے میں ذبح کئے جائیں تو حضرت عبداللہ کے بدلے میں سو اونٹوں کا قرعہ نکلا چنانچہ اونٹ ذبح کئے گئے اور حضرت عبداللہ بچ گئے۔ "اگر حضرت عبدالمطلب مسلمان نہیں تھے تو یہ کس اللہ کی راہ میں نذر مان رہے تھے اور اُونٹ ذبح کر رہے تھے؟

دوسرا واقعہ سُنیئے: جب ابرہہ ایک لاکھ ہاتھی لے کر کعبہ کو ڈھانے کے لئے آیا تھا تو سب لوگ خوف کھا کر شہر سے بھاگ گئے تھے لیکن جناب عبدالمطلب اور ان کے خاندان والے نہیں بھاگے تھے۔ معلوم ہوا "اس خاندان کا خاصہ ہی فرار ہونا نہ تھا" ابرہہ آیا۔ اس کے فوجیوں نے شہر میں لوٹ مار مچائی اور جناب عبدالمطلب کے اونٹ بھی پکڑ کر لے گئے۔ جناب عبدالمطلب ابرہہ کے دربار میں آئے۔ وہ یہ سمجھا کہ عبدالمطلب چونکہ خانۂ کعبہ کے متولی ہیں اس لئے کعبہ کی سفارش کے لئے ہی آئے ہوں گے لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے شکایت کی کہ تیرے فوجی میرے اونٹ پکڑ لائے ہیں۔ ابرہہ نے تعجب سے پوچھا کہ اونٹ تو آ گئے اور کعبہ کی کوئی فکر نہ ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اونٹ میرے ہیں اس لئے انھیں لینے آیا ہوں اور کعبہ خدا کا گھر ہے۔ جس کا گھر ہے وہ اپنے گھر کی خود حفاظت کرے گا۔ جناب عبدالمطلب کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ خدا پر ان کا کتنا پختہ ایمان تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ ابرہہ کو آگاہ کر رہے تھے کہ تو سمجھتا ہے کہ لاکھ ہاتھی عبدالمطلب کے مقابلے کے لئے لایا ہے۔ حالانکہ یہ اللہ سے مقابلہ ہے، عبدالمطلب سے نہیں۔!

بادشاہ کے سامنے اس طرح بیباک ہو کر بولنا اور کہنا کہ کعبہ خدا کا گھر ہے۔ یہ کون سے خدا کا گھر بتا رہے تھے؟ اصلی خدا کا جو لاشریک ہے یا تین سو ساٹھ خداؤں کا جو اس وقت کعبہ میں تھے؟ اگر بتوں کا گھر بتانا ہوتا تو جمع کا صیغہ استعمال کرتے یعنی اس طرح کہتے کہ " کعبہ خداؤں کا گھر ہے۔ جن کا گھر ہے وہ اپنے گھر کی خود حفاظت کریں گے۔" معلوم ہوا حضرت عبدالمطلب ابرہہ کے پاس اپنے اونٹ لینے نہیں گئے تھے بلکہ

حجت کے طور پر اسے آگاہ کرنے گئے تھے کہ وہ عبدالمطلب کا نہیں بلکہ خدائے وحدہٗ لاشریک کا مقابلہ کر رہا ہے۔ مگر اس کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے تھے لہٰذا خدا نے بھی اس پر پتھر برسا دیئے اور ایسا کر دیا جیسے چبایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔

عذاب الٰہی جب بھی نازل ہوتا ہے، حجت کے بعد نازل ہوتا ہے بلکہ ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی نبی کی بددعا کے بعد نازل ہوتا ہے۔ یہاں ابرہہ پر کون حجت تمام کر رہا تھا اور کون بددعا کر رہا تھا۔ سوائے حضرت عبدالمطلب کے کسی اور نے حجت تمام نہیں کی اور کیا تعجب ہے کہ انھوں نے ہی اللہ سے عذاب کے لئے بددعا بھی کی ہو۔ جب حضرت عبدالمطلب کے یہ کام یعنی نبیوں جیسے کام ہیں تو کیا وہ مسلمان بھی نہ تھے؟ تعجب ہوتا ہے کہ جو شخص بیٹا ہونے کے لئے خدا سے نذر مانے اور اپنے بیٹے کا نام "عبداللہ" رکھے۔ اس کے لئے لوگ کہیں کہ وہ مسلمان نہ تھا کیونکہ اسلام تو محمد الرسولؐ اللہ کے بعد آیا ہے۔ بھلا "عبداللہ" کافروں کے نام ہو سکتے ہیں۔ جس نے اپنے بیٹے کا نام عبداللہ رکھا، صاف ظاہر ہے کہ وہ پکا مسلمان تھا اور جس کا نام عبداللہ رکھا، وہ بھی مسلمان تھے۔ (صلوٰۃ)

اب یہ سمجھنا کہ اسلام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے نہ تھا اور نعوذ باللہ ان کے ماں باپ وغیرہ کافر تھے، کتنی جہالت کی بات ہے بلکہ بات تو آگے بڑھتی ہے۔ بتایا جائے کہ محمد مصطفےٰؐ نے چالیس ۴۰ سال کی عمر میں دعویٰ رسالت کیا ہے۔ اس سے پہلے وہ خود کس شریعت پر تھے۔ اسلام جانتے تھے یا نہیں؟ گناہوں سے بچتے تھے یا نہیں؟ اللہ کی عبادت کرتے تھے یا نہیں؟ آپ نے رسولؐ کی ۴۰ سال عمر کے بعد اسلام مانا ہے تو آپ کو اوروں کی تو کیا خود اپنے رسول کی پوزیشن صاف کرنی مشکل ہو جائے گی۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ رسولؐ اللہ بچپن ہی سے اسلام کا سب کچھ جانتے تھے۔

جب وہ سب کچھ جانتے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بچپن میں یا جوانی میں کیوں نہ ظاہر کیا۔ جواب ہوگا کہ اللہ کا حکم نہ تھا، اس لئے چھپاتے رہے ویسے اسلام کے متعلق انھیں سب کچھ معلوم تھا۔ لہٰذا اسی طرح حضرت عبدالمطلب مسلمان تھے اور اسلام کا سب کچھ جانتے تھے۔ حضرت عبداللہ بھی مسلمان تھے اور اسلام سے واقف تھے، جناب

ابو طالب بھی مسلمان تھے اور اسلام کی معرفت رکھتے تھے، حضور کے سب بزرگ اسلام لائے ہوئے تھے اور لانا کیا معنی، یہ تو پیدائشی مسلمان تھے۔ ان کی تو پیدائش ہی مسلمان کے گھر میں اور اسلام پر ہوئی تھی۔

آپ دیکھ لیجئے کہ بچہ ماں باپ کی تعلیم لے کر اُٹھتا ہے اگر ماں باپ مسلمان ہیں تو بچہ بھی مسلمان ہوگا اور اگر بچے کے ماں باپ کافر ہوں گے تو بچہ بھی بڑا ہو کر کفر ہی اختیار کرے گا۔ حضرت ابو طالب کی گود میں دو نونہالوں نے پرورش پائی ہے۔ بڑے ہوئے تو ایک نبی بنا اور دوسرا امامؑ۔ بتایئے اس گود والے کو کیا کہیں گے؟ آپ کہیں گے، مسلمان"۔ نہیں، آپ نہیں بتا سکتے۔ میں بتاتا ہوں: جو رسول کو مانے اُسے کہتے ہیں مسلمان اور جو رسولؐ اور امام کو مانے اُسے کہتے ہیں شیعہ۔۔۔ حضرت ابو طالب نے دو بچے پالے، ایک نبی، دوسرا امام، لہٰذا نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب ابو طالب مسلمان نہیں شیعہ تھے۔ (بآواز بلند صلوات)

دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے اور سب ہی نے دین اسلام کی تبلیغ کی، بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھائیں۔ ظلم سہے اور اتنے ستائے گئے کہ بعض انبیاء نے بددعائیں دیں۔ حضرت نوحؑ کی بددعا سے طوفان آیا مگر کسی نبی نے اپنی تبلیغ کا اجر نہیں مانگا اور معاوضہ طلب کرتے ہیں تو وہ ہیں افضل الانبیاء۔۔۔ یعنی سب نبیوں نے تو مفت کام کیا اور کچھ نہ مانگا لیکن آپ رحمۃ اللعالمین ہو کر بھی تبلیغ رسالت کا معاوضہ طلب فرما رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کام کرنے والا اپنی اُجرت کا اسی وقت حقدار ہوتا ہے جب وہ کام کو پورا کردے۔ ادھورے کام کی حالت میں کوئی کسی کو اُجرت نہیں دیا کرتا۔۔ تمام انبیاءؑ کے زمانے میں جب تبلیغ اسلام مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کوئی نبی اجر مانگتا کیسے؟ ہمارے نبیؐ کے زمانے میں جب تبلیغ اسلام مکمل ہوگئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ۔ " آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمتوں کا اختتام کردیا"۔ لہٰذا جب تبلیغ اسلام مکمل ہوگئی تب معاوضہ

طلب کیا گیا۔!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کو پہنچانے میں تھوڑا تھوڑا سب انبیاء ہی نے کام کیا ہے۔لہٰذا اس معاوضے میں ان کا بھی حصہ ہونا چاہیئے۔یہ نہیں کہ جنت چھوڑیں آدمؑ اور معاوضہ پائیں محمد مصطفیٰؐ، دکھ اُٹھائیں حضرت نوحؑ اور فائدہ لے جائیں رسولؐ اللہ۔آگ میں پھینکے جائیں حضرت ابراہیمؑ اور منافع جائے رسولؐ کو۔پہاڑوں پر اُتریں چڑھیں حضرت موسیٰؑ اور بدلہ ملے رسولؐ مقبول کو۔صلیب کی تکلیف کے لئے حضرت عیسیٰؑ اور اجر لینے کے لئے حضرت محمدؐ! لیکن نہیں، ایسا نہیں ہے۔رسولؐ اللہ نے سب کے وارثوں کو حصہ دیا ہے۔ارشاد ہے مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰی اٰدَمَ فِیْ عِلْمِهٖ وَاِلٰی نُوْحٍ فِیْ شُكْرِهٖ وَاِلٰی اِبْرَاهِیْمَ فِیْ خُلَّتِهٖ وَاِلٰی مُوْسٰی فِیْ هَیْبَتِهٖ وَاِلٰی عِیْسٰی فِیْ زُهْدِهٖ فَلْيَنْظُرْ اِلٰی وَجْهِ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ جو شخص حضرت آدمؑ کو ان کے علم میں دیکھنا چاہے اور حضرت نوحؑ کو اُن کے شکر میں۔حضرت ابراہیمؑ کو ان کی خلّت میں، حضرت موسیٰؑ کو ان کی ہیبت میں حضرت عیسیٰؑ کو ان کے زہد میں۔پس اُسے چاہیئے کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے چہرے کی طرف نظر کرے۔معلوم ہوا علیؑ سب کے وارث ہیں۔جو صفات اور انبیاء میں تھیں وہ سب علیؑ میں موجود تھیں۔اوروں میں ایک ایک صفت تھی اور ان میں سب صفات یکجا تھیں بلکہ یہ صفات اوروں کی سیرت میں تھیں لیکن علیؑ کی صورت میں تھیں۔سیرت اور چیز ہے اور صورت اور چیز ہے وہ علیؑ جس کی جسمانی صورت میں تمام انبیاء کی سیرت جھلکتی ہو۔یا اللہ! اس کی سیرت کیسی ہوگی! تب ہی تو رسولؐ نے فرمایا۔نہیں پہچانا کسی نے اللہ کو مگر میں نے اور علیؑ نے، نہیں پہچانا کسی نے مجھ کو مگر اللہ نے اور علیؑ نے۔۔اور نہیں پہچانا کسی نے علیؑ کو مگر میں نے اور اللہ نے۔(صلواۃ)

یہ علیؑ کی شان تھی اور اب ذرا علیؑ کے فرزندوں کی شان دیکھیئے۔امام حسینؑ میں حضرت علیؑ کی صفات بھی ہیں اور جناب فاطمہؑ کے دودھ کا اثر بھی ہے۔روحانیت اتنی بلند ہے، اتنی بلند کہ آپ زیارت میں ان کا نام اس طرح پڑھتے ہیں:۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَاوَارِثَ اٰدَمَ صَفِيِّ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَاوَارِثَ نُوْحٍ نَبِيِّ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَاوَارِثَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَاوَارِثَ مُوْسٰى كَلِيْمِ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَاوَارِثَ عِيْسٰى رُوْحِ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَاوَارِثَ مُحَمَّدٍ حَبِيْبِ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَاوَارِثَ عَلِيٍّ" وَلِيِّ اللّٰهِ ۔

یعنی اے حضرت آدمؑ کے وارث آپ پر ہمارا سلام ہو، اے نوحؑ نبی اللہ کے وارث! آپ پر ہمارا سلام ہو۔ اے ابراہیمؑ خلیل اللہ، اے موسیٰؑ کلیم اللہ، اے عیسیٰؑ روح اللہ، اے محمدؐ حبیب اللہ اور اے علیؑ ولی اللہ کے وارث! آپ پر ہمارا سلام ہو۔

جو تمام انبیاء کا وارث ہو اور اجرِ رسالت کا حقدار ہو، چاہیے تو یہ تھا کہ لوگ اُس کی اطاعت کرتے، اُنھیں اپنا حاکم اور آقا سمجھتے۔ بلکہ ان کی بیعت کرتے لیکن ہوا یہ کہ خود ان سے بیعت طلب کی گئی۔ اسلام کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنے کے معنی یہ تھے کہ ہر نبی سے بیعت طلب کی جارہی تھی۔ رسولؐ اللہ نے اپنی زندگی میں امام حسینؑ کے ہاتھوں کی قوت کا اندازہ کرادیا تھا۔ جب عید کے دن اپنے اوپر سوار کرکے دونوں زلفیں حسینؑ کے ہاتھوں میں دے کر یہ بتارہے تھے کہ یہ ہاتھ وہ ہیں کہ جدھر کو اشارہ کریں، رسالت اسی طرف کو مُڑ جائے گی۔ آج سلطنت کے زعم میں ان ہاتھوں سے بیعت طلب کی گئی ہے۔ امام حسینؑ نے مدینہ چھوڑا اور مکّے تشریف لائے۔ مگر یزید نے مکّے میں اپنے جاسوس بھیج دیئے کہ وہ حج کا لباس پہنیں اور لباس کے نیچے خنجر چھپا کر حاجیوں میں پھرتے رہیں اور موقع پاکر حسینؑ کو شہید کردیں تاکہ پتہ نہ چلے کہ یزید لعنہ نے ایسا کرایا ہے بلکہ یہ نام ہو کہ کسی حاجی نے ماردیا ہے۔ امام حسینؑ کعبہ کی حرمت داغدار کرنا نہیں چاہتے تھے کہ ان کا خون کعبے میں بہایا جائے۔ اُس زمانے میں صورت یہ تھی کہ آپ کے پاس کوفیوں کے بلانے کے لئے متواتر خطوط آرہے تھے، لہٰذا آپ مکّے سے کوفہ کے لئے روانہ ہوئے لیکن حکومت کے راستہ روکنے والے سپاہیوں نے آپ کا رُخ ایک ایسے دشت کی طرف موڑ دیا جو بے آب و گیاہ اور وسیع و عریض میدان تھا۔

قافلہ چل رہا تھا۔ اچانک امامؑ کا اسپ وفادار ایک مقام پر رُک گیا اور آگے نہ بڑھا تو آپ نے پوچھا اس جگہ کا کیا نام ہے۔ ساتھیوں میں سے کسی نے کہا۔ نینوا کہتے ہیں۔ پھر پوچھا تو بتایا غازریہ کہتے ہیں۔ دراصل جاں نثار کربلا کے نام کو چھپانا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح مولا اس دشت سے آگے بڑھ جائیں۔ لیکن جب امامؑ نے بار بار پوچھا تو مجبور ہو کر کہا۔ مولا! اسے کربلا کہتے ہیں۔ فرمایا ہاں ہاں! اب ہم اپنی منزل پر آگئے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم آباد ہوں گے۔ ہمارے جوان یہاں بستی بسائیں گے۔ قافلہ روک دیا جائے۔ ہم یہیں قیام کریں گے۔

قافلہ روک دیا گیا۔ رائے ہونے لگی کہ کہاں خیمے نصب کئے جائیں۔ حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ نے مشورہ کیا کہ ترائی میں خیمے نصب ہونے چاہئیں تاکہ بچوں اور عورتوں کو پانی کی تکلیف نہ ہو، حضرت نے حضرت عباسؑ سے کہا۔ بھائی! کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا لشکر بھی اپنے لئے یہی جگہ پسند کرے اور ہمیں یہاں سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ جناب عباسؑ نے عرض کیا۔ آقا! اس غلام کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال ہے جو اس طرف کو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے! حضرت نے فرمایا۔ بھائی! یہ اُمت بہت ظالم ہے۔ مجھے تو اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہماری والدہ پر دروازہ گرایا تھا اور ہمارے باپ کے گلے میں رسّی باندھ کر لے گئے تھے۔ اس وقت ہمیں بھی جوش آیا تھا مگر صبر ہی کیا تھا کیونکہ صبر ہمارا شیوہ ہے۔

اس کے بعد امام حسینؑ بہن کے اونٹ کے قریب تشریف لائے۔ دیکھا کہ جناب زینبؑ زار و قطار رو رہی ہیں۔ امام حسینؑ کو دیکھ کر جناب زینبؑ کہنے لگیں بھائی! یہ آپ کیسی جگہ اُترے ہیں۔ یہاں تو چاروں طرف سے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ بچے ڈرے جاتے ہیں۔ یہاں نہ ٹھہریئے۔ فرمایا۔ بہن! ہم نے تو اسی زمین کی خاطر مدینہ چھوڑا ہے۔ آسمان پر آٹھ جنتیں ہیں اور ہم اس زمین کو نویں جنت بنائیں گے۔

غرض سب قافلہ اُتر گیا۔ ترائی میں خیمے نصب ہوئے۔ رات بسر ہوئی۔ صبح کو جب امام حسینؑ جناب زینبؑ کے خیمے میں آئے تو دیکھا کہ بہن بہت پریشان ہیں۔ سبب

پوچھا تو بتایا کہ بھائی! سکینہؑ ڈرتی ہے۔ علی اصغرؑ نے دودھ سے منہ پھیر لیا ہے۔ بچے سہمے جا رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا مقام ہے کہ سب پریشان ہیں۔

میرا خود دل ہلا جاتا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ بہن! اس جگہ کا نام کربلا ہے۔ یہ سُننا تھا کہ جناب زینبؑ چیخیں مار کر رونے لگیں اور کہا کہ یہ نام تو میرا سُنا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بہن بھائیوں میں جدائی ہوگی۔ اس نام سے اماں رویا کرتی تھیں۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک طرف سے فوجی باجے بجنے کی آواز سُنائی دی۔ فوراً خادم خبر لے کر آیا کہ کوفے سے فوج آئی ہے چار ہزار زرہ پوش ہیں جو لوہے میں غرق ہیں۔ فرمایا افسر کا کیا نام ہے۔ کہا عمر سعد ہے۔ جناب علی اکبرؑ پاس کھڑے تھے۔ پوچھنے لگے ان کا کیا ارادہ ہے۔ خادم نے سر جھکا کر کہا امام کا سر لینا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر جناب علی اکبرؑ نے چچا عباسؑ کی طرف دیکھا۔ جناب عباسؑ کا چہرہ سُرخ تھا۔ اور غصے سے ہونٹ چبا رہے تھے۔ حضرت عباسؑ امامؑ کی طرف بڑھے اور جوش میں کہا۔ آقا! اجازت ہے؟ ان لومڑیوں سے نپٹ لوں۔ امامؑ نے فرطِ محبت سے بھائی کو گلے لگا لیا۔ اور پیار سے سمجھایا بھائی اگر وہ سر لینے آئے ہیں تو ہم بھی تو سر دینے ہی آئے ہیں۔ بھائی عباسؑ، اے بھائی عباسؑ! صبر سے کام لو۔۔۔۔ میں اپنے معزز سامعین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح بزدل کے لئے میدانِ جنگ وجدل میں جانا مشکل ہوتا ہے اسی طرح بہادر سپاہی کے لئے جنگ پر صبر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور جبکہ دشمن اس پر اُمڈ آ رہا ہو۔ اگر امام حسینؑ اس موقع پر حضرت عباسؑ کو جنگ کی اجازت دے دیتے تو وہ اتنے خوش ہوتے، اتنے خوش ہوتے کہ بیان سے باہر ہے لیکن اب اجازت نہ ملنے سے جو حضرت عباسؑ پر گزر رہی ہوگی اسے ایک بہادر سپاہی ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہائے! بہادر سے۔ اور صبر کرایا جائے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ دوسری طرف سے نقاروں کی آواز آنے لگی اور فوج کے سپاہی میدان میں دوڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس قدر کثیر لشکر تھا کہ ان کے چلنے سے زمین کربلا ہل رہی تھی۔ عورتوں پر خوف کا یہ عالم ہوا کہ گودیوں سے بچے گر گئے۔ خادم

دوڑے ہوئے آئے اور خبر لائے کہ شمر آ گیا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ آہستہ نام لو۔ کہیں بہن زینبؑ نہ سن لیں۔

اسی طرح لشکر پر لشکر آنے لگے۔ میدانِ کربلا میں سر ہی سر دکھائی دینے لگے جنابِ زینبؑ نے گھبرا کر امام حسینؑ سے کہا۔ بھائی! فوجوں پر فوجیں آ رہی ہیں لیکن آپ کا کوئی آدمی نہیں آتا۔ آپؑ بھی اپنے آدمیوں کو بلایئے۔۔ وہ حسینؑ جو منزل بمنزل اپنے ہمراہیوں سے کہتے چلے آ رہے ہوں کہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تمہاری جانیں بچ جائیں گی۔ آج انھوں نے بہن کے کہنے پر ایک بچپن کے دوست کو بلانے کے لئے خط لکھا:

حسینؑ ابن علیؑ کا خط مردِ فقیہ حبیب ابن مظاہر کے نام۔۔۔ اے حبیب! ہم کربلا پہنچ چکے ہیں۔ جہاں تک ہو سکے جلد سے جلد ہمارے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔ جس وقت قاصد یہ خط لے کر کوفہ حضرت حبیب ابن مظاہر کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت وہ کھانا کھا رہے تھے۔ لقمہ گلوگیر ہوا۔ دروازے سے دقّ الباب کی آواز آئی۔ پوچھا کون ہے۔ آواز آئی اَنَا بَرِیْدُ الْحُسَیْنِ ۔ میں حسینؑ کا قاصد ہوں۔ بس کیا تھا حبیب ننگے پاؤں دروازے کی طرف دوڑے۔ خط لیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ سر پر چڑھایا۔ خط سے معلوم ہوا کہ امام کربلا پہنچ چکے ہیں۔ ورنہ وہ اس خیال میں تھے کہ امام کوفے تشریف لا رہے ہیں۔ کوفہ کی اس وقت یہ حالت تھی کہ حضرت مسلمؑ کے واقعے کے بعد حکومت کی طرف سے امام حسینؑ کے حامیوں پر سختی کی جا رہی تھی اور انھیں دہشت کے ذریعے دبایا جا رہا تھا جس شخص سے یہ امکان ہوتا کہ وہ امام حسینؑ کی مدد کرے گا، اُسے قتل کر دیا جاتا۔۔ یا قید میں ڈال دیا جاتا۔۔۔ مختار جیسے مشہور جاں نثار حسینؑ قید میں تھے۔ اس کے علاوہ شہر کے باہر راستوں پر بھی ناکہ بندی لگی ہوئی تھی، جنگل میں جگہ جگہ رسالے پھیلے ہوئے تھے اور پہرے بٹھا دئے گئے تھے کہ کسی طرف سے امام حسینؑ کے حمایتی ان تک نہ پہنچ سکیں۔

خط لے کر حبیب گھر میں آئے۔ سوچ رہے تھے کہ کیا کروں اور کس طرح امام حسینؑ تک پہنچوں۔ بیوی نے پوچھا۔ کس کا خط ہے؟ آپ نے فرمایا۔ امام حسینؑ نے خط بھیجا ہے اور کربلا بلایا ہے۔ بیوی نے کہا تو پھر کیا سوچ رہے ہو؟ حبیب نے کہا یہی کہ

زمانہ پُر آشوب ہے۔ حکومت کی طرف سے اتنی پابندیاں ہیں۔ بیوی سمجھی کہ حبیب کا جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ غصہ آ گیا۔ کہنے لگی۔ غضب ہے! فاطمہ کا لعل بلائے اور تم جان عزیز رکھو! کیا اسی پر امام کی دوستی کا دم بھرتے تھے؟ لو یہ دوپٹہ اوڑھ لو اور چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ رہو۔ اب میں تلوار لے کر نصرتِ امام کو جاؤں گی۔ اُدھر تو چاروں طرف سے فوجیں بھیجی جا رہی ہیں اور ادھر سے کوئی بھی نہیں آ رہا ہے۔ ہائے! جناب زینبؑ کیسی گھبرا رہی ہوں گی۔

جناب حبیب ابنِ مظاہر نے فرمایا۔ مومنہ! یہ بات نہیں ہے بلکہ میں تو تیرا دل دیکھنا چاہتا تھا بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ حسینؑ بلائیں اور حبیب نہ جائے۔

پھر جناب حبیب ابنِ مظاہر نے غلام کو حکم دیا کہ گھوڑا لے کر شہر کے باہر جائے اور میرا انتظار کرے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر وہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں چلتے تو خطرہ تھا کہ ابنِ زیاد کے آدمی انھیں بھانپ جاتے اور گرفتار کر لیتے۔ لہٰذا غلام گھوڑے کو شہر سے باہر اس طرح لے گیا جیسے روزمرہ ٹہلانے کے لئے لے جاتا تھا اور اس مقام پر پہنچ کر حبیب کا انتظار کرنے لگا جہاں اُنھوں نے ہدایت کی تھی۔

حبیب بیچارے حکومت کے آدمیوں سے آنکھ بچاتے، چھپتے، چھپاتے گلیوں اور خاموش راستوں سے منزل کی طرف جا رہے تھے۔ آپ (سامعین) بھی جانتے ہیں کہ ایسے راستے ہمیشہ ہیر پھیر کے ہوتے ہیں اور ممکن ہے سامنے گلی میں کوئی آدمی آ رہا ہو تو اسے گزرنے کا موقع دینے کے لئے آپ اِدھر اُدھر دوسری گلیوں میں چلنے لگتے ہوں۔ اس وجہ سے حبیب کو پہنچنے میں دیر ہوئی۔ جب حبیب وہاں پہنچے تو غلام انتظار سے تنگ آ کر کہہ رہا تھا کہ اے گھوڑے! اگر تیرا مالک جلد نہ پہنچا تو میں سوار ہو کر امام کی خدمت کے لئے جاؤں گا۔ حبیب کا یہ سننا تھا کہ دل بھر آیا۔ ہائے! فاطمہؑ کے لعل پر ایسا وقت آ گیا ہے کہ غلام بھی نصرت کے لئے تیار ہیں۔

حبیب گھوڑے پر سوار ہوئے۔ کربلا کی طرف جا رہے ہیں۔ اُدھر جناب زینبؑ بار بار پوچھتی ہیں۔ بھائی! تمہارا ابھی کوئی آدمی آیا۔ امامؑ کی نظریں راستے پر لگی ہوئی

ہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ حبیب آ رہے ہیں۔ مولا استقبال کے لئے بڑھے۔ تمام جاں نثاروں نے حبیب کا استقبال کیا۔ خیموں میں معلوم ہوا کہ حبیب آئے ہیں۔ جناب زینبؑ نے فضہ سے کہلا بھیجا کہ جناب زینبؑ تم کو سلام کہتی ہیں اور شکریہ ادا کرتی ہیں۔ حبیب تم اس بیکسی میں ہمارا ساتھ دینے آئے ہو۔ یہ سُننا تھا کہ حبیب بیقرار ہو گئے۔ اپنا منہ پیٹ لیا۔ ہائے! ثانیٔ فاطمہؑ زہرا مجھے سلام کہیں۔ آلِ رسولؐ پر کتنی بے کسی کا وقت ہے۔

جب بروز عاشورہ جنگ جاری ہوئی تو سب سے پہلے انصار نے اپنی قربانیاں دینی شروع کیں کہ ہم جیتے جی امام حسینؑ کے کسی عزیز پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ ایک ایک صحابی جاتا تھا اور مظلوم امامؑ پر اپنی جان نثار کر دیتا تھا۔ امامؑ اس کی لاش اُٹھا لاتے تھے۔ صبح سے لڑتے لڑتے جب دھوپ ڈھلنے کا وقت آیا تو ایک صحابی ابوثمامہ نے کہا کہ ہم تو آخری نماز امام حسینؑ کے پیچھے پڑھیں گے۔ امامؑ نے دعا دی خدا تمہیں ہمارے ساتھ نماز گزاروں میں محشور فرمائے۔ اس کے بعد فرمایا۔ جاؤ! فوجِ یزیدؑ سے کہو کہ نماز ظہر کا وقت ہو گیا ہے۔ تم بھی نماز پڑھ لو اور ہمیں بھی اجازت دے دو کہ ہم بھی نماز پڑھ لیں۔ اتنی دیر تک لڑائی بند رہے۔

جب ابوثمامہ نے لشکرِ یزیدؑ کے سامنے آ کر نماز کی مہلت کے لئے جنگ بند کرنے کو کہا تو وہاں سے جواب میں حصین ابن نمیر کی آواز آئی۔ "تم کتنی ہی نمازیں پڑھو، تمہاری نماز قبول ہی نہ ہو گی۔" اس کے اس کلام پر جناب حبیب ابن مظاہر سے رہا نہ گیا۔ (رو کر) بوڑھے تھے، کربلا کی جلتی ریت پر نماز کے لئے تیمم کر چکے تھے۔ جوش میں آ کر پٹکے سے اپنی جھکی ہوئی کمر باندھ کر مضبوط کی۔ آنکھوں کی لٹکی ہوئی بھنویں ماتھے کی طرف اُٹھا کر رومال سے باندھیں۔ ہاتھ جوڑ کر امام سے عرض کیا۔ (رو کر) آقا! اب تو جنت میں آپ کے نانا کے پیچھے نماز پڑھوں گا۔۔ جنگ کی اجازت دیجئے۔ امامؑ نے بچپن کے دوست حبیب کو گلے سے لگا لیا۔ مل کر کچھ دیر روتے رہے۔ پھر روتے ہوئے رخصت کیا۔۔۔ حبیب کی محبت کا حال دیکھیے۔ رخصت ہوتے وقت امام کے ہاتھ نہیں چومے۔ ارے قدموں پر گر کر بوسہ دیا۔ پھر روتے ہوئے اُٹھے۔ گھوڑے کی لگام پکڑی۔ ادب کی

وجہ سے کچھ دور پیدل چلے۔ آگے چل کر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ یزید کی فوج کے سامنے پہنچے۔ للکار کر کہا۔ ارے بے دینو! نواسۂ رسولؐ کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے؟ اُدھر سے جواب میں تیروں کی بوچھاڑ آئی۔ حبیب نے لشکر میں گھوڑا ڈال دیا۔ بڑھاپے کا یہ عالم تھا کہ کمر جھکی ہوئی تھی مگر جوش اتنا تھا کہ ساٹھ آدمیوں کو تہِ تیغ کر دیا۔

حبیب، حصین ابن نمیر کو ڈھونڈ رہے تھے جس نے نماز کو منع کیا تھا۔ اچانک ان کی نظر اس ملعون پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ حبیب نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح اُس پر حملہ کر دیا اور تاک کر نیزہ مارا۔ چہرے کے آر پار ہو گیا ہوتا مگر اُس نے فوراً گردن گھما کر وار کو خالی دینے کی کوشش کی۔ حبیب کا نیزہ اس کی ناک کو چھیدتا ہوا گزر گیا۔ وہ بھاگا۔ حبیب دوبارہ نیزہ مارنے کے لئے اس پر لپکے مگر کسی نے پیچھے سے حبیب کی کمر میں نیزہ گھونپ دیا۔ حبیب گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔ آواز دی۔ یَامَوْلَاہُ اِدْرِکْنِیْ

امام شمشیر بکف میدان کی طرف بے تابانہ دوڑے۔ یہ دیکھ کر اشقیا بھاگ گئے۔ امامؑ حبیب کے سرہانے پہنچے۔ دیکھا کہ حبیب ایڑھیاں رگڑ رہے ہیں۔ رو کر فرمایا۔ میرے بچپن کے دوست! لو حسینؑ آ گیا ہے۔ حبیب نے آنکھیں کھولیں۔ حسینؑ کے چہرے پر نظر پڑی حسرت سے دیکھنے لگے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ موت کی ایک ہچکی آئی۔ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ امامؑ نے کہا۔ آہ، آہ! میرے بچپن کے دوست میری ڈھارس توڑ چلے۔ تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۃ

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْآ اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۃ

☆☆☆

پانچویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ؕ (صلواۃ)

(اے رسولؐ!) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کا معاوضہ سوائے اپنے اقرباء کی محبت کے اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تبلیغ کا عوض، بدل، قیمت یا اُجرت جو کچھ بھی کہہ لیجئے، وہ اقربا کی محبت ہے۔ جو رسولؐ اللہ نے جو کچھ تبلیغ کی ہے اسے اگر مجتمع کر لیا جائے تو وہ قرآن بن جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن پہنچانے کا عوض اقربا سے محبت کرنا ہوا۔ اور یہ بات طے ہے کہ جب تک اُجرت ادا نہ کردی جائے اس پر عمل کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ آیت اتنی اہم ہوئی کہ تمام قرآن ایک طرف اور یہ آیت ایک طرف۔ اگر کوئی قرآن پر عمل کرنے والا اجرت ادا نہ کرے تو بھلا اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

آیت کا تعلق چار ہستیوں سے ہے۔ ایک خدا سے، جس نے حکم دیا کہ کہہ دو، دوسرے رسولؐ سے، جن پر کہنے کا حکم نازل ہوا۔ تیسرے ان لوگوں سے جن سے اجر طلب کیا گیا اور چوتھے ان اقرباء سے جن کی محبت طلب کی گئی ہے۔

حکم دینے والا اور ہوتا ہے اور جس پر حکم نازل ہو وہ اور ہوتا ہے۔ حکم دینے والا یعنی خدا، رسولؐ نہیں ہو سکتا اور جس پر حکم نازل ہوا یعنی رسولؐ، وہ خدا کی جگہ نہیں آ سکتے اسی طرح اُمت عوض دینے والی ہے اور اقربا عوض لینے والے ہیں لہٰذا اُمت اور ہے، اقربا اور ہیں۔ اُمت اور ہے۔ اقربا اور ہیں۔ اُمت اقربا نہیں بن سکتی۔ اقرباء رسول نہیں بن سکتے، رسولؐ خدا نہیں بن سکتے۔

تبلیغ کا اجر مانگا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقربا پر بھی تبلیغ ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر اقربا پر تبلیغ ہوئی ہے۔ تب تو وہ خود معاوضہ دیں۔ لیکن یہاں معاوضہ دینے کا حکم ہے۔ کہ اقربا کو دو۔ اگر اقرباء بھی معاوضہ دینے والوں میں آ گئے تو پھر لینے والا کون

رہے گا۔ معلوم ہوا کہ اقربا ہی ہوسکتے ہیں جن پر تبلیغ نہ ہوئی ہو، تب ہی تو وہ معاوضہ لینے والے بن سکتے ہیں۔

پھر دیکھنا یہ ہے کہ اُجرت تو اس سے مانگی جاسکتی ہے۔ جس نے کام پر لگایا ہو۔ اُمت نے رسولؐ اللہ کو کارِ رسالت سپرد نہیں کیا۔ یہ کام تو انھیں خدا نے دیا تھا اور رسولؐ بنا کر بھیجا تھا۔ لہٰذا جس نے رسول بنایا معاوضہ تو اسے دینا چاہیئے تھا نہ کہ بیچاری اُمت کو جس نے رسولؐ بنایا اور نہ کوئی کام لیا اور اُمت کے پاس ہے کیا جو رسول کو دے سکے وہ خود ان کی شفاعت کی محتاج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہیں یہ اقربا خدا کے تو نہیں ہیں۔

آپ کہیں گے کہ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کہیں خدا کے بھی اقرباء ہوسکتے ہیں۔ گھبرایئے نہیں، تعجب نہ کیجئے۔ میں کوئی تفسیر بیان نہیں کررہا ہوں کہ جس پر آپ اعتقاد ہی رکھیں میں تو صرف آیت کے الفاظ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص کسی لمبے سفر پر جارہا ہے۔ وہ کچھ سونا اپنے خادم کے ہاتھ کسی سیٹھ کو بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ سیٹھ سے کہنا کہ اس کی قیمت میرے بھائی کو دے دینا۔ آپ بتایئے کہ وہ سیٹھ سونے کی قیمت خادم کے بھائی کو دے گا یا اس شخص کے بھائی کو جس نے سونا بھیجا تھا؟

ولید نے امام حسینؑ کو اپنے گھر بلا کر کہا تھا کہ یزیدؒ نے مجھے لکھا ہے کہ یا تو امام حسینؑ سے بیعت لے لو یا ان کا سر قلم کرکے بھیج دو۔ آپ بتایئے کہ ولید نے اپنی بیعت کے لئے کہا تھا یا یزیدؒ کی بیعت کے لئے کہا تھا؟

آپ کہیں گے کہ جب کوئی کسی دوسرے کے ذریعے کہلواتا ہے تو لفظ "میرے" سے مراد اس کی اپنی ذات ہوتی ہے اور کہنے والے کا کام تو صرف پیغام پہنچانا ہوتا ہے۔ بس اب آپ یہاں دیکھ لیجئے کہ خدا نے محمدؐ سے کہلوایا ہے کہ لوگوں سے کہہ دو کہ تبلیغ کے بدلے میں میرے اقربا سے محبت کریں۔ یہ اللہ کا پیغام رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان سے پہنچا دیا۔ اب یہ اقربا خدا کے نہ ہوں گے تو اور کس کے ہوسکتے ہیں؟

آپ کہیں گے کہ بات تو ٹھیک ہے مگر دل تسلیم نہیں کرتا کیونکہ کہیں اللہ کے بھی رشتہ دار ہوتے ہوں گے۔ مگر ذرا آیت کے الفاظ دیکھئے۔ وہاں رشتوں کے نام نہیں بتائے گئے ہیں کہ بھائی کو دینا، بیٹے اور بھتیجے کو دینا وہاں تو لفظ اقربیٰ کا ہے یعنی جو مجھ سے اقرب ہیں، جو میرے مقرب ہیں ان کو اجرت دے دینا تو کیا ایسے بندے نہیں جو خدا کے مقرب ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ خدا کے اقربا نہیں ہوتے تو کیا خدا کے نفس اور روح ہوتی ہے؟ وہ خود فرماتا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنے نفس کے بدلے میں خدا کی مرضی خرید لیتے ہیں۔ جب اللہ نے اپنی مرضی فروخت کردی اور نفس خرید لیا تو یہ نفس خدا کا ہوگیا یا نہیں؟ دوسری آیت سنیئے: اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ وَاَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ٥ بے شک مریم کا بیٹا مسیح، اللہ کے رسولؑ اور اُس کا کلمہ ہیں اور ہم نے اسے مریم کی طرف القا کیا وَرُوْحٌ مِّنْهُ اور وہ خدا کی روح میں سے تھے۔ بتایئے خدا کے رُوح ہے؟ تو جس طرح خدا نے کسی کو اپنا نفس کہہ دیا۔ کسی کو اپنی رُوح کہہ دیا، اسی طرح کچھ لوگوں کو اقرباء کہہ دیا۔ کیا اقرباء کا لفظ نفس اور روح سے زیادہ ہے؟ جو لوگ نفس اللہ اور روح اللہ ہو سکتے ہیں وہ اقرباء یعنی مقرب نہیں ہو سکتے؟

ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ٥ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی پس وہ ان نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام نازل فرمایا اور یہ لوگ کتنے اچھے رفیق ہیں۔

جناب رسالت مآب اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کی تفسیر بیان فرما رہے تھے۔ اور ان کے چچا عباسؓ قریب بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا: نبیین سے مراد میں ہوں اور صدیقین سے مراد علیؑ ہیں، شہداء سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں اور صالحین سے مراد

فاطمہؑ ہیں اور حَسُن رفیقا یعنی اچھے رفیقوں سے بقیہ ائمہ طاہرین علیہم السلام مراد ہیں۔

جناب عباسؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! ایسی آیتوں میں آپ ان ہی حضرات کا تذکرہ کرتے ہیں اور ہمیں شامل نہیں فرماتے حالانکہ ہم بھی آپ کے عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ چچا جان! بے شک آپ ہمارے رشتہ دار ہیں مگر جس طرح سے ہماری خلقت ہوئی اس طرح آپ کی نہیں ہوئی۔ جناب عباسؓ نے پوچھا کہ آپ کی خلقت کس طرح ہوئی ہے؟

ارشاد فرمایا سب سے اوّل جب آسمان تھا نہ زمین، سورج تھا اور نہ چاند دن اور رات کا چکر نہ تھا، بلند پہاڑ اور گہرے سمندر نہ تھے۔ نہ مشرق تھی اور نہ مغرب، دُنیا مخلوق سے خالی تھی۔ صرف وحدہٗ لاشریک کی ذات تھی۔ اس وقت اسے منظور ہوا کہ مخلوق پیدا کی جائے۔ خدا نے پہلے ایک کلمہ فرمایا اور ایک نور خلق ہوا۔ یہ نور میں تھا۔ پھر قدرت نے اس نور کے پانچ حصے کیے۔ ایک حصہ میرا نور، دوسرا علیؑ کا، تیسرا فاطمہؑ کا، چوتھا حسنؑ کا اور پانچواں حسینؑ کا نور تھا۔ پھر قدرت نے میرے نور کو شگافتہ کر کے عرش و کرسی خلق فرمائے۔ میں عرش و کرسی کی اصل ہوں اور وہ مجھ سے ماخوذ ہیں۔ پس میں عرش و کرسی سے افضل ہوں اور عرش و کرسی مرتبے میں مجھ سے پست ہیں۔

پھر خدا نے علیؑ کے نور کو شگافتہ کیا اور اس سے ملائکہ و کروبین خلق فرمائے۔ علیؑ اصل ہیں اور ملائکہ و کروبین ان سے ماخوذ ہیں۔ پس علیؑ ان سے افضل ہیں۔ پھر خدا نے فاطمہؑ کے نور کو شگافتہ کیا اور اس سے زمین و آسمان خلق فرمائے۔ فاطمہؑ اصل ہیں اور زمین و آسمان ان سے ماخوذ ہیں۔ پس فاطمہؑ ان سے افضل ہیں اور زمین و آسمان مرتبے میں ان سے پست ہیں۔

پھر خدا نے حسنؑ کے نور کو شگافتہ کیا اور اس سے سورج و چاند پیدا کیے۔ حسنؑ اصل ہیں اور سورج و چاند ان سے ماخوذ ہیں۔ پس حسنؑ ان سے افضل ہیں۔ پھر خدا نے حسینؑ کے نور کو شگافتہ کیا اور اس سے بہشت اور حورالعین خلق فرمائے۔ حسینؑ اصل ہیں اور بہشت و حورالعین ان سے ماخوذ ہیں۔ پس حسینؑ ان سے افضل ہیں۔ اور بہشت و

حورالعین ان سے پست ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ یہ لوگ کتنے درجے پر فائز ہیں اور خدا کے کس قدر مقرب ہیں، ورنہ خدا کو کیا ضرورت تھی کہ وہ علیؑ کے نفس کو خریدتا اور نفس اللہ بنالیتا۔ آیۃ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ۔ ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ نے علیؑ کے نفس کو خرید لیا ہے اور وہ نفس اللہ ہیں۔

لیکن آیہ مباہلہ میں جب رسولؐ اللہ کو حکم ہوا کہ تم اپنے نفسوں کو لاؤ ہم اپنے نفسوں کو لائیں تو وہاں رسولؐ نفس کی جگہ حضرت علیؑ کو لے گئے تھے۔ گویا علیؑ نفس اللہ بھی ہیں۔ اور نفسِ رسول بھی ہیں۔ اس سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رشتہ داری کا یہ پہلو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو لوگ خدا کے مقرب ہیں وہی محمدؐ کی نورانیت اور رسالت کے بھی رشتہ دار ہیں اور جو لوگ بشریت کے رشتہ دار ہیں وہ صرف بشریت کے رشتہ دار تو ہیں مگر وہ رسالت کے رشتہ دار نہیں ہو سکتے۔

اگر علیؑ بشریت کے لحاظ سے محمدؐ کے نفس ہوتے تو جناب فاطمہؑ سے شادی نہیں ہو سکتی تھی اور اسی طرح حسنؑ و حسینؑ محمدؐ کی بشریت کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ نواسے ہیں لیکن وہ انہیں مباہلے میں اپنے بیٹوں کی جگہ لے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حسنؑ اور حسینؑ ان کی نورانیت اور رسالت کے فرزند ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اَنَا وَعَلِیٌّ " مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ میں اور علیؑ ایک نور سے ہیں۔ یعنی میری اور علیؑ کی خلقت ایک جیسی ہے۔ چونکہ کام مختلف کرنے تھے اس لئے مجھے رسول بنایا اور علیؑ کو جانشین رسول بنایا، ورنہ رسولؐ کے بعد سلسلۂ ہدایت بند ہو جاتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ کا انتقال ہو گیا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ محمدؐ کا نہیں رسالت کا انتقال ہوا ہے۔ محمد کا سلسلہ تو اب بھی باقی اور قائم ہے۔ حدیث سنیئے: اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَکُلُّنَا مُحَمَّدٌ۔ ہمارا اول بھی محمدؐ ہے ہمارا اوسط بھی محمدؐ ہے، ہمارا آخری بھی محمدؐ ہے اور ہم تو کل کے کل محمد ہیں۔ چودہ محمدوں میں سے اگر رسالت والے محمد کا انتقال ہو جائے تو یہ صرف رسالت کا انتقال ہوگا، سب محمدوں کا

انتقال نہیں مانا جاسکتا۔ ایک محمدؐ جائے گا تو دوسرا محمدؐ اس کی جگہ آجائے گا اور اسی طرح یہ سلسلہ بارہ امام تک جاری رہے گا۔ (صلواۃ)

جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہ سب ایک ہی نور کے ٹکڑے ہیں اور سب محمدؐ ہیں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان پر تبلیغ کا فعل واقع ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاوضہ دینے والے نہیں بلکہ اجرِ رسالت لینے والے ہیں۔ اگر دنیا نے اقرباء کو اجر ادا کردیا ہوتا اور لوگ ان سے محبت کرتے تو اسلام پر ہرگز زوال نہیں آسکتا تھا۔ آج اسلام دنیا پر چھایا ہوا ہوتا مگر افسوس ہے کہ رسالت کے اقرباء کی بجائے بشریت کے رشتہ داروں کو اقرباء سمجھ لیا گیا اور رسولؐ اللہ کی جانشینی اور اسلام کے اختیارات خاکی بندوں پر چل کر یزیدؔ تک جا پہنچے۔

امام حسینؑ کی عمر ستاون برس کی تھی مگر کسی نے ایک دن کے لئے بھی انھیں جانشین رسولؐ اور خلیفۂ رسولؐ نہ سمجھا۔ اب اسلام کے احکام بندوں اور تلوار کے زور پر چل رہے تھے۔ امام حسینؑ میں تمام صفات موجود تھیں صرف ایک تلوار کی کسر تھی اور یہاں یہ حال تھا کہ جب تک ہاتھ میں تلوار نہ ہو اس وقت تک اُمت جانشینِ رسولؐ ماننے کو تیار نہیں۔

یزید کے قبضے میں تخت تھا، حکومت تھی، تلوار تھی۔ تمام لوگ اسی کی طرف ہوگئے اور رسول کا پیارا نواسہ، فاطمہؑ کا لال اور خدا کا مقرب بندہ اتنا بے بس و بیکس رہ گیا کہ بچّوں اور عورتوں کو لے کر مدینہ چھوڑنا پڑا کے گئے تو وہاں بھی ایسے لوگ آنے لگے جو بظاہر معلوم ہوتا کہ حج کے لئے آئے ہیں مگر درپردہ وہ امامؑ کے قتل کے درپے تھے۔ اس لئے مکّے سے بھی روانہ ہونا ضروری ہوگیا۔

کوفے والے بار بار بلانے کے خطوط لکھ رہے تھے۔ امام حسینؑ سے زیادہ کوفے والوں کو کون جانتا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مسجد میں علیؑ کو شہید کیا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت امام حسنؑ پر برچھی کا وار کیا تھا اور مدائن میں جب وہ اپنے خیمے میں نماز پڑھ رہے تھے تو لوگ ان کے خیمے پر چڑھ آئے تھے اور ان کا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ یہاں تک کہ جس مصلّے پر وہ نماز پڑھ رہے تھے وہ بھی ان کے نیچے سے کھینچ لیا تھا۔

اگر کوفے والوں میں وفا ہوتی تو امام حسنؑ ہی کوفہ چھوڑ کر کیوں مدینہ میں آتے۔ مگر چونکہ حضرت حسینؑ امام تھے اور حجت تمام کرنا ضروری تھا، اگر کوفے نہ جاتے تو الزام آسکتا تھا کہ ہم نے تو بہت بلایا مگر وہ یہاں نہیں آئے اگر وہ یہاں آجاتے تو ان کو پناہ مل جاتی۔ لہٰذا امام حسینؑ نے جناب مسلمؑ کو حالات معلوم کرنے کے لئے کوفہ بھیجا۔ جناب مسلمؑ کا کوفے بھیجنا اس پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے کہ اگر امام حسینؑ کو کوفیوں پر اعتماد ہوتا تو ان کا امتحان لینے کے لئے جناب مسلمؑ کو کیوں بھیجا جاتا؟

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ جب جناب مسلمؑ کوفے میں پہنچے اور لوگوں میں ان کے آنے کا چرچا ہوا تو وہ ان کے پاس بیعت کے لئے آنے لگے۔ یہاں تک کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کر لی۔ جناب مسلم نے امام حسینؑ کو یہ خط لکھ کر بھیج دیا: "پیغامبر اپنے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ مجھ سے اٹھارہ ہزار اہلِ کوفہ نے بیعت کی ہے۔ آپ خط کو دیکھتے ہی ضرور کوفے تشریف لے آئیے۔"

اُس وقت کوفے کا گورنر نعمان تھا۔ جاسوسوں نے نعمان کی شکایت یزید کو لکھ کر بھیج دی کہ مسلم کا یہاں زور بڑھتا جا رہا ہے اور نعمان ان کے ساتھ سختی نہیں کرتا ہے اگر تمہیں کوفے کی خواہش ہے تو کسی زبردست شخص کو حاکم بنا کر بھیجو۔ یزیدؓ نے آلِ رسولؐ کے سب سے زیادہ دشمن ابن زیاد کو لکھا اور وہ اس وقت بصرہ کا گورنر تھا، کہ تم جلد کوفے جاؤ اور وہاں کے گورنر نعمان کو ہٹا کر خود چارج لے لو اور مسلمؑ کو گرفتار کر لو یا قتل کرا دو یا شہر سے باہر نکال دو۔

ابن زیاد روسائے بصرہ کو ساتھ لے کر کالا عمامہ سر پر رکھے، منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے کوفہ میں وارد ہوا۔ وہ جس مجمع کی طرف سے گزرتا تھا، لوگ اُسے السلام علیکم یا ابن رسولؐ اللہ کہتے تھے۔ وہ اس کے اس لباس کی وجہ سے سمجھ رہے تھے کہ حسینؑ ابن علیؑ آگئے ہیں۔

ابن زیاد قصرِ شاہی میں پہنچا اور احکام نافذ کئے کہ "لوگ مسلم ابن عقیل کا ساتھ چھوڑ دیں ورنہ ان کے ساتھ سختی کی جائے گی اور بُرے کی جگہ اچھا اور غائب کے بدلے

حاضر گرفتار کرلیا جائے گا۔ ہر قبیلے کے معزز لوگوں کو احکام بھیجے کہ وہ اپنے اپنے قبیلے کو عقوبتِ شاہی سے ڈرائیں اور مسلمؑ کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ کریں۔"

جب جناب مسلمؑ کوفے آئے تھے تو لوگوں نے ان کا بہت استقبال کیا تھا اور انھیں حضرت ہانی کے گھر میں ٹھہرایا گیا تھا۔ چنانچہ اب بھی جناب مسلمؑ ہانی کے گھر میں مقیم تھے۔ ابن زیاد نے جناب ہانی کو اپنے دربار میں بلایا۔ جب وہ آئے تو اُس نے غصے میں ان کے چہرے پر چھڑیاں مارنی شروع کردیں اور اتنی چھڑیاں ماریں کہ خون بہنے لگا اور حضرت ہانی لہولہان ہوگئے، پھر اس نے انھیں قید میں ڈال دیا۔ اس کے بعد جناب مختار کے لئے حکم نافذ کیا کہ جو انھیں گرفتار کے لائے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ جناب مختار گرفتار ہوکر آئے اور قید کرلئے گئے۔

شہر میں ابن زیاد نے جاسوس پھیلا دیے اور جناب مسلمؑ کے ساتھیوں پر عرصۂ عافیت تنگ کردیا۔ ایک ایک عورت آتی تھی اور اپنے بیٹے یا بھائی کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی تھی کہ یہاں سے چلو، ورنہ حکومت کے عتاب میں آجاؤ گے۔

شام کو نمازِ مغرب میں حضرت مسلمؑ کے پاس تیس آدمیوں سے زیادہ مسجد میں نہ تھے۔ مسجد سے جب آپ باہر نکلے تو لوگ پیچھے سے غائب ہونے لگے۔ ایک دفعہ مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی ساتھ نہ تھا۔ مسلمؑ تنہا جارہے تھے اور مڑ مڑ کر کوفے کی گلیوں میں چاروں طرف دیکھتے جاتے تھے۔ کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ راستہ بتائے کس کے گھر ٹھہریں۔

یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ جاتے جاتے ایک ایسے مکان سے گزرے جس کے دروازے پر ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا اس ہنگامے میں گیا ہوا تھا اور شام تک واپس نہیں آیا تھا۔ ماں دروازے پر کھڑی ہوئی اس کا انتظار کررہی تھی۔ جناب مسلمؑ نے اس سے پینے کے لئے پانی مانگا۔ اس نے پانی لاکر پلادیا۔ مسلمؑ وہیں بیٹھ گئے۔ عورت پانی کا برتن رکھ کر پھر باہر آئی۔ دیکھا تو پانی پینے والا شخص بیٹھا ہے۔ کہنے لگی بندۂ خدا کیا آپ نے پانی نہیں پیا؟ جناب مسلمؑ نے کہا۔ ہاں پیا۔ عورت نے کہا۔ اچھا اب اپنے گھر جایئے۔ زمانہ خراب ہے، لوگ مسلمؑ کا ساتھ دینے پر پکڑے

جارہے ہیں، ہنگامے ہورہے ہیں اور تم ہو کہ میرے دروازے پر بیٹھ گئے ہو۔ جناب مسلمؑ کا دل بھر آیا۔ دلدوز آواز میں کہا۔ اے نیک بخت! میں ہی مسلم ہوں۔ اب شہر میں میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔ کس کے گھر جاؤں، سب میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ طوعہ سے نہ رہا گیا۔ مومنہ تھی، کہنے لگی۔ مسلمؑ! مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آپ مسلمؑ ہیں۔ آیئے! میرے گھر میں تشریف لے آیئے۔ جناب مسلمؑ اس کے گھر میں چلے گئے۔ اس نے کھانا لا کر دیا مگر آپ نے کچھ نہ کھایا۔

جناب مسلمؑ نے ساری رات عبادتِ خدا میں بسر کی۔ صبح کی روشنی پھوٹی تو گھوڑوں کی ٹاپوں اور لوگوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ جناب مسلمؑ سمجھ گئے کہ مجھ پر مصیبت آ گئی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ابنِ زیاد نے عمرو بن عبید اللہ کے ماتحت ساٹھ ستر آدمیوں کا لشکر بھیجا تھا جس نے آ کر طوعہ کے گھر کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

مؤرخ آگے لکھتا ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھیوں میں سے تین بہت بہادر جوان تھے اور وہ شیرِ بنی ہاشم کہلاتے تھے۔ ان میں ایک جناب محمد حنفیہ ..... ان کو آپ مدینہ میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ آئے تھے اور اپنے سے علیحدہ کر دیا تھا ..... سرے شیر جناب عباسؑ تھے اور تیسرے شیر بھی جناب مسلمؑ بن عقیل تھے ان کو اپنا سفیر بنا کر کوفے میں بھیجا تھا۔ اللہ اللہ! مسلمؑ کی ذات پر امام حسینؑ کو کتنا بھروسہ تھا کہ جو حسینؑ کی بیعت کرنا چاہے وہ مسلمؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لے اور حسینؑ کے ہاتھ وہ ہاتھ تھے جن میں کبھی رسول اللہؐ کی زلفیں باگوں کی طرح تھیں۔ جس طرف کو حسینؑ اشارہ کریں اسی طرف کو رسالت مڑ جائے۔ آج ان ہاتھوں کی نیابت مسلمؑ کے ہاتھ کر رہے ہیں۔ جو مسلمؑ کی بیعت کر لے وہ حسینؑ کی بیعت میں ہو جائے گا۔ اور اسی طرح اس کے برعکس ہے کہ اگر معاذ اللہ حضرت مسلمؑ کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تو وہ امام حسینؑ کی بیعت ہو جائے گی۔ حضرت مسلمؑ کے ذمے اتنا بلند کام ہے اور حالت یہ ہے کہ نہ فوج ساتھ ہے نہ کوئی عزیز ہے۔ پردیس ہے، کوفے میں تنہا گھرے ہوئے ہیں مگر ثابت قدمی کا یہ عالم ہے کہ دنیا کو دکھا رہے ہیں کہ جب ابنِ زیاد کوفے میں تب تنہا مسلمؑ سے عالمِ پردیس اور عالمِ غربت میں

بیعت نہ لے سکا تو یزید امام حسینؑ سے کیسے بیعت لے سکتا ہے؟ ناممکن۔ناممکن۔ناممکن۔
میدانِ کربلا اور جناب مسلمؑ کے معرکے میں بڑا فرق ہے۔وہاں میدان میں جنگ تھی اور یہاں گلیوں میں مقابلہ ہے۔وہاں دشمن سامنے سے حملہ کرتے تھے اور یہاں گلی میں سامنے بھی لوگ ہیں، پشت پر بھی دشمن ہیں، چھتوں پر سے بھی پتھر اور آگ پھینکی جارہی ہے۔کربلا میں ہر غازی کے ساتھ امام حسینؑ ہوتے تھے اور دوسرے جاں نثاروں سے بھی ڈھارس رہتی تھی لیکن کوفے میں جناب مسلمؑ کا کوئی بھی نہیں جس سے ڈھارس ہو سکے۔اکیلے حضرت مسلمؑ ہیں اور سارا کوفہ ایک طرف ہے۔
مگر واہ رے مسلمؑ! ہاشمی جرأت کا سکہ بٹھا دیا۔جیسے ہی مصلے پر محاصرہ کی آواز سُنی فوراً تلوار نکال کر حجرے سے باہر نکلے۔دشمن گھر میں گھس پڑے۔
جناب مسلم نے تلواریں مار مار کر سب کو گھر سے باہر نکال دیا۔وہ لوگ پلٹ پلٹ کر حملہ کر رہے تھے اور مسلمؑ اُن کا مقابلہ کر رہے تھے کہ بکیر نامی ایک شخص نے حضرت مسلم کے منہ پر تلوار ماری جس سے ان کا اوپر والا ہونٹ کٹ گیا۔نیچے کا ہونٹ بھی زخمی ہوا اور دو دانت گر گئے۔جناب مسلمؑ نے فوراً جواب میں اُس کے سر پر کاری ضرب لگائی پھر دوسری تلوار اس کے کاندھے پر ماری جو اُچٹتی ہوئی گئی۔جنگ کا عالم یہ تھا کہ لوگ چھتوں پر سے پتھر برسا رہے تھے اور آگ سے دہکتی ہوئی لکڑیاں ان پر ڈال رہے تھے۔مسلمؑ ایک ہی وقت میں ہر طرف مصروفِ پیکار تھے یہاں تک کہ اس تنہا شیر بیشہ، شجاعت نے اُن سب روباہوں کو پسپا کر دیا۔
مجبوراً رسالہ دار نے ابنِ زیاد سے کمک طلب کی۔اس نے طعنے سے کہا افسوس ہے ایک شخص کے لئے تمہاری اتنی فوج ناکافی ہے اور کمک طلب کرتے ہو۔رسالہ دار نے غصے سے جواب دیا کہ کیا تم نے ہمارے مدِ مقابل کو کوئی بنیا یا جلاہا سمجھا ہوا ہے کہ آسانی سے گرفتار ہو جائے گا۔پتہ ہے، یہ کون ہیں؟ یہ مسلمؑ ہیں مسلمؑ۔یہ امام حسینؑ کے شیر ہیں۔
ابنِ زیاد ساکت ہو گیا، جواب نہ دے سکا، اس نے پھر تازہ سپاہی بھیجے اور دوبارہ مقابلہ تیز ہو گیا۔تاریخ کے یہ الفاظ ہیں کہ جناب مسلمؑ کا یہ عالم تھا کہ کبھی سامنے والوں پر حملہ

کرتے اور جب وہ بھاگ جاتے تو پشت والوں پر حملہ کرتے اور انھیں دُور بھگا دیتے۔ دو دو آدمیوں کے سر پکڑ کر ٹکرا دیتے اور انھیں مار کر پھینک دیتے۔ جب دوسری کمک بھی فیل ہونے لگی تو دشمنوں نے تجویز کیا کہ یہ بہادر اس طرح تو قابو نہیں آئے گا کچھ فریب کیا جائے۔ اور ایک گڑھا کھود کر اسے گھاس پھونس سے ڈھانپ دیا جائے تاکہ جب حضرت مسلم لڑتے لڑتے اس پر پہنچیں گے تو وہ گڑھے میں گر جائیں گے۔ ورنہ مسلمؑ جیسے آدمی کو گرفتار کرنا محال ہے۔

ابن زیاد نے کوفے میں جناب مسلمؑ ہی کی تو بہادری دیکھ لی تھی جو کربلا والوں کا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ لاکھوں سے زیر ہونے والے نہیں ہیں۔ تب ہی تو بہتر ۷۲ کے مقابلے میں چھ لاکھ فوج بھیجی تھی اور اس پر بھی ہدایت یہ تھی کہ کہیں انھیں پانی نہ مل جائے ورنہ شیروں کا مقابلہ مشکل ہو جائے گا۔ یعنی اتنی فوج پر بھی مایوسی تھی۔

غرض ان لوگوں نے راستے میں ایک گڑھا کھود دیا اور خود پیچھے ہٹنے لگے۔ جناب مسلمؑ حملہ کرتے کرتے اس گڑھے میں گر گئے۔ بس کیا تھا، چاروں طرف سے اشقیا ٹوٹ پڑے۔ نیزے پر نیزے، تلوار پر تلوار پڑنے لگی۔ جناب مسلمؑ کہاں تک مقابلہ کرتے زخموں سے چور چور، کثرت سے خون بہہ چکا تھا۔ ضعف نے مضمحل کر دیا تھا۔ آخر تھکے ہوئے دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک شخص نے قریب سے کہا۔ " آپ کے لئے امان ہے۔ پھر سب لوگ بیک آواز پکار اُٹھے ہاں ہاں آپ کے لئے امان ہے۔ جناب مسلمؑ نے ان دغا بازوں پر اطمینان کر لیا اور تلوار گلے میں لٹکا کر ان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا کہ وہ کنویں کے اوپر کھینچ لیں۔ ان ظالموں نے جناب مسلمؑ کو کنویں سے باہر کھینچ لیا اور تلوار گلے سے نکال لی۔ پھر انھیں ایک خچر پر سوار کر دیا اور سب کے سب ہجوم کر کے آگئے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت مسلمؑ کو اپنی جان سے مایوسی ہو گئی۔ آنسو آنکھوں میں بھر لائے۔ اور رونے لگے۔ ایک شخص نے کہا اگر دوسرا کوئی شخص آپ کی جگہ ہوتا تو وہ اس طرح زار و قطار نہ روتا۔ حضرت مسلمؑ نے کہا۔ میں اپنی جان کے لئے نہیں رو رہا ہوں۔ میں تو اِس لئے رو رہا ہوں کہ ہائے! میں امام حسینؑ کو آنے کے لئے لکھ چکا ہوں۔

ایک وقت تھا کہ اسی کوفے میں حضرت مسلمؑ کے چچا حضرت علیؑ بادشاہ تھے۔ جس بزم میں مسلمؑ بیٹھتے وہاں لوگ حاضر ہونے کو فخر سمجھتے تھے۔ آج اسی کوفے میں مسلمؑ گرفتار ہو کر بازاروں سے جارہے ہیں۔ مسلمؑ تو پھر بھی مرد تھے۔ ہائے! ایک وقت وہ آیا کہ اسی کوفے کی شہزادیاں جناب زینبؑ، جناب کلثومؑ اور دوسری بیبیاں، بے پردہ، بال بکھرائے، پسِ گردن ہاتھ باندھ کر پھرائی گئیں۔ اور کوفیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر ان کا تماشہ دیکھا۔ ہائے! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔

جناب مسلمؑ کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے دربار میں لایا گیا۔ زخموں کی وجہ سے آپ پر پیاس کا غلبہ تھا۔ قصر کے دروازے پر ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی رکھی تھی۔ آپ نے ایک جام آب طلب کیا مگر انھیں پانی نہیں دیا گیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص سے نہ دیکھا گیا اس نے اپنے غلام سے پانی منگوا کر حضرت مسلمؑ کو پیش کیا۔ یہ جب پانی پینا چاہتے تھے تو کٹورا منہ اور ہونٹ کے زخم کے خون سے بھر جاتا تھا۔ جب تیسری دفعہ غلام نے پانی دیا تو سامنے کے دونوں دانت ہی کٹورے میں آرہے۔ جناب مسلمؑ نے مایوسی کے عالم میں کوزہ واپس کر دیا اور کہا۔ "اب میں دنیا سے پیاسا ہی جاؤں گا۔" ہائے! مسلمؑ کیا پانی پیتے۔ وہ تو پیاسے امامؑ پر فدا ہو رہے تھے۔ امامؑ پیاسے شہید ہونے والے تھے۔ ان کا ہر ساتھی دنیا سے پیاسا اُٹھنے والا تھا۔ ارے! مسلمؑ کو بھی اسی پیاسے قافلے میں شامل ہونا تھا۔ پھر جناب مسلمؑ کو ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے اسے سلام نہیں کیا۔ اس کا ایک سپاہی بولا۔ آپ نے امیر کو سلام نہیں کیا۔ آپ نے دلیری سے سپاہی کو جواب دیا۔ "میرے امیر حسینؑ ہیں۔ ان پر میرا سلام ہے۔" ابن زیاد نے طیش میں آکر کہا تو بیشک میں تمہیں قتل کروں گا۔ اس پر جناب مسلمؑ نے ابن زیاد کے ہم نشینوں کی طرف نظر کی۔ عمر ابنِ سعد بھی وہاں بیٹھا تھا، اسے مخاطب کر کے کہا۔ اے ابن سعد مجھ میں اور تجھ میں کچھ قرابت ہے۔ میں تجھ سے وصیت کرتا ہوں کہ میرا گھوڑا فروخت کر کے میرا قرض ادا کر دینا اور میری لاش کو دفن کر دینا۔ اور تیسری وصیت یہ ہے کہ میں امام حسینؑ کو آنے کے لئے لکھ چکا ہوں، انھیں اطلاع کر دینا کہ اب وہ یہاں تشریف نہ

لائیں۔ اب ابن زیاد نے غرور سے کہا۔ میں آپ کو اس طرح قتل کروں گا کہ آج تک اسلام میں کوئی اس طرح قتل نہ ہوا ہوگا۔ جناب مسلمؑ نے وہیں بھرے دربار میں اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ ہاں! بے شک اسلام میں جو ظلم کبھی نہیں ہوا اس کے ایجاد کرنے کا تو ہی سزاوار ہے۔ بری طرح قتل کرنا، بُری طرح سر کاٹنا اور غالب ہو کر ملامت سہنا تیرا ہی حصّہ ہے۔ اس پر ابن زیاد نے کہا کہ وہ شخص کہاں ہے جس کے سر پر اور شانے پر مسلمؑ نے تلوار ماری تھی۔ لوگ بکیر کو پکڑ کر لے آئے۔ ابن زیاد نے کہا۔ اے بکیر! مسلمؑ کو قصر کی چھت پر لے جا اور ان کی گردن مار دے اور پھر سر کے ساتھ جسم کو بھی نیچے پھینک دے۔

جب مسلمؑ کو کوٹھے پر چڑھایا جانے لگا۔ تو وہ تکبیر و استغفار پڑھتے جاتے تھے۔ جب لعنتی بکیر نے انھیں قتل کرنے کے لئے اپنی طرف کھینچا تو جناب مسلمؑ نے آسمان کی طرف رُخ کر کے حسرت و یاس سے کہا۔ خداوندا! ہمارا اور ان لوگوں کا انصاف تیرے ہاتھ میں ہے۔ پہلے بکیر نے چرکا دینے کے لئے تلوار کا ایک خالی وار کیا اور پھر دوسرے وار میں وہ ظلم کیا کہ سر اور جسم میں جدائی ہوگئی۔ بکیر نے سر کے ساتھ حضرت مسلمؑ کا جسم بھی نیچے پھینک دیا۔

اُدھر امام حسینؑ مدینے سے روانہ ہو چکے تھے اور کوفہ کی طرف آرہے تھے ایک منزل پر آپ نے دیکھا کہ ایک شخص کوفے کی جانب سے آرہا ہے۔ فوراً جناب عباسؑ سے کہا۔ بھائی! ذرا اس کو بلا لاؤ تا کہ کچھ بھائی مسلمؑ کا حال معلوم کریں۔ جناب عباسؑ دوڑے اور اس آدمی کو بلا لائے۔ امام نے نرمی سے اس سے پوچھا۔ بھائی کہاں سے آرہے ہو؟ عرض کیا کوفے سے آرہا ہوں۔ فرمایا۔ کچھ ہمارے بھائی مسلمؑ کا حال بھی معلوم ہے؟ یہ سُننا تھا کہ اس شخص نے اپنا سر پیٹ لیا اور رو کر کہا۔ مولا! تمام شہر مسلم سے پھر گیا اور انھیں ظلم و ستم سے شہید کر دیا۔ یہ سُننا تھا کہ امام رونے لگے۔ پھر آنسو پونچھ کر خیمے میں تشریف لائے، جناب مسلمؑ کی بیٹی کو بلایا اور بڑی شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے۔ بچی نے اسی گھرانے میں تربیت پائی تھی۔ دل میں وسواس آنے لگے۔ اچانک گھبرا کر پوچھا۔ چچا جان! آپ تو میرے سر پر اس طرح ہاتھ پھیر رہے ہیں جس

طرح یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ کیا میرے بابا کی خبر ہے؟ امام رونے لگے اور روکر فرمایا بیٹی! اب تم ہم کو اپنا باپ سمجھو۔ یہ سُننا تھا کہ حضرت مسلمؑ کی بچی چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ سب عورتیں اکٹھی ہوگئیں اور تمام بیبیوں میں ایک کہرام مچ گیا۔

اَلا لَعْنَتُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۵

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۵

☆☆☆

چھٹی مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۵

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ۵ (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ!) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ رسولت کا معاوضہ سوائے اپنے اقرباء کی محبت کے اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔

جناب رسولؐ خدا نے جو کچھ بھی تبلیغ فرمائی، وہ سب قرآن ہے اور یہاں قرآن پہنچانے کی اُجرت مانگی جارہی ہے۔ بتایئے! کہیں ہدایت بھی اُجرت پر ہوتی ہوگی۔ اور پھر خدا ہو کر رسالت کا معاوضہ بندوں سے مانگ رہا ہے مگر بات یہ ہے کہ اُجرت کیوں نہ مانگے، وہ خود بھی تو بندوں کی چیزوں کو خریدتا ہے۔ مفت نہیں لیتا۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جن کے نفس کو اللہ اپنی مرضی کے عوض خرید لیتا ہے۔ جب وہ دوسروں کے نفس کی اُجرت دیتا ہے تو اپنے رسولؐ کی تبلیغ کا معاوضہ بھی مانگتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ بے شک اللہ نے مومنین سے ان کے نفس اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ خدا وہ ہے کہ جس نے ہر مخلوق کو پیدا کیا۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے تو پھر مومنین سے جان اور مال خریدنے کے کیا معنی ہیں۔ وہ تو ویسے ہی

سب اُس کا ہے۔ لیکن جب وہ خود خریدتا ہے تو پھر بندوں سے معاوضہ بھی لے سکتا ہے۔
اگر لوگوں کو خریدنے پر تعجب نہیں ہے تو پھر اُجرت طلب کرنے پر بھی حیرت کا اظہار نہیں
کرنا چاہیئے۔

البتہ یہ بات ہے کہ جب معاوضہ طلب کرنا تھا تو لوگوں کو مفت تبلیغ نہیں کرنی
چاہیئے تھی۔ یہ کیا ہوا کہ پہلے مفت تبلیغ کر دی اور پھر بعد میں اقربا کے لئے معاوضہ وصول
کرنے کو کہہ دیا۔ نہ معلوم وصول بھی ہو یا نہ ہو۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اقربا کو تبلیغ دے جاتے
اور فرما جاتے کہ جو معاوضہ دیتا جائے اُسے تبلیغ دیتے جانا اور جو تمہیں اُجرت نہ دے، تم
بھی اُسے تبلیغ نہ دینا۔ (ہنس کر) نقد سودا ہو اُدھار کا کھاتہ ہی نہ رکھا جائے۔ یہ بھی کوئی
طریقہ ہے کہ پہلے مفت لٹا دیں اور پھر معاوضہ طلب کیا جائے۔ ایسا تو ہم جیسے بیوقوف
انسان بھی نہیں کرتے تو بھلا خالق ایسا کیوں کرنے لگا ہے۔ غور کیجیئے تو آپ کو پتہ لگے گا کہ
اس نے مفت دیا ہی کب ہے۔

لوگ سمجھتے رہیں کہ انھیں کتاب مل گئی ہے، قرآن مل گیا ہے اور تبلیغ ہو گئی ہے۔
اب اُن کی مرضی ہے کہ معاوضہ دیں یا نہ دیں۔ زیادہ سے زیادہ گنہگار ہی ہو جائیں گے مگر
گنہگار تو بعد ہی میں ہوں گے۔ پہلے تبلیغ تو پہنچ جائے۔ قدرت نے انتظام ہی ایسا رکھا ہے
کہ جب تک معاوضہ ادا نہ کیا جائے کسی کو رتی برابر تبلیغ نہیں پہنچ سکتی۔ آیئے دیکھیئے:

آپ نے خدا کے کہنے پر غور ہی نہیں کیا۔ وہ جب قُل کہہ کر خطاب کرتا ہے تو اس
سے مراد غیر ہدایت یافتہ لوگ ہوتے ہیں وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کافروں سے کلام
کرے۔ بلکہ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ **قُلْ** یعنی اے رسولؐ کہہ دو۔ جیسے: **قُلْ
يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ** ۔ اے رسولؐ! کہہ دو کہ اے کافرو! میں اس
کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو۔ لیکن جب مومنین سے خطاب کرتا ہے تو **قُلْ** کا
لفظ نہیں ہوتا بلکہ براہ راست ارشاد فرماتا ہے۔ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** یعنی اے ایمان
والو۔ اپنے مومن بندوں سے خود کلام کرتا ہے۔

ایک آیت پیش کرتا ہوں اس سے مطلب صاف سمجھ میں آ جائے گا۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ۔ عرب کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اے رسولؐ قُلْ .... ان سے کہہ دو کہ اس طرح نہ کہیں کہ ایمان لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے۔ اس کے آگے ہے لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ابھی تو تمہارے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا۔

لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور آیت منع کر رہی ہے کہ ایمان نہیں، تم تو اسلام لائے ہو کیونکہ تمہارے دل ابھی نورِ ایمان سے خالی ہیں۔ یعنی تم مومن نہیں، مسلمان ہو۔ یہاں آیت میں مسلمانوں سے قُل کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ جس طرح کہ کفار سے خطاب کیا جاتا ہے اور یہ بھی صاف صاف بیان کر دیا کہ تم صرف مسلمان ہو، اور مومن نہیں ہو۔

جب ان کا مسلمان ہونا تسلیم ہے تو معلوم ہوا کہ ان پر تبلیغ رسالت ہو چکی ہے۔ اور انھوں نے رسول کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ ورنہ وہ کافر ہوتے لیکن آیت نے بتایا کہ وہ مومن نہیں ہیں یعنی ان کے دلوں میں ایمان ابھی نہیں آیا ہے (ہنس کر) بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ تبلیغ وصول کر چکے ہیں جس کی سند یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں مگر ابھی تبلیغ کا معاوضہ ادا نہیں کیا ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ... مودت نہیں کی۔ اس لئے مومن نہیں ہیں۔ (صلواۃ)

قرآن کا یہ تسلیم کرنا کہ اسلام لے آئے ہیں بتا رہا ہے کہ تبلیغ پہنچی ہے۔ جب قرآن پہنچا ہے تو ایمان دلوں میں کیوں نہیں داخل ہوا۔ معلوم ہوا جو معاوضہ دیتے جاتے ہیں ان کے دلوں میں ایمان داخل ہوتا جاتا ہے اور اُجرت نہیں دیتے۔ تبلیغ کا معاوضہ مار لیتے ہیں ایمان بھی انھیں نہیں ملتا۔ (صلواۃ)

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ٥ یعنی قرآن کریم پوشیدہ کتاب میں ہے، اسے کوئی نہیں چھو سکتا۔ سوائے ان کے جنھیں خدا نے طاہر قرار دیا ہے۔ یہاں چھونے کے کیا معنی؟ کافر بھی قرآن کو چھو سکتے ہیں۔ معلوم ہوا چھونے سے مراد قرآن کا سمجھنا ہے یعنی سوائے خدا کے پاک بندوں کے قرآن کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ پاک بندے کون ہیں؟

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۔ اللہ یہ ارادہ کر چکا ہے کہ اے اہلِ بیت! تم سے ہر قسم کی بُرائی کو دور رکھے اور ایسا پاک و پاکیزہ قرار دے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔ معلوم ہوا یہی وہ "طاہر لوگ" ہیں جن کے سوا کوئی قرآن کو نہیں سمجھ سکتا۔

جسم کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک بدن ہوتا ہے دوسری روح ہوتی ہے۔ ایک شخص سائنسدان ہو یا بہت ماہر ڈاکٹر ہو لیکن جب اس کے جسم سے روح علیحدہ ہو جاتی ہے تو نہ اس کے پاس سائنس رہتی ہے اور نہ ڈاکٹری کا تجربہ۔ حالانکہ اُس کا دماغ موجود ہوتا ہے۔ دل موجود ہوتا ہے اور سارا بدن موجود ہوتا ہے۔ صرف روح نہ ہونے سے اس کا سارا جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ زندہ آدمی کی ہزاروں روپے تنخواہ ہوتی ہے مگر روح نکلتے ہی وہی جسم بے قیمت ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا یہ قیمت جسم کی نہیں ہے بلکہ اس چیز کی ہے جو اُسے حرکت دیتی ہے اور سارا کچھ دارومدار روح پر ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے۔ قرآن ایک جسم ہے، لکھے ہوئے الفاظ کی ایک کتاب ہے اور اہل بیتؑ اس کی روح ہیں۔ اگر قرآن سے اس کی روح الگ کر دی جائے گی تو خالی جسم ہی جسم باقی رہ جائے گا۔ اگر قرآن کو سمجھنا ہے تو ان کے در پر آنا پڑے گا۔ قرآن الفاظ ہیں اور اہلِ بیتؑ اس کے معنی ہیں۔ اگر اہلِ بیتؑ سے محبت رکھو گے تو یہ قرآن کا مفہوم سمجھا دیں گے اور اگر اہلِ بیتؑ کو چھوڑ دیا تو خالی الفاظ اور قرآن تمہارے پاس رہ جائے گا۔ چونکہ تم اسے اللہ کا کلام تسلیم کرو گے اس لئے مسلمان رہو گے۔ بغیر اہلِ بیتؑ سے تعلق رکھے، معنی سے محروم رہو گے اور مومن نہیں بن سکو گے۔ رسولؐ اللہ نے اس مفہوم کو کیا ہی اچھے الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔ إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللَّهِ وَ عِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي وَلَنْ يَفْتَرِقَا مِنْهُمَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ ٥ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب ہے اور دوسری میری عترت اہلِ بیتؑ ہیں۔ اگر تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اور ان دونوں میں کبھی جدائی نہ ہو گی۔ یہاں تک کہ

میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں گے۔

رسولؐ اللہ نے دوگراں قدر چیزیں چھوڑی ہیں اگر ایک سے کام چل جاتا تو دوسری چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔آپ نے دو چیزیں چھوڑ کر یہ بتادیا کہ اگر کتاب کو کافی سمجھو گے تو صرف مسلمان رہو گے، مومن نہیں بن سکو گے۔اگر مومن بننا ہے تو اپنے دل میں ایمان کو داخل کرو۔اپنے دل میں اہلِ بیتؑ کی محبت رکھو۔

رسولؐ اللہ نے لوگوں کو تبلیغ پہنچادی اور قرآن کے ظاہری الفاظ ان کے حوالے کردیے مگر مفہوم اہلِ بیتؑ کے پاس محفوظ رکھا تاکہ جو اُجرت دیتا جائے گا وہ قرآن کے علم سے فیضیاب ہوتا جائے گا۔اور قرآن تو بہت بڑی چیز ہے آپ ان کے بغیر کسی بھی چیز کے باطنی کمالات سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔قدرت ہر ایک فیض کو اہلِ بیتؑ ہی کے تمسک سے عطا کرتی ہے۔

آپ ایک آم ہی کی مثال لے لیجیے۔یہ ایک کھانے کا پھل اگر آپ اس کے باطنی اوصاف دیکھیں تو اس کی گٹھلی میں سب کچھ ہے اس میں ہرے ہرے پتے ہیں سبز ڈالیاں ہیں۔موٹے موٹے گدّے ہیں۔بھاری بھرکم تنا ہے۔دُور تک پھیلی ہوئی جڑیں ہیں اور اسی قسم کے سینکڑوں آم اس میں مضمر ہیں۔پھلوں پر ہی کیا موقوف ہے اس گٹھلی میں سینکڑوں درخت ہیں اور باغ کے باغ سمائے ہوئے ہیں لیکن کیا یہ نظر آتے ہیں اور ہم انھیں برآمد کرسکتے ہیں؟

آج کل سرجری نے بڑی ترقی کی ہے آپ ایک ماہر سرجن سے آم کی گٹھلی کا آپریشن کرائیے۔(مسکرا کر) سچ بتائیے کیا وہ اس میں چھپا ہوا تن آور درخت نکال لے گا۔چلئے بڑا نہیں، چھوٹا ہی درخت نکال کر دکھادے۔ایک پتی ہی نکال کر دکھادے۔

بڑے سے بڑا سرجن فیل ہو جائے گا اور اس گٹھلی میں سے کچھ نہ نکال سکے گا بلکہ آپریشن کر کے اس تخم ہی کو بیکار کردے گا اور اسے روئیدگی کے قابل ہی نہ چھوڑے گا۔ لیکن اگر آپ اس تخم کو مٹی کے سپرد کردیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں سے چھوٹی چھوٹی پتیاں پھوٹ رہی ہیں، باریک سا تنا نکل رہا ہے، دھاگے کی طرح جڑیں پھیل رہی

ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہی پودا بڑے ڈیل ڈول کا درخت بن جائے گا۔ اور اس پر اسی قسم کے سینکڑوں ہزاروں پھل لگ جائیں گے۔ یہ کرشمہ آپ کو کس نے دکھایا۔ مٹی نے معلوم ہوا مٹی کے بغیر آپ ایک آم باطنی اوصاف سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تو پھر بتایئے! ابوتراب کے بغیر آپ کسی چیز کے باطنی کمالات سے پوری طرح کیسے فیضیاب ہو سکیں گے۔

آم کے تخم میں صرف آم ہی کے درخت ہوتے ہیں۔ آپ نے کبھی گٹھلی سے کیلا اُگتا ہوا نہ دیکھا ہوا۔ انار، انار ہی کے تخم سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن قرآن وہ چیز ہے جس میں ہر خشک وتر موجود ہے۔ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ جب آپ ایک آم ہی کے تخم کو نہ سمجھ سکے جس میں صرف آم ہی کے درخت ہیں تو پھر آپ اس قرآن کو کیا سمجھ سکیں گے جس میں دُنیا کا ہر خشک وتر موجود ہے۔ جس طرح آم کو سمجھنے کے لئے آپ تراب اور مٹی کے محتاج تھے اِسی طرح آپ قرآن کو سمجھنے کے لئے ابوتراب کے محتاج ہیں۔ ارشاد قدرت ہے: كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ٥ ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں محصور کر دیا ہے۔ جو کچھ معلوم کرنا ہے امام مبین سے معلوم کرلو۔ (صلواۃ)

منبر رسولؐ ہے اور میرا مولا فرما رہا ہے: سَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ ۔ اے لوگو! جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو، اس سے پہلے کہ تم مجھے کھو بیٹھو۔ ایک شخص نے سوچا کہ علیؑ کا دعویٰ ہے کہ وہ اوّل وقت نماز پڑھتے ہیں۔ لہٰذا ان سے اذان کے وقت ایسا لمبا سوال کروں کہ یا تو وہ اس کا جواب ہی نہ دے سکیں اور اگر جواب دینے لگیں تو اتنا طویل جواب ہو کہ نماز کی فضیلت کا وقت گزر جائے۔ اس طرح ان کا کم از کم ایک دعویٰ ضرور جھوٹا ثابت ہو سکے گا۔ چنانچہ وہ اس وقت علیؑ کے پاس آیا۔ جب آپ گلدستۂ اذان پر پہنچے اور چاہا کہ اذان کی آواز بلند کریں۔ اس شخص نے فوراً سوال کیا۔ یا علیؑ! بتایئے کہ کون کون سے جانور انڈے دیتے ہیں؟ اور کون کون سے جانور بچے دیتے ہیں؟ مولائے کائنات نے برجستہ جواب دیا: جن جانوروں کے کان ظاہر ہیں وہ بچے دیتے ہیں اور جن جانوروں کے کان ظاہر نہیں ہیں وہ انڈے دیتے ہیں اور فرمایا کہ سال بھر تک تحقیق کرنا

اور پھر مجھے آکر بتانا کہ جواب صحیح ہے یا نہیں؟ یہ کہہ کر اذان شروع کر دی۔ اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔

وہ شخص سال بھر تک جانوروں کو دیکھتا رہا مگر کہیں فرق نہ پایا۔ سال پورا ہوا تو آکر کہنے لگا۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔ مولا نے کہا اے شخص سُن! جو جانور غذا چبا کر کھاتے ہیں وہ بچے دیتے ہیں اور جو بغیر چبائے ثابت دانے نگل جاتے ہیں وہ انڈے دیتے ہیں اور فرمایا کہ سال بھر تک تحقیق کر کے بتانا کہ جواب درست ہے یا نہیں۔

وہ شخص سال بھر تک جانوروں کو دیکھتا رہا مگر کہیں فرق نہ پایا۔ حاضر خدمت ہو کر کہنے لگا۔ یا علیؑ آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔ آپ نے پھر کہا، اے شخص سُن! جو جانور اپنے بچوں کو بھراتے ہیں یعنی ان کے منہ میں غذا ڈالتے ہیں۔ وہ انڈے دیتے ہیں اور جانور اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں وہ بچے دیتے ہیں۔ پھر فرمایا جاؤ اور سال بھر تک تحقیق کرو۔ سائل کہنے لگا، مولا! کہاں تک تحقیق کروں گا، آپ کا ارشاد بالکل درست ہوتا ہے۔ فرمایا۔ اگر تو قیامت تک یونہی سوال کرتا رہے گا تو ہر دفعہ نیا جواب دیتا رہوں گا۔ (صلواۃ)

سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ کا دعویٰ کرنا آسان ہے۔ مگر ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ لوگ طرح طرح کے سوال علیؑ سے کرنے لگے۔ ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرے یہاں بہت سی بکریاں پلی ہوئی ہیں اور ان کی حفاظت کے لئے میں نے کتے بھی رکھے ہیں۔ میرے یہاں ایک بکری کے ایسا بچہ پیدا ہوا ہے کہ اس میں کچھ کچھ کتے کی صفات ہیں اور کچھ کچھ بکری کی صفات ہیں۔ فرمایئے! میں اسے بکری سمجھوں یا کتا؟

آپؑ نے فرمایا۔ جب وہ پانی پیئے تو دیکھنا کہ وہ پاؤں موڑ کر ہونٹوں سے گھونٹ بھرتا ہے یا زبان نکال کر پانی کو چاٹتا ہے۔ اگر گھونٹ سے پیئے تو بکری کا بچہ ہے اور اگر زبان نکال کر پانی کو چاٹے تو کتے کا بچہ ہے۔ اس نے کہا مولا! میں یہ دیکھ چکا ہوں۔ وہ کبھی گھونٹ سے پیتا ہے اور کبھی چاٹ کر پی لیتا ہے۔

فرمایا اس کے سامنے گوشت کو ٹکڑا ڈال کر دیکھ لو۔ اگر گوشت کو کھائے تو سمجھ لینا

کے کتے کا بچہ ہے اور اگر ہٹ جائے اور منہ نہ لگائے تو سمجھنا کہ بکری کا بچہ ہے۔ اس نے کہا۔ مولا! یہ بھی دیکھ چکا ہوں۔ کبھی گوشت سے منہ پھیر لیتا ہے اور کبھی ذرا ذرا زبان سے چاٹ بھی لیتا ہے۔ آپ نے فرمایا تو اس کی بولی سُن۔ اگر ممنائے تو بکری کا بچہ ہے اور اگر منہ اُٹھا کر روئے تو کتے کا بچہ ہے۔

اُس شخص نے عرض کیا کہ آقا! دونوں طرح کرتا ہے۔ فرمایا گلے کے ساتھ لے جا کر آزمائش کرو۔ اگر بکریوں کے بیچ میں چلے تو بکری کا بچہ ہے اور اگر گلے کے کنارے کنارے چلے تو کتے کا بچہ ہے۔ کہنے لگا۔ حضرت! یہ بھی کر کے دیکھ چکا ہوں کبھی بیچ گلے میں گھس کر چلتا ہے اور کبھی گلے سے علیحدہ ہو کر کنارے کنارے حفاظت کرتا ہوا چلتا ہے۔ فرمایا! اسے ذبح کر کے دیکھ لو۔ اگر صرف ایک آنت نکلے جس کو نلا کہتے ہیں تو کتے کا بچہ ہے اور اگر ایک آنت نہیں بلکہ متعدد آنتیں نکلیں تو بکری کا بچہ ہے اور حلال ہے۔ یہ سُن کر سائل کے اوسان خطا ہو گئے، دنگ رہ گیا۔ اب کیسے کہے کہ مولا! ذبح کر کے بھی دیکھ چکا ہوں، کبھی ایک آنت نکلتی ہے اور کبھی کئی آنتوں کا گچھا۔ شرمندہ ہو کر قدموں پر گر پڑا۔ عرض کیا مولا! میرے یہاں نہ بکریاں ہیں اور نہ کتے پلے ہیں۔ میں نے تو صرف آپ کا علم دیکھنے کے لئے یہ سوال کیا تھا۔ مگر آپ نے تو جواب دے کر علم کے دریا بہا دیئے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ سائل نے یہ سوچا ہو گا کہ کتا اس گھرانے میں سخت نجس سمجھا جاتا ہے اور وہ اس گھرانے میں کبھی پلا ہی نہ ہو گا اس لئے انھیں کتے کی زیادہ صفات معلوم نہ ہوں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کتے کا سوال کیا ہو گا۔ مگر واہ رے علیؑ! سلونی کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ اسے ثابت کر کے دکھا دیا۔ دُنیا نے خوب پہچان لیا کہ قرآن کے وارث کون ہیں؟ اور کن کے لئے محبت رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دُنیا نے پہچان ہی تو لیا تھا جو ان کے دشمن ہو گئے تھے اور آلِ محمدؐ کے بچے بچے کے خون کے پیاسے تھے۔

آج تک دنیا میں رسم جاری ہے کہ ایلچی کے لئے امان ہوتی ہے لیکن یہ رواداری امام حسینؑ کے ایلچی جناب مسلمؑ کے لئے روا نہ رکھی گئی۔ کوفے میں ان کے ساتھ دغا کی گئی۔ انھیں ظلم و ستم سے شہید کیا گیا۔ کہنے والے کہہ دیتے ہیں کہ مخالفت میں سب کچھ کیا

جاتا ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ چلو حضرت مسلمؑ سے تو مخالفت تھی اس لئے انھیں شہید کر دیا گیا مگر یہ بتایا جائے کہ ان کے بچوں کا کیا قصور تھا۔ وہ تو معصوم تھے لیکن ان کے بھی خون کے پیاسے ہو گئے۔ کوفے میں مسلمانوں کی حکومت، مسلمانوں کا شہر تھا اور مسلمؑ کے بچوں کو کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ نہیں معلوم رسولؐ کے بعد مسلمانوں کو کیا ہو گیا تھا کہ ان کے دل سے رحم اُٹھ گیا تھا۔ محمدؐ کے خاندان کو مٹانے کے لئے کمر باندھے ہوئے تھے۔

جب جناب مسلمؑ سے کوفہ پھر گیا تھا اور آپ سمجھ گئے تھے کہ شہید کر دیا جاؤں گا تو آپ نے اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو جو ان کے ساتھ مدینے سے آئے تھے، کوفے میں ایک شخص قاضی شریح کے سپرد کر دیا تھا کہ میرے بعد انھیں مدینے پہنچا دینا۔ حضرت مسلمؑ کے بڑے بیٹے کا نام محمدؐ اور چھوٹے بیٹے کا نام ابراہیم تھا۔ بڑے لڑکے کی عمر آٹھ سال اور چھوٹے کی سات سال تھی۔ ذرا تصور کیجیے کہ اس کمسنی میں ان بچوں پر کیا گزر گئی۔ جب حضرت مسلمؑ شہید ہو گئے تو قاضی شریح نے اپنے بیٹے کے ہاتھ ان لڑکوں کو بھیج دیا کہ شہر سے باہر ایک قافلہ مدینے جانے والا ہے۔ تم انھیں اس قافلے میں پہنچا آؤ۔ لیکن بچوں کی قسمت میں مدینہ کہاں تھا۔

شریح کا بیٹا انھیں دُور سے قافلہ دکھا کر چلا آیا کہ آگے بڑھ کر اس قافلے سے مل جانا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اُنھوں نے بڑی کوشش کی کہ تیز چل کر قافلے سے مل جائیں لیکن قافلے کی رفتار زیادہ تھی اور وہ کچھ دیر کے بعد ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بچے راستے سے ناواقف تھے، بے کسی کا عالم، باپ شہید ہو چکے تھے، چھوٹی چھوٹی عمریں تھیں، ڈرے ہوئے تھے۔ حاکم خون کا پیاسا تھا۔ اپنا کوئی ہمدم و مونس نہ تھا۔ جاتے تو جہاں جاتے اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ چھپتے ہوئے پھرنے لگے۔

اودھر ابنِ زیاد نے منادی کرا دی کہ مسلمؑ کے ساتھ ان کے دو فرزند بھی آئے تھے انھیں تلاش کیا جائے اور جو شخص انھیں پناہ دے گا یا اپنے گھر میں چھپائے گا اس کا گھر لوٹ لیا جائے گا۔ جگہ جگہ منادی کرنے والا کہتا تھا کہ دیکھو مسلمؑ کے بچوں کے حال پر ترس نہ کھانا، انھیں پناہ نہ دینا ورنہ تم پر حاکم کا عتاب آ جائے گا اور گھر لوٹ لیا جائے گا۔ اولاد

والی عورتیں سُن سُن کر رو رہی تھیں اور آپس میں کہتے تھیں کہ کیا کریں، مسلمؑ کے بچوں کو کہاں ڈھونڈنے جائیں۔ ہر طرف حاکم کے جاسوس پھر رہے ہیں۔ نہ معلوم بچوں کا کیا حال ہے۔ یتیموں کو کھانا بھی ملا ہے یا نہیں۔ نہ یہاں ان کی ماں ہے اور نہ کوئی بہن ہے۔ کوئی کہتی تھی کہ نہ معلوم کہاں چھپے ہوئے اپنے باپ کو یاد کر کے رو رہے ہوں گے۔

ابن زیاد بار بار سپاہیوں سے تقاضے کر رہا تھا کہ بچوں کو جلد حاضر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مدینے پہنچ جائیں۔ ہر راستے پر لوگ تلاش کے لئے دوڑ نکلے تھے۔ بے یار و مددگار بچے، راستہ بھولے ہوئے گھبرائے پھر رہے تھے۔ ذرا کسی کی آہٹ سنتے تو چھپنے کی کوشش کرتے، آخر تلاش کرنے والوں نے دیکھ لیا۔ ایک نے ڈانٹ کر پکارا: رک جاؤ، خبردار! آگے نہ جانا۔ بچے دہل گئے اور سہم کر کھڑے ہو گئے۔ ظالموں نے پکڑ لیا۔ کسی نے طمانچہ مارا۔ کسی نے بال پکڑ کر کھینچا۔ پھر دونوں ہاتھ رسی میں باندھ کر پکڑ کر لے چلے۔ جب بچے رسّی میں بندھے ہوئے بازار سے جا رہے تھے تو التجا کی نظروں سے ایک ایک کی طرف دیکھتے تھے اور رو رہے تھے کہ کوئی چھڑا لے، مگر بازار والے حاکم کے آگے بے بس تھے، عورتوں کو خبر ہوئی تو بے قرار ہو ہو کر روتی تھیں۔

آخر ظالم بچوں کو کھینچتے ہوئے دربار ابن زیاد میں لے گئے۔ وہاں لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور مسلمؑ کے بچے بندھے ہوئے کھڑے تھے۔ حاکم نے غضب آلود نظروں سے بچوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ بتاؤ! تمہیں بھاگنے کیا سزا دوں۔ بچوں نے کہا جو سزا ہمارے باپ کو ملی ہے۔ ایک شخص نے کہا۔ بچے ہیں، اپنے باپ کو تلاش کرتے پھرتے ہوں گے۔

ابن زیاد نے حکم دیا کہ انھیں ایک تاریک حجرے میں قید کر دیا جائے اور کھانے کے لئے خشک روٹیاں اور گرم پانی دیا جائے۔ قید خانے کے منتظم کو حکم دیا کہ یہ دشمن کے بچے ہیں اور ان پر سختی کرنا اور رحم نہ کھانا۔ بچے ایک اندھیرے کمرے میں بند کر دیئے گئے۔ دونوں گھبرا گھبرا کر دیواروں سے سر ٹکراتے تھے رو رو کر ماں باپ کو پکار رہے تھے۔ اندھیرا ایسا تھا کہ بھائی کو بھائی کی صورت دکھائی نہ دیتی تھی مجبوراً چپ ہو کر بیٹھ رہے۔

زندان کا معمول تھا کہ بچے دن بھر فاقے سے رہتے تھے۔ جب شام ہوتی تو زندان بان آتا تھا اور دو خشک روٹیاں اور گرم پانی دے کر دروازہ بند کر کے چلا جاتا تھا۔ بچے زندان بان کی انتظار میں شام کے وقت دروازے پر آ کر بیٹھ جاتے تھے جب زندان بان آتا تھا تو اُسے اُٹھ اُٹھ کر سلام کرتے تھے۔ خشک روٹی اور اتنا کم پانی ملتا تھا کہ ایک دن چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا کہ خشک روٹی پیٹ بھر کر کھائی نہیں جاتی اور پانی اتنا کم ہوتا ہے کہ پیاس پوری نہیں ہوتی۔ بڑے بھائی نے کہا۔ صبر کرو۔ اگر زندگی ہے تو یہ دن بھی گزر جائیں گے اور اگر موت آگئی تو قید سے چھوٹ جائیں گے۔

اسی طرح قید خانہ میں ایک سال گزر گیا۔ ایک دن چھوٹے بھائی نے کہا۔ بڑے بھائی! موت کب آئے گی۔ بڑے بھائی کا دل بھر آیا۔ دونوں رونے لگے پھر مشورہ کیا کہ آج ہم زندان بان کو اپنے حالات سنائیں۔ شاید اسے رحم آجائے۔ جب زندان بان آیا تو دونوں نے اس سے اپنا حال بیان کرنا شروع کیا کہ ہم یتیم ہیں اور بے قصور ہیں ہماری چھوٹی چھوٹی عمریں ہیں اور ہمیں ابھی دنیا کا کچھ پتہ بھی نہیں مگر ہم پر اتنی سختی ہو رہی ہے کہ زندگی سے تنگ آگئے ہیں۔ اگر تم ہم پر رحم کرو تو تمہیں دعائیں دیں گے۔ ان کی خوشامد بھری صورتیں دیکھ کر زندان بان کا دل بھر آیا۔ کہنے لگا۔ تم کون ہو۔ بچوں نے کہا تم اللہ کے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جانتے ہو۔ اس نے کہا کیوں نہیں۔ ان ہی کا تو ہم کلمہ پڑھتے ہیں۔ بچوں نے کہا تم علی مرتضےٰؑ کو بھی جانتے ہو۔ اس نے کہا ہاں! وہ تو میرے آقا ہیں اور میں ان کا غلام ہوں۔ یہ سننا تھا کہ بچوں کے دل بڑھ گئے اور خوش ہو گئے۔

کہنے لگے۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ ہمارے باپ کا نام مسلمؑ بن عقیلؑ ہے۔ یہ سُننا تھا کہ وہ تھرا گیا۔ ہائے! مسلم کے یتیم اور میری قید میں ہوں۔ بچوں سے معافی مانگنے لگا کہ تم محمدؐ کے گھرانے کے بچے ہو۔ مجھ سے تمہیں بہت تکلیف پہنچی ہے۔ اے بچو! خدا کے واسطے مجھے معاف کر دینا۔ لو! میں یہ زندان کا دروازہ کھولے دیتا ہوں جس طرف کو تمہارا دل چاہے چلے جاؤ۔ مجھ پر جو گزرے گی دیکھی جائے گی۔ بچے خوشی خوشی زندان سے

نکلے۔ مشکور کو دعائیں دیتے تھے کہ خدا کرے تیرے بچے تیرے سائے میں پرورش پائیں۔ پھر انھوں نے مشکور سے کہا کہ ہم پر اتنا احسان اور کیجیئے کہ ہم کو امام حسینؑ کے پاس پہنچا دیجئے۔ زمانہ ہمارا دشمن ہے اور ہم راستے سے خوف کھاتے ہیں۔

مشکور کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے۔ چھپانا چاہا مگر مشکور کی آنکھوں سے سیلاب اشک رواں ہو گیا۔ بچے گھبرا کر پوچھنے لگے۔ ہمیں قید میں ایک سال ہو گیا ہے باہر کی ہمیں کچھ خبر نہیں ہے۔ ہائے! تم حسینؑ کا نام سن کر کیوں رونے لگے ہو۔ کیا اب وہ دنیا میں نہیں ہیں۔ مشکور کی چیخیں نکل گئیں۔ بچو! تمہیں کس کس کا حال سناؤں۔ سب کربلا میں شہید ہو چکے ہیں۔ اور تمہاری والدہ جناب زینبؑ کے ساتھ شام کے قید خانہ میں ہیں۔ ہائے! یہ سنتے ہی دونوں بے قرار ہو گئے۔ غش کھا کھا کر گرتے تھے۔ افسوس! قید سے چھوٹے بھی تو کیسے زمانے میں جب اپنے عزیز و اقربا قید خانوں میں ہیں۔

مشکور نے کہا۔ بچو! جلدی سے کسی طرف جانے کی کوشش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی سُن لے۔ بچے زندان سے نکلے، مشکور کو ننھے ننھے ہاتھوں سے سلام کیا اور ایک طرف کو نکل گئے۔ چلتے چلتے کوفے سے باہر پہنچے ادھر ابن زیاد کو معلوم ہو گیا کہ بچے قید خانے سے نکل گئے ہیں۔ مشکور کو بلایا اور اس کے اتنے کوڑے مارے کہ وہ شہید ہو گیا۔ ہر کوڑے پر خدا کا شکر کرتا تھا کہ مجھے دنیا ہی میں سزا مل گئی ہے۔

جناب مسلمؑ کے بچے ڈرتے ڈرتے جنگل میں جا رہے تھے۔ خدا جانے کتنی تکلیفیں اُٹھا کر کوفے سے مسیب شہر تک پہنچے۔ خدا کرے کہ آپ حضرات کربلا جائیں اور ان بچوں کے مزار کی زیارت کریں۔ کربلا سے تقریباً بیس میل دور ان کا مزار ہے۔ کوفے سے بھی شاید بیس میل ہو گا۔ جنگل میں چھوٹے چھوٹے مقبرے دیکھ کر بے ساختہ رونا آتا ہے۔ یہ بچے نہ معلوم کتنے دنوں تک چھپ چھپ کر چلتے ہوئے مسیب شہر کے قریب پہنچے۔ رات ہونے کے قریب تھی۔ بچوں کو منزل کرنی ضروری تھی لیکن سوچتے تھے کہ شہر میں جائیں تو کس کے گھر جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمیں پکڑ لے۔ آخر دونوں شہر سے باہر ہی ایک درخت پر رات گزارنے کے لئے چڑھ گئے وہ درخت ایک تالاب کے کنارے

کھڑا ہوا تھا۔

جب صبح ہوئی تو ایک کنیز پانی بھرنے کے لئے تالاب پر آئی۔ اسے پانی میں درخت کا عکس نظر آیا اور درخت پر دو بچے دکھائی دیے، اس نے مڑ کر درخت کی طرف دیکھا تو وہ نور کے ٹکڑے خوف زدہ اور چھپے ہوئے بیٹھے تھے۔ کنیز نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ بچوں کے کان میں جو آواز آئی، دونوں سہم گئے۔ دیکھا کہ ایک عورت درخت کے نیچے کھڑی ہوئی ہے۔ کہنے لگے۔ تم ہمیں کچھ کہو گی تو نہیں۔۔۔ اس نے نرم لہجے میں کہا میں ایک کنیز ہوں اور میری مالکہ جناب فاطمہؑ کو ماننے والی ہے۔ آیئے اور میرے ساتھ چلیئے۔ وہ آپ کے لئے سہولتیں مہیا کردیں گی۔ بچوں کو سہارا ملا۔ وہ دونوں اس کنیز کے ساتھ اس کی مالکہ کے گھر پہنچے۔

مالکہ بڑی نیک دل اور مومنہ عورت تھی۔ اس نے بچوں کو پیار کیا۔ خاطر مدارات کی۔ انھیں خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے کھانے پکائے۔ رہنے کے لئے اچھا انتظام کیا۔ بچوں کو عرصے کے بعد آرام ملا تو انہیں حجرے میں رات کو خوب گہری نیند آگئی۔ دونوں بچے بڑے آرام سے سو گئے۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مسلمؑ کھڑے ہیں اور اُن سے جناب رسولؐ خدا فرمارہے ہیں۔ مسلمؑ تم اپنے بچوں کو ساتھ نہیں لائے ہو اور انھیں دشمنوں میں چھوڑ آئے ہو۔ جناب مسلمؑ نے کہا میرے بچے میرے پاس جلد آنے والے ہیں۔ دونوں بچے خواب سے بیدار ہو گئے ایک نے دوسرے سے خواب بیان کیا۔ اس نے کہا۔ میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے دونوں اپنے باپ کو یاد کر کے رونے لگے۔

اس عورت کا شوہر حارث تھا۔ ابن زیاد نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص مسلمؑ کے بچوں کو پکڑ کر لائے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ یہ حارث ملعون انعام کے لالچ میں دن بھر ان بچوں کو ڈھونڈتا پھرا تھا۔ یہاں تک کہ تھک کر اس کا گھوڑا مر گیا تھا۔ پھر وہ پیدل ڈھونڈتا رہا تھا اور رات کو گھر واپس آگیا تھا۔ حارث نے جو گھر میں بچوں کے رونے کی آواز سنی تو بیوی سے پوچھا۔ یہ کون ہیں۔ بیوی نے چھپانے کی کوشش کی اور اس کا خیال ہٹانے کی

باتیں کیں مگر وہ نہ مانا اور خود اُٹھ کر حجرے میں چلا گیا۔ وہاں جا کر بچوں سے پوچھا تم کون ہو اور کیوں رو رہے ہو۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ بھی مومنہ کی طرح ہمارے ساتھ ہمدردی کرے گا لہٰذا انھوں نے سب حال بیان کر دیا۔

حارث کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہی مسلمؑ کے بچے ہیں تو غیض میں بھر گیا۔ کہنے لگا میں تو سارا دن تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر گیا اور تم میرے ہی گھر میں مزے سے چھپے بیٹھے ہو۔ اس نے بڑی بے دردی سے دونوں بچوں کو بالوں سے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا حجرے سے باہر لایا۔ پیچھے پیچھے بیوی دوڑی، اس نے بڑی ہی خوشامدیں کیں کہ یہ یتیم ہیں، اب پر ظلم نہ کرے یہ ہمارے مہمان ہیں مگر وہ نہ مانا اور دونوں کو رسّی سے باندھ کر ایک ستون سے باندھ دیا اور خود پھر اپنے حجرے میں جا کر لیٹ رہا۔ وہ ملعون رات بھر مزے سے سوتا رہا اور یہ بچے رات بھر بندھے ہوئے روتے رہے اور ماں باپ کو یاد کرتے رہے۔

صبح ہوئی تو دونوں کے ہاتھ رسّی میں باندھے اور قتل کرنے کے لئے دریا کی طرف کھینچتا ہوا لے چلا۔ بیوی روتی ہوئی اور خوشامدیں کرتی ہوئی پیچھے پیچھے جا رہی تھی اور رسولؐ و جناب فاطمہؑ کے واسطے دے رہی تھی کہ حارث نے غصہ میں آ کر بیوی کو قتل کر دیا۔

آپ اس سے حارث کی جنونی حالت اور سخت دلی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس پر کس طرح خون سوار تھا اور وہ کتنا ظالم تھا کہ بچوں کے لئے اس کی بیوی کی خوشامد اسے اتنی بُری لگی کہ اس نے بیوی کو قتل کر ڈالا۔ ذرا تصور کیجئے کہ جب بچے حارث کی شکل دیکھتے ہوں گے تو ان پر کیا گزر رہی ہو گی۔ حارث انھیں کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ دریا تک پہنچے۔

حارث نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ دونوں کو قتل کر دے۔ مگر وہ پیچھے ہٹ گیا اور انکار کیا کہ میں نبی زادوں، مسلمؑ کے جگر پاروں کو قتل نہیں کروں گا۔ حارث بیٹے پر غصہ ہوا اور طیش میں اُسے قتل کر دیا۔ بچے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور سہم رہے تھے پھر حارث نے غلام کو حکم دیا کہ لے یہ تلوار اور ان دونوں کو قتل کر۔ غلام حارث کا غصہ دیکھ چکا تھا وہ تلوار

پھینک کر فوراً دریا میں کود گیا اور جلدی جلدی تیرتا ہوا پار نکل گیا۔

اب حارث نے خود تلوار ہاتھ میں لی اور غضب آلود نظروں سے بچوں کی طرف لپکا۔ بچے خوشامد سے کہنے لگے۔ ہمیں قتل نہ کرو۔ اگر انعام کی تمنا ہے تو ہمیں غلام بنا کر فروخت کر لو۔ مگر اس ظالم نے کہا کہ نہیں میں تو تمہیں قتل ہی کروں گا۔ بچوں نے پھر خوشامد کی کہ ہمیں زندہ ہی قید کر کے حاکم کے سامنے لے چلو۔ کہنے لگا نہیں میں زندہ نہیں لے جاؤں گا بلکہ تمہارے سر کاٹ کر حاکم کے سامنے پیش کروں گا اور انعام پاؤں گا۔ جب بچے جان سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے کہا اچھا ہمیں اتنی مہلت دے دو کہ ہم دو رکعت نماز ہی پڑھ لیں۔ اس نے نماز کی اجازت دے دی۔ دونوں بچوں نے دو دو رکعت نماز پڑھی۔ سلام پھیرا ہی تھا کہ حارث بڑھا اور بڑے بھائی کو قتل کرنے کے لئے کھینچا۔ چھوٹا بھائی تڑپ گیا اور دوڑ کر بڑے بھائی سے لپٹ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کی حارث! پہلے مجھے قتل کرنا۔ بڑے بھائی نے کہا نہیں حارث! پہلے مجھے قتل کرنا۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو اپنے سامنے قتل ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ حارث نے پہلے بڑے بھائی کو کھینچ کر چھوٹے بھائی سے الگ کیا۔ قتل کے لئے گردن پر تلوار لگائی۔ ہائے! سر الگ کر کے رکھ لیا اور لاش کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ چھوٹا بھائی سہما ہوا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ اب حارث ملعون تلوار بکف چھوٹے بھائی کی طرف قتل کرنے کے لئے لپکا۔ اس کا بھی ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور گردن پر تلوار ماری۔ سر تن سے جدا ہو گیا۔ حارث نے چھوٹے بھائی کا سر بھی رکھ لیا اور لاش دریا میں پھینک دی۔ پھینکی تھی کہ دونوں بھائیوں کی لاشیں بغلگیر ہو گئیں اور پھر دریا میں ڈوب گئیں۔

حارث دونوں بچوں کے خون آلود پھول سے سر لے کر ابن زیاد کے دربار میں پہنچا اور انعام کے لالچ میں خوب خوش ہو کر اپنے ظلم کا قصہ سنایا۔ ابن زیاد جو قاتلوں کو انعام دیا کرتا تھا اور کسی بچے یا عورت پر رحم نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے سنا کہ قتل کے وقت بچے کو خوشامد سے کہہ رہے تھے کہ ہمیں زندہ گرفتار کر کے حاکم کے دربار میں لے چلو تو اس کا دل بھر آیا۔ غصے ہو کر کہنے لگا۔ حارث! تو بڑا ظالم ہے تجھے ان پر رحم نہ آیا اور انھیں

زندہ میرے دربار میں نہ لایا۔ حکم دیا کہ حارث کو بھی قتل کر دیا جائے اور وہ اسی وقت قتل کر دیا گیا۔

اَلَا لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ؕ
وَسَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ ؕ

☆☆☆

ساتویں مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہ
قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ (صلوات)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ تم سے تبلیغِ رسالت کا کوئی معاوضہ سوائے اپنے اقرباء سے محبت کے اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔

کلام کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی اہم بات کرنی ہوتی ہے تو اس کا پہلے اعلان کر دیا جاتا ہے تاکہ سننے والے متوجہ ہو جائیں اور اس کا انتظار کرنے لگیں۔ اگر بات کو یوں ہی بغیر اہتمام کے کہہ دیا جائے تو اس کی قدر و منزلت کا پتہ نہ چلے گا اور لوگ اسے رواداری میں سُن کر بھلا دیں گے۔

کسی مقرر ہی کو دیکھ لیجئے۔ جب وہ کوئی اہم بات بیان کرنا چاہتا ہے تو پہلے صلواتوں پر صلواتیں پڑھواتا ہے اور اگر سیاسی لیڈر ہو تو نعروں پر نعرے لگواتا ہے پھر کہیں جا کر وہ بات مجمع میں پیش کرتا ہے۔

خداوند عالم نے بھی جب حضرت آدمؑ کا پتلا بنانا چاہا تو اس وقت فرشتے خلق ہو چکے تھے۔ وہ بھلا ایک مٹی کے بنے ہوئے پتلے کو کیسے نظر میں لا سکتے تھے ادھر قدرت کا منشا یہ تھا کہ یہی مٹی کا بنا ہوا پتلا فرشتوں سے افضل قرار پائے۔ بڑا سخت مقابلہ تھا۔ اگر خدا حضرت آدمؑ کو خلق کر کے فرشتوں سے یہ کہتا کہ آدمؑ فرشتوں سے افضل ہیں تو مان تو سب

لیتے لیکن سب کے ذہنوں میں یہ ہوتا کہ چونکہ خدا نے فرمایا ہے اس لئے ہم آدم کو فرشتوں سے افضل مان لیتے ہیں ورنہ آدم مٹی کا ایک پُتلا ہیں۔ اور فرشتے نورانی مخلوق ہیں۔ لہٰذا خدا نے حضرت آدم کو اس طرح پیش کیا کہ فرشتوں کو ان کی عظمت کا علم ہو جائے۔ پہلے ارشاد فرمایا وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا تھا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے جب یہ سنا کہ یہ مٹی کا پُتلا زمین میں خلیفہ بنے گا تو اُن کی نظر میں اس کی اہمیت بڑھ گئی۔

جب فرشتوں میں اس اعلان کا چرچا ہو چکا تو خدا نے عظمت بڑھانے کے لئے فرمایا: فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ اے فرشتو! جس وقت کہ میں آدم کو ہر طرح سے دُرست کرلوں اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دوں تو سب کے سب ان کے سامنے سجدے میں گر جانا۔ اب فرشتوں کو معلوم ہوا کہ اس میں تو روح بھی پھونکی جائے گی۔ لہٰذا انھیں اس پُتلے کی اور عظمت کا علم ہوا۔ پھر جب فرشتوں نے یہ سُنا کہ ان کو سجدہ بھی کرنا ہوگا تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ پُتلا ہم سے افضل ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قدرت نے کس طرح رفتہ رفتہ فرشتوں کے ذہن نشین کیا کہ یہ خاکی پُتلا تم سے افضل ہے۔ اگر خدا پہلے سے اعلان نہ کرتا اور اہتمام نہ کرتا اور آدم کو بنا کر ان میں روح پھونک پھانک کر کہتا کہ اے فرشتو! یہ خلیفہ ہے اور تم سے افضل ہے اور تم ان کے سامنے سجدے میں گر جاؤ تو بتایئے حضرت آدم کو وہ عظمت حاصل ہو سکتی تھی جو اب حاصل ہوئی ہے۔

دنیا کے نظام کو بھی دیکھ لیجئے۔ جب کوئی بادشاہ آتا ہے تو کئی دن پہلے اس کے آنے کا اخباروں میں اعلان ہو جاتا ہے۔ اس کے راستے کو سجانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سڑکوں پر خوبصورت گیٹ لگتے ہیں جگہ جگہ جھنڈیاں لٹکائی جاتی ہیں۔ جس دن وہ آتا ہے تو گھنٹوں پہلے وہاں پولیس آتی ہے۔ سڑکوں کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سپاہی نظر آتے

ہیں۔ وردیاں بھی صاف اور سپاہی بھی غیر معمولی چاق و چوبند ہوتے ہیں۔ جب بادشاہ کے آنے کا وقت قریب ہوتا ہے تو بڑی تیزی سے نظام کو درست کیا جاتا ہے۔ آمدورفت بند کر دی جاتی ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں۔ بادشاہ کے گزرنے سے پہلے کتنے ہی افسر موٹر سائیکلوں، جیپوں اور کاروں میں گزرتے ہیں۔ آگے آگے باڈی گارڈ ہوتے ہیں اور جب بادشاہ آتا ہے تو اس کے پیچھے کتنی ہی کاروں کا جھرمٹ ہوتا ہے اور ہر طرف تالیوں کی آواز آتی ہے۔۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی اہم شخصیت آرہی ہے۔

قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ میں خداوند عالم نے تمام تبلیغ کا اجر طلب کیا ہے۔ اُجرت ایک ایسی اہم چیز ہے کہ اس کے ادا کئے بغیر تمام اعمال بیکار ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے لئے پہلے سے اعلان ہونا چاہیئے تاکہ لوگ متوجہ ہو جائیں اور انتظار کرنے لگیں۔

ارشاد ہوتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے۔ رحمٰن ان کے لئے عنقریب محبت کا حکم دے گا۔ اعلان بتا رہا ہے کہ خدا عنقریب ایسے لوگوں کی محبت کا حکم دینے والا ہے جو مومن ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ لوگ متوجہ ہوں گے اور جستجو کریں گے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ جن کی محبت کا خدا حکم دے گا۔ اس اعلان سے ایک طرف تو ان لوگوں کی عظمت بڑھ جاتی ہے جن کی محبت کا حکم دیا جائے گا اور دوسری طرف خدا کے آنے والے حکم کے لئے لوگ منتظر ہو جاتے ہیں کہ جیسے ہی خدا کا حکم آئے تو کان کھول کر سنیں کہ کن کی محبت کا حکم ہے۔

اب وضاحت کے ساتھ حکم آتا ہے۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ہ جس طرح قدرت نے حضرت آدمؑ کے پُتلے کی فرشتوں کی نظر میں رفتہ رفتہ عظمت بڑھائی تھی کہ یہ تم سے افضل ہیں۔ اسی طرح رفتہ رفتہ لوگوں کو اقرباء کے مرتبے سے آگاہ کیا کہ یہ تم جیسے اور تمہارے برابر کے بندے نہیں ہیں۔ پہلے تو انہیں یہ امتیاز دیا کہ وہ مومن ہیں اور نیکیوں پر عمل کرنے والے ہیں۔ پھر کہا ان کی محبت کا تمہیں

حکم دوں گا۔ اس سے ہر سمجھدار یہ سمجھ گیا کہ ہم سے افضل ہوں گے۔ جب یہ بات دماغ سے نکل گئی کہ وہ ہم جیسے اور ہماری برابر کے نہیں ہیں۔ تب سیدھا سیدھا حکم آیا کہ محبت حکم کے ذریعے مقصود نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ تم محبت کرکے اللہ میاں پر احسان کررہے ہو یا محبت نہ کرکے گنہگار ہورہے ہو بلکہ یہ تبلیغ رسالت کا معاوضہ ہے۔ اگر معاوضہ ادا نہیں کروگے تو کیا کرایا سب بیکار ہوجائے گا۔ اور کوئی عمل کام نہیں آسکے گا۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور جن لوگوں نے نیکیوں پر عمل کیا۔ اللہ ان کے لئے عنقریب محبت کا حکم دینے والا ہے۔ صالحت جمع کا صیغہ ہے اور صالح ایک نیکی کو کہتے ہیں یعنی وہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے تمام نیکیوں پر عمل کیا ہے اگر اس سے مراد عام لوگ ہوں تو خاکی بندے تمام نیکیوں کی تعداد نہیں بتا سکتے لہٰذا ان سب پر عمل کیسے کرسکتے ہیں۔ تمام نیکیوں پر عمل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ ان کی تعداد جانتا ہو اور جس تعداد ہی کا پتہ نہ ہو اس کے لئے یہ کیسے مان لیا جائے کہ اس نے تمام نیکیوں پر عمل کرلیا ہے۔

تمام نیکیوں کی تعداد معلوم کرنی ہے تو قرآن سے پوچھئے۔ ارشاد ملے گا: وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ کوئی خشک اور تر ایسا نہیں ہے کہ جو قرآن میں موجود نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ تمام کی تمام نیکیاں بھی قرآن میں موجود ہیں اور پھر یہی مُبین کا لفظ دوبارہ آتا ہے۔ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ۔ ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں محصور کردیا ہے۔ وہاں قرآن میں ہر خشک وتر ہے اور یہاں امام مبین ہر چیز ہے۔ نیکیوں کی تعداد بتانا کیا یہاں تو یہ شان ہے کہ کوئی نیکی نکل کر باہر جا ہی نہیں سکتی ہے۔ ہر نیکی امام مبین میں محصور ہے اور امام مبین اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

میں آپ کو بتاؤں، یہ امام مبین کون ہیں۔ کوفے میں منبر رسولؐ پر ایک شخص اعلان کررہا ہے۔ سَلُوْنِیْ۔۔۔ اے لوگو! مجھ سے پوچھ لو قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ۔۔ اس سے پہلے کہ تم مجھے کھو بیٹھو۔ امام مبین ایسے ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن میں ہر چیز کا علم محصور ہوگیا ہے۔

اسلام کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک شخص کے یہاں دو بیویاں تھیں۔ دونوں کے

ایک ہی شب میں بچے پیدا ہوئے ایک کے لڑکا ہوا اور دوسری کے لڑکی ہوئی باپ کا وارث چونکہ لڑکا ہوتا ہے۔ اس لئے لڑکی والی نے چپکے سے لڑکا بدل لیا۔ صبح ہوئی تو دونوں میں تنازعہ ہونے لگا۔ گھر کے اندر کی بات تھی، اس وقت کوئی گواہی دینے والا بھی نہیں تھا، جھگڑا بڑھتے بڑھتے قاضی شریح تک پہنچا۔ دونوں عورتیں اپنا لڑکا بتاتی تھیں۔ قاضی شریح نے بہت کچھ سوال کئے مگر اسے نہ کوئی گواہ ملتا تھا اور نہ کوئی ایسا قرینہ جس سے معاملہ طے کرنے میں مدد مل سکے۔ اس کی عقل کام نہ کرتی تھی اور وہ حیران و پریشان تھا۔

جب قاضی شریح نے دیکھا کہ وہ یہ معاملہ طے کرنے میں عاجز ہے تو وہ ان دونوں عورتوں کو لے کر خلیفۂ وقت کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ قاضی شریح نے مقدمہ بیان کیا اور اپنی عاجزی کا اظہار کیا۔ خلیفہ نے بھی عورتوں سے متعدد سوالات کر کے کوئی قرینہ معلوم کرنا چاہا۔ مگر عورتیں اپنے دعوے میں بہت سخت تھیں اور کوئی نہ مانتی تھی کہ لڑکی اس کی ہے۔ گواہ نہ ہونے کی وجہ سے معاملے کا طے ہونا بہت مشکل تھا۔

آخر دوسرے مسلمانوں سے مشورہ لیا گیا کہ اگر کسی کے سامنے رسولؐ خدا کے زمانہ میں ایسا واقعہ پیش آیا ہو اور انھوں نے جو فیصلہ کیا ہو وہ بیان کیا جائے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ آپ سے زیادہ رسول کی صحبت کا شرف کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ہمارے سامنے تو کوئی ایسا معاملہ پیش نہیں ہوا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اس معاملے کو جو شخص طے کر سکتا ہے، اسے میں جانتا ہوں، اس کے سوا اس معاملے کو کوئی طے نہیں کر سکتا۔

حضرت عمر تمام لوگوں کو لے کر حضرت علیؑ کے دروازے پر آئے۔ معلوم ہوا، ابوالحسنؑ شمعون یہودی کے باغ کو پانی دینے گئے ہیں۔ سب مجمع یہودی کے باغ میں پہنچا۔ دیکھا کہ علیؑ پودوں کو پانی دے رہے ہیں۔ تاجدار سَلُونِی سے مسلمانوں نے یہ کام لیا کہ ان کو اپنی ضرورت کے لئے یہودیوں کے باغ میں پانی دینا پڑا اگر ایسا شخص انگریزوں میں ہوتا تو سائنس کے محکمے کا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ یعنی افسر اعلیٰ ہوتا اور اس کے لئے ہر قسم کی سہولت اور آرام فراوانی کے ساتھ مہیا ہوتی۔ لیکن مسلمانوں نے امام

مبین کی قدر رہی نہ کی اور ہیرے کو پتھر کی جگہ استعمال کیا۔ اب اگر مسلمان پستی میں ہیں تو یہ خود ان کا اپنا قصور ہے۔

غرض علیؑ آئے اور وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ سب مجمع ارد گرد ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ بات شروع ہوئی۔ علیؑ نے ساری تفصیل سنی۔ پھر ایک تنکا زمین سے ہاتھ میں اٹھا کر کہا۔ اے عمر! اس مسئلے کا حل علیؑ کے لئے اس تنکے کے اُٹھا لینے سے بھی زیادہ آسان ہے اور فرمایا۔ دونوں عورتوں کا دودھ ایک پیمانے میں بھر کر وزن کرایا جائے۔ جس کا دودھ بھاری نکلے۔ اس عورت کے لڑکا پیدا ہوا ہے اور جس کا دودھ ہلکا ہو وہ لڑکی کی ماں ہے۔ یہ سُننا تھا کہ سب مجمع خوش ہو گیا۔ لڑکے والی کو لڑکا دے دیا گیا اور لڑکی والی کو لڑکی سپرد کی گئی۔

حضرت عمر نے دریافت کیا یا علیؑ! اس کا تذکرہ قرآن میں کہاں ہے تو یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ۔ لڑکے کا حصّہ لڑکی کے دو حصّوں کے برابر ہے۔ جس نے فطرت کا قانون بنایا ہے۔ اُسی نے تو شریعت کا قانون بنا کر بھیجا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسولؐ سے تو کہے کہ لڑکی کا لڑکے سے نصف حصہ ہے اور خود لڑکی کو لڑکے کے برابر حصہ دے دے۔ حضرت عمر نے تعجب سے کہا آپ ایسے ایسے مسئلے بھی قرآن سے حل کر دیتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا اے عمر! آپ کو اس مسئلے پر تعجب ہو رہا ہے۔ حالانکہ اگر میرے گھوڑے کا کوڑا بھی کھو یا جائے تو میں وہ قرآن سے تلاش کر لوں گا۔ كُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِيْنٍ ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں محصور کر دیا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں قرآن نے امام مبین کہا ہے۔ (صلوات)

خداوند عالم نے دُنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں۔ ان میں سلسلہ اس طرح چلتا رہا کہ ایک نبی آیا۔ اس نے ایک شریعت نافذ کی۔ کچھ عرصے تک یہ شریعت چلتی رہی اور تبلیغ ہوتی رہی۔ پھر دوسرا نبی آیا اور اُس نے پچھلی شریعت منسوخ کر کے اپنی شریعت کے احکام نافذ کر دیئے۔ پچھلی شریعت ختم ہو گئی۔ اب شریعت پر عمل ہونے لگا۔ کچھ عرصہ چلنے کے بعد یہ شریعت بھی منسوخ ہو گئی اور نیا نبی آیا اور اُس نے اپنی شریعت

نافذ کر دی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جو شریعتیں لائے یعنی کتاب لائے اور اپنے سے پہلے نبی کی شریعت کو منسوخ کر دیا اور دوسرے وہ جو خود تو کوئی شریعت نہیں لائے گو اپنے سے پہلے والے نبی کی شریعت کی نگرانی اور تبلیغ کرتے رہے۔ جو پیغمبر کتاب لائے وہ رسولؐ کہلاتے ہیں۔ اور جو اپنے سے پہلے نبی کی شریعت کی تبلیغ پر مامور رہے، انھیں نبی کہا جاتا ہے۔ رسولوں کی مثال جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ ان پر صحف ابراہیم نازل ہوا۔ جناب موسیٰؑ کہ ان پر توریت نازل ہوئی اور جناب عیسیٰؑ کہ ان پر انجیل نازل ہوئی اور نبی وہ ہیں جو خود شریعت نہیں لائے اور نہ پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر سکے بلکہ کسی رسول کی شریعت کے نگران رہے، وہ سب پیغمبر ہیں۔ نبی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ رسول ہو لیکن رسول کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نبی ہو۔ پہلے نبی ہوگا تب ہی تو رسول ہو سکے گا۔

دوسری خصوصیت یہ رہی ہے کہ جو نبی بھی دنیا سے اُٹھا ہے وہ اپنے بعد آنے والے نبی کی خبر کے ساتھ ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کی خبر بھی دیتا گیا۔ جب حضرت محمد مصطفےٰ تشریف لائے تو آپ ختم المرسلین تھے لہٰذا یہ سلسلہ تو ختم ہوا کہ وہ اپنے بعد آنے والے نبی کی خبر دیں لیکن یہ ضرورت پیش آجاتی ہے کہ پھر ان کی شریعت کی نگرانی کون کرے۔ جب اللہ نے ان چھوٹی چھوٹی شریعتوں کی نگرانی کرائی جو کہ کچھ عرصہ بعد منسوخ ہونے والی تھیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایسی شریعت کی نگرانی نہیں کرائے گا جو قیامت تک منسوخ ہونے والی نہیں ہے۔

لہٰذا ضروری ہوا کہ رسول کی شریعت کی نگرانی کرنے والے ایسے ہوں جو نہ نبی ہوں اور نہ رسول ہوں۔ تو کیا رسولؐ اللہ عام آدمیوں میں سے اپنی شریعت کی نگرانی کے لئے کسی کو مقرر کر دیں۔ مگر ایسا بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ دوسری شریعتوں کی نگرانی کرنے والے نبی آتے رہے ہیں تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب سے بڑی شریعت کے نگراں پہلے نبیوں سے کم درجے کے یعنی عام لوگ ہوں۔

قدرت نے خود اس پیچیدہ مسئلے کا حل پیش کیا رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: کُنْتُ نَبِیًّا وَآدَمَ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْن ۔ میں اُس وقت بھی نبی تھا جب حضرت آدمؑ پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ پھر فرمایا: اَنَا وَعَلِیٌّ " مِنْ نُوْرٍ وَاحِدٍ ۔ میں اور علیؑ ایک نور سے ہیں۔ محمدؐ کا وہ نور جو حضرت آدمؑ سے پہلے نبوت کے عہدے پر فائز تھا۔ اب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بتایئے! یہ دوسرا حصہ نبیوں سے افضل ہوگا یا نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ محمدؐ کا نور بھی ہو اور نبیوں سے درجے میں کم بھی ہو۔ اگر علیؑ کو محمدؐ کے نور کا ٹکڑا مانا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ علیؑ تمام نبیوں سے افضل ہیں۔ (صلوٰۃ)

اور کون کہتا ہے کہ رسولؐ اپنے بعد شریعت کی نگرانی کرنے والے کو بتا کر نہیں گئے تھے۔ جب چھوٹی چھوٹی شریعتوں کے رسول اپنے بعد آنے والے نگران کی خبر دے کر جائیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنے بعد آنے والے کی خبر نہیں دی ہو؟

قرآن کہتا ہے۔ عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاءِ الْعَظِیْم ۔ اے رسولؐ لوگ آپ سے نباء عظیم کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ نبا کے معنی خبر کے ہیں۔ نبی خبر دینے والا اور نبا جس کی خبر دی گئی ہو۔ چونکہ ہر نبی اپنے بعد کے آنے والے کی خبر دیتا تھا اس لئے لوگوں نے رسولؐ اللہ سے بھی پوچھ لیا کہ وہ کونسی عظیم ہستی ہے جس کی آپ اپنے بعد شریعت کی نگرانی کے لئے آنے کی خبر دیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا: وَاَنَا النَّبَاءِ الْعَظِیْم ۔ اور وہ نباء عظیم میں ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسولؐ اور اُن کے نائب کے درمیان میں کچھ خالی فاصلے کی گنجائش ہے۔ یعنی رسولؐ اللہ کی وفات ہو جائے اور اُن کا نائب کچھ عرصے کے بعد نگرانی کے لئے مقرر ہو۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہاں! رسولؐ اللہ کے بعد کچھ عرصہ خالی چھوڑا جاسکتا ہے تو یہ امر لازم آئے گا کہ دنیا ہادی سے خالی رہ جائے گی اور دُنیا کا ہادی سے خالی ہونا محال ہے۔ ایسا نقص رسولؐ اللہ کی رسالت میں نہیں آسکتا۔ معلوم ہوا رسول اور ان کے نائب کے درمیان میں فاصلہ نہیں ہوسکتا۔ ان کا نائب بلافصل ہوگا۔ (صلوات)

رسالت جناب رسولِؐ خدا پر ختم ہوگئی۔ اب ان کی شریعت کی نگرانی کرنے

والوں کا سلسلہ شروع ہوگا اور اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک رسولؐ کی شریعت قائم ہے۔ یہ نگران بھی اسی درجے کے ہوں گے جس درجہ کی رسالت ہے۔ اگر رسولؐ اللہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں سے افضل ہیں تو ان کے نائب بھی ہر نبی کے نائب سے افضل ہوں گے۔ اگر رسولؐ کی نبوت سب انبیاء کی نبوت سے افضل ہے اور ان کی شریعت سب انبیاء کی شریعت سے افضل ہے تو ان کے نگران بھی سب نگرانی کرنے والوں سے افضل ہوں گے۔ رسولؐ اللہ کی شریعت آنے پر سب انبیاء کی شریعت منسوخ ہوگئی تو اُن کے نگران آنے پر بھی سب نگرانوں کی نگرانی منسوخ ہو جائے گی۔ اگر رسولؐ اللہ کی شریعت منسوخ ہونے والی نہیں ہے تو ان کے نگرانوں کو بھی ہٹانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اگر رسولؐ سے کوئی بیعت لینے والا نہیں ہوسکتا تو ان کے نگرانوں سے بھی کوئی بیعت۔۔ نہیں لے سکتا۔ (صلواۃ)

رسولؐ اللہ پر رسالت ختم ہو چکی ہے اب نگرانوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا: قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ ۔۔ میرے اقرباء سے محبت کرو۔ یعنی میرے بعد جو کچھ ہے وہ میرے اقرباء ہیں اگر تم اُن سے محبت رکھو گے، ان کا حق ادا کرو گے، ان سے ہدایت حاصل کرو گے تو میری تبلیغ تمہارے کام آتی رہے گی۔ اپنے اقرباء میں سے ایک ایک کو پہچنواتے گئے۔ کبھی فرمایا: یَاعَلِیُّ اَمَا تَرْضٰی اَنْتَ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ یاعلیؑ! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی منزلت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

جناب ہارون موسیٰؑ کے بھائی تھے اور نبوت کے معاملے میں مدد کے لئے دستِ راست کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسولؐ اللہ نے بھی علیؑ کی منزلت سے لوگوں کو آگاہ کیا کہ علیؑ میرا بھائی اور دستِ راست ہے۔

کبھی فرمایا: اَلْفَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّیْ. فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ فاطمہؑ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اگر جگر کہتے تو پھر دل کا ٹکڑا نہیں ہوسکتی تھیں، آنکھوں کا نور یا دل کا چین کہنا درست نہ ہوتا۔ بس صرف ایک جگر کا ٹکڑا ہو کر رہ جاتیں۔ رسولؐ اللہ کے الفاظ

ہیں کہ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہیں یعنی جو کچھ میں ہوں اسی کا جزو فاطمہؑ ہیں ۔ اگر میں نور ہوں تو فاطمہؑ بھی نور ہیں ۔ اگر میں رسول ہوں تو فاطمہؑ بھی رسالت کا ٹکڑا ہیں ۔ اگر میں گناہ نہیں کرسکتا تو فاطمہؑ بھی معصوم ہیں ۔ اگر میں ختم المرسلین ہوں تو فاطمہؑ بھی سیدۃ النساء العالمین ہیں ۔ (صلوٰۃ)

اگر کل میں سے جز علیحدہ کرلیا جائے تو کل میں نقص آجاتا ہے ۔ لہٰذا اگر فاطمہؑ کو رسالت سے الگ سمجھو گے تو رسالت میں کمی آجائے گی ۔ رسولؐ اللہ نے تمام دنیا کے لئے تبلیغ کی ہے ۔ عورتوں کو یہ شکایت ہوسکتی تھی کہ ہم پر جن احکام کی پابندی ضروری قرار دی گئی ہے ۔ اگر رسولؐ عورت ہوتے تو ہم دیکھتے کہ وہ ہمارے جیسے حالات میں کس طرح عمل کرسکتے تھے ۔ انھوں نے تو بس کہہ دیا ہے اور عمل ہمیں کرنا پڑتا ہے ۔ لہٰذا رسولؐ اللہ نے اپنا ایک جزو عورت کی شکل میں پیش کیا اور جناب فاطمہؑ نے عورتوں کے تمام مسائل پر عمل کرکے دکھا دیا کہ تم پر عائد کردہ احکام ایسے نہیں ہیں جن پر عمل کرنا ممکن نہ ہو بلکہ یہ ایسے احکام ہیں کہ ان پر عمل کرکے سیدۃ النساء العالمین بنا جاسکتا ہے ۔

اگر آپ جناب فاطمہؑ کے فضائل سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو حدیث کساء پڑھئے ۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خدا سے پوچھا کہ اس کملی کے نیچے کون ہیں تو ارشاد ہوا : **هُمْ اَهْلُ بَيْتِ النُّبُوَّةِ وَمَعْدَنُ الرِّسَالَةِ هُمْ فَاطِمَةُ وَاَبُوْهَا وَبَعْلُهَا وَبَنُوْهَا۔** وہ نبوت کے گھر والے ہیں ۔ (یہ نہیں کہا کہ وہ نبی کے گھر والے) اور رسالت کی کان ہیں ۔ وہ فاطمہؑ ہیں اور ان کے والد بزرگوار، ان کے شوہر نامدار اور ان کے بچے ذی وقار ہیں ۔

ذرا قدرت کا معرفت کرانے کا طریقہ ملاحظہ فرمایئے ۔ قدرت نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ رسولؐ ہیں ۔ ان کی بیٹی فاطمہؑ ہیں ۔ علیؑ ہیں اور حسنؑ و حسینؑ ہیں ۔ ان کی معرفت کرانے کا ذریعہ رسولؐ کو نہیں بنایا بلکہ جناب فاطمہؑ کے ذریعہ تعارف کرایا گیا ہے کہ اگر فاطمہؑ کو جانتے ہو تو ان کے باپ کو بھی پہچان سکتے ہو، ان کے شوہر اور ان کی اولاد سے بھی واقف ہوسکتے ہو ۔ اگر تم نے فاطمہؑ ہی کو نہیں پہچانا تو پھر کسی سے بھی واقف نہیں

ہو سکتے۔ (صلوات)

امام حسینؑ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ لَحْمُکَ لَحْمِیْ دَمُکَ دَمِیْ رسولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ اے حسینؑ! تیرا گوشت میرا گوشت ہے، تیرا خون میرا خون ہے۔ یعنی تیرے جسم کا وہی مرتبہ ہے جو میرے جسم کی عظمت ہے۔ اگر میرے جسم کی حفاظت اُمت پر فرض ہے تو تیرے جسم کی نگرانی بھی اُمت پر واجب ہوگی۔ اگر اُمت پر فرض ہے کہ میری سلامتی کی خواہاں ہو تو یہ ذمہ داری بھی اُمت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر آزار سے تجھے بچائے۔ اگر میرا خون بہانا اُمت پر روا نہیں ہے تو تیرا خون بہا کر بھی وہ میرے ہی قاتل قرار پائیں گے۔

اس سے زیادہ رسولؐ اللہ اپنے اقربا کو اور کیا پہچنوا سکتے تھے۔ لیکن اُمت نے رسولؐ کے کہنے پر عمل نہ کیا بلکہ جن کے ساتھ محبت کو کہا تھا ان کے ساتھ دشمنی کرنے لگے۔ ورنہ کہاں مدینہ اور کہاں شام، حسینؑ رسول کے شہر مدینے میں ہوں اور ملک شام سے یزید کا حکم آئے کہ حسین کا سر بھیجدو۔ اگر محبت کرنے والے ہوتے تو اتنی دُور بیٹھے ہوئے یزید کی ہمت کیسے ہوسکتی تھی کہ سر طلب کرسکے اور اُمت کو دیکھئے کہ عمل کرنے کو تیار ہے۔

مدینے سے روانہ ہوکر کے پہنچے۔ حج کا زمانہ آیا۔ دُور دُور سے مسلمان حج کے لئے آرہے تھے۔ امام حسینؑ کو معلوم ہوا کہ یزید نے کچھ آدمی قتل کے لئے بھیجے ہیں جو حاجیوں کے روپ میں کے پہنچ چکے ہیں۔ آپ کے سے عین حج کے زمانے میں روانہ ہوگئے۔ گوشے گوشے کا مسلمان حج میں آیا ہوا تھا۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ حسینؑ حج کو چھوڑ کر کیوں جارہے ہیں۔ حاجی دیکھ رہے ہیں اور کسی کو خیال نہیں آتا کہ امامؑ کو بھی حج کے لئے روک لیا جائے کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں ہمارے ہوتے ہوئے آپ بے فکر رہیئے۔ کوئی آپ کو آزار نہیں پہنچا سکتا۔

مسلمانوں کا حج میں ہجوم بتاتا ہے کہ تبلیغ پہنچی ہے، قرآن پہنچا ہے۔ حج کے احکام کو جانتے ہیں۔ مگر معاوضہ کا غضب کرنا تھا۔ اس لئے کوئی حسینؑ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ آپ مکے سے روانہ ہوکر کربلا پہنچے۔ دور دور سے فوجیں آنا شروع ہوگئیں۔ دس

تاریخ تک وہ کونسا مقام تھا جہاں کی فوجیں کربلا میں نہ پہنچی ہوں۔ کوفہ، شام، عراق، حجاز بلکہ عرب کے علاوہ دیگر ممالک کے لوگ بھی موجود تھے۔ مسلمان ہونے کے مدعی تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور امام حسینؑ کے ایسے درپے تھے گویا اسلام میں ان کی محبت کا نہیں بلکہ۔۔۔ معاذ اللہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

اگر امام حسینؑ، یزیدؒ کے دربار میں شہید کئے جاتے تو کہا جا سکتا تھا کہ یزیدؒ گمراہ تھا۔ اس نے بڑا ظلم کیا۔ یہاں کربلا میں یزیدؒ کا حکم بھی ہے اور ساری دنیا کے مسلمان بھی۔ بات بالکل عیاں اور ظاہر ہے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ اکیلا یزیدؒ امام حسینؑ کا دشمن تھا۔

امام حسینؑ کے قتل کا حکم ایک دم نہیں پہنچا ہے کہ مسلمانوں کو سوچنے کا موقع نہ ملا ہو۔ بلکہ ترائی سے خیمے اُٹھوائے گئے۔ پھر ساتویں سے پانی بند کیا گیا۔ اور نویں تاریخ کی شام کو حملے کا حکم دیا گیا۔ اس کے باوجود بھی امام حسینؑ نے ایک رات کی مہلت لے کر مسلمانوں کو اور سوچنے کا موقع دیا جنہوں نے ہدایت حاصل کرنی تھی وہ ہدایت پا گئے اور گمراہی سے بچ کر حضرت حُرؑ، ان کا فرزند اور غلام اس مجمع سے نکل کر امام حسینؑ کی طرف آ گئے۔

ادھر امام حسینؑ نے شب عاشور اپنے اصحاب کو بھی اکٹھا کیا اور فرمایا کہ میں نے تم پر سے بیعت اُٹھا لی تاکہ کوئی مجبوری سے میرے ساتھ نہ رہے۔ دونوں فریق کے لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیا ہونے والا ہے لیکن امام حسینؑ کے اصحاب کوئی بیعت کی وجہ سے تھوڑا ہی امام حسینؑ کا ساتھ دے رہے تھے، کہ اُنھوں نے بیعت اُٹھا لی ہے تو وہ چلے جاتے وہ تو اجرِ رسالت ادا کر رہے تھے۔ اس لئے ان میں سے ایک بھی نہ گیا۔ بھلا محبت کرنے والے چھوڑ کر بھی جایا کرتے ہیں؟

جب دسویں کی رات کو یہ طے ہو گیا کہ صبح جنگ ہو گی تو عورتوں میں اضطراب بڑھ گیا۔ ہر ایک اپنی اپنی قربانی کو تیار کرنے لگی اور بچوں کو سمجھانے لگی۔ جناب مسلمؑ کی بیوی نے اپنے بچوں کو بلایا اور کہا۔ دیکھو تمہارے باپ نے سب سے پہلے قربانی دی

ہے۔ لہٰذا کل سب سے پہلے امام پر تم ہی فدا ہونا۔ امام حسنؑ کی بیوی نے جناب قاسمؑ سے کہا۔ بیٹا تیار رہنا کل اکبرؑ سے پہلے جان دے دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم زندہ رہو اور اکبرؑ جہاں سے اُٹھ جائیں۔ ایک خیمے میں جناب اُمِ کلثومؑ رو رہی تھیں جناب عباسؑ آئے۔ پوچھا پھوپھی! کیوں رو رہی ہو۔ فرمایا۔ میرے کوئی اولاد نہیں ہے جو کل امام پر فدیہ کر سکوں۔ عرض کیا۔ پھوپھی! اپنی طرف سے مجھے پیش کر دینا۔ جناب اُمِ لیلیٰ شمع جلائے جناب علی اکبرؑ کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر، ہمشکل پیغمبر، کل کے بعد یہ شکل پھر نہ دیکھ سکوں گی۔

شیر خدا کی بیٹی زینبؑ دونوں بچوں کو پاس بٹھائے ہوئے کہتی ہیں، سنو! عونؑ و محمدؑ۔ دودھ نہیں بخشوں گی۔ کل امام پر سب اپنی اپنی قربانی پیش کریں گے۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔ تین دن سے بھوکے پیاسے ہو ایسا نہ ہو کہ لڑنے سے گریز کرو۔ میں علیؑ کی بیٹی ہوں اور تم اُن کے نواسے ہو۔ شیروں کے نواسے شیر ہوتے ہیں۔۔ تم رسولؐ خدا کے چچا جناب جعفر کے پوتے ہو اور رسولؐ کی بیٹی جناب فاطمہؑ کے نواسے ہو۔ دیکھو بزرگوں کی عزت کا خیال رکھنا۔۔۔ امام حسینؑ میرے بھائی ہیں اور میرے والد اور والدہ نے مجھے وصیتیں کی ہیں۔ سب سے زیادہ ان کا حق مجھ پر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے اور بیبیوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔۔ اے میرے لاڈلو! یہ خیال نہ کرنا کہ کمسن ہو، فوج کی کثرت ہے اور معرکہ بلند ہے۔ تم شیروں کے شیر ہو۔ جوہر دکھانے کے لئے کثرت فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور بلند معرکوں ہی میں جوہر کھلتے ہیں۔ ماں قربان جائے۔ میرے بچو! یاد رکھنا۔ جب لڑتے لڑتے نہر تک پہنچو تو دل میں پانی پینے کا خیال نہ کرنا۔ نہر کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔ کیونکہ حسینؑ کے خیموں میں تم سے چھوٹے بچے پیاسے ہیں۔

جناب زینبؑ بچوں کو سمجھا رہی ہیں اور ان کے چہروں کو دیکھ رہی ہیں کہ کیا اثر ہوتا ہے۔ اتنے میں ایک بچہ بولا۔ اماں! اجازت ہے کہ ہم بھی کچھ عرض کریں! فرمایا۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔ بچے نے کہا۔ اماں جان! جب ہم شیر خدا کے نواسے اور جناب جعفر طیارؑ کے پوتے ہیں اور یہ دونوں جناب رسولؐ خدا کی فوج کے علمدار تھے تو ورثہ میں

امام حسینؑ کی فوج کا علم ہمیں ملنا چاہیئے۔ اگر ہمیں علم مل گیا تو آپ دیکھنا کہ اس کثرت فوج کو تہ وبالا نہ کردیں، رسالے کے رسالے نہ بھگا دیں اور علم کو جا کر کوفے کے در پر نصب نہ کردیں تو پھر شیروں کے شیر نہ کہنا۔

ماں نے بچوں کا حوصلہ دیکھا، دل تو خوش ہوا لیکن یہ بات پسند نہ آئی کہ علم کا سوال کیا۔ کہنے لگیں۔ بچے ہونا اسی لئے بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ علیؑ رسولؐ خدا کی فوج کے علمدار تھے تو اُن کے وارث حضرت عباس علیہ السلام موجود ہیں۔ ان کو علیؑ نے فنونِ جنگ سکھائے ہیں اور عباسؑ تمہارے استاد ہیں ان سے تم نے جنگ کرنے کے طریقے سیکھے ہیں تو بھلا عباسؑ کے ہوتے ہوئے تم نے ایسا سوال کیوں کیا! دیکھو بچو! ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اگر عباسؑ کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم علم لینا چاہتے ہو تو پھر وہ خود علم نہیں لیں گے بلکہ امام حسینؑ سے اصرار کر کے تمہیں علم دلوا دیں گے اور مجھے عباسؑ سے شرمندگی ہوگی۔ تم کو تو وفاداری اور جاں نثاری سے کام ہے۔

دوسرا بچہ کہنے لگا۔ اماں! ہم جان تک دینے کو تیار ہیں لیکن ہمیں یہ خطرہ ہے کہ امام حسینؑ ہمیں مرنے کی اجازت نہیں دیں گے، وہ ہمیں سینے سے لگا کر رونے لگیں گے۔ فرمایا۔ اجازت کا میرا ذمہ۔ مگر یوں کرنا کہ جب صبح کو میں تمہیں ان کے پاس لے جاؤں تو میرے کہنے سے پہلے تم ہاتھ جوڑ کر ان کے قدموں پر گر جانا۔ پھر سفارش میں کردوں گی۔ بچے جوشِ شجاعت سے جھومنے لگے اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

جب صبح ہوئی اور دشمنوں کی طرف سے تیر آنے لگے تو ایک ایک اصحاب حسینؑ اجازت لے کر جانے لگا اور جان نثار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ سب اصحاب شہید ہو گئے۔ اب اہلِ حرم نے اپنے اپنے فدیے پیش کئے۔ جناب زینب بچوں کو لے کر امام کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اُسی وقت جناب مسلمؑ کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر آ گئیں۔ جناب مسلمؑ کے بچوں نے عرض کیا۔ مولا! ہمارے والد اوّل شہید ہیں۔ سب سے پہلے جان دینا ہمارا ورثہ ہے۔ لہٰذا ہم پر کرم فرمایئے اور ہمیں میدان میں جانے کی اجازت مرحمت فرمایئے۔ ادھر جناب مسلم کی بیوی نے جناب زینب سے التجا کی۔ شہزادی! آپ کے بچے

شہزادے ہیں۔ اگر وہ میرے بچوں سے پہلے چلے گئے تو مجھے آپ سے اور اپنے بچوں کے باپ سے شرمندگی ہوگی۔ جناب زینبؑ مجبور ہوگئیں۔ فرزندانِ مسلمؑ گئے اور ہاشمی جرأت کے جوہر دکھائے۔ باپ کا نام روشن کیا اور جامِ شہادت نوش کر کے جنت کو سدھار گئے۔

جناب زینبؑ بچوں کو لے کر امام حسینؑ کے پاس آئیں۔ بچوں نے امام کے قدم پکڑ لئے۔ جناب زینبؑ نے عرض کیا۔ مسلمؑ کے بچے شہید ہو گئے ہیں اور میں بہن ہو کر بچوں کو لئے بیٹھی ہوں۔ جب تک میرے بچے شہید نہ ہوں گے میں جناب مسلمؑ کی بیوی کو پرسہ نہیں دے سکتی ہوں۔ امام حسینؑ نے دونوں بچوں کو سینے سے لگا لیا اور رونے لگے۔ فرمایا۔ بہن! حسینؑ کی قسمت میں یہی ہے کہ گود کے پلے ہوؤں کی لاشیں اُٹھاؤں۔ جناب زینبؑ نے عرض کیا۔ بھائی! اگر ایسے ایسے ہزار فرزند ہوں، تب بھی آپ پر قربان کردوں گی۔

امام حسینؑ نے رو کر بچوں کو اجازت دے دی۔ جناب زینبؑ نے خوشی خوشی اور جلدی جلدی اپنے بچوں کے ہتھیار سجائے۔ جب ماں نے تیار کر دیا تو بچے چھوٹے چھوٹے نیزے سنبھال کر گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ میدان کے سامنے جو خیمہ تھا اس میں سب عورتیں بیٹھ کر جنگ دیکھتی تھیں۔ جس کا بیٹا میدان کو جاتا تھا اُس کی ماں سب عورتوں سے آگے بیٹھتی تھی۔

جناب زینبؑ اس خیمے کے در پر بیٹھ گئیں۔ اردگرد دوسری عورتیں بیٹھ گئیں۔ بچے گھوڑوں پر سوار ہو کر میدان کی طرف چلے۔ قوم اشقیاء نے یلغار کی۔ دونوں بچے شاہین کی طرح جھپٹے اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح فوج پر جا پڑے، بڑے جوش و خروش سے حملہ کیا۔ دونوں بھائی فوج کو للکار رہے تھے کہ ہے کوئی پہلوان جو مقابلے کے لئے آئے۔ کچھ دیر ایک ایک کا مقابلہ ہوا۔ بڑے بڑے شہ زور مقابلے پر آئے۔ مگر بچوں نے چند واروں کے بعد تلوار کے گھاٹ اُتار دیئے۔ یہ دیکھ کر ابن سعد خوف کے مارے سامنے سے ہٹنے لگا۔ جناب عباسؑ نے بڑھ کر بلند آواز سے پکارا۔ او! پسر سعد!! منہ کیوں چھپاتا ہے۔ بھاگتا تو تیرا کام ہی ہے آ اور ایک دو زخم بچوں کے ہاتھ کے بھی کھاتا جا۔ مگر وہ

مقابلے کے لئے نہ آیا۔ اس نے ساری فوج کو حکم دیا کہ یہ ایک ایک کے بس میں نہیں آئیں گے۔ سب مل کر حملہ کرو، اب فوج نے مل کر حملہ شروع کیا۔ یہاں ہاشمی شیروں کو جوہر دکھانے کا موقع مل گیا۔ دائیں طرف سے ایک بھائی نے حملہ کیا اور بائیں طرف سے دوسرا بھائی بیچ تول کر فوج پر جا پڑا۔ دونوں بھائی لڑتے لڑتے دشمنوں کے انبوہ میں در آئے۔ بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی۔

مومنین! خدا آپ کو کربلا کی زیارت نصیب کرائے اور چھوٹے بھائی جناب عون کے روضے پر پہنچائے۔ جس جگہ جناب عون گھوڑے سے گرے تھے وہاں ان کے روضے کا قبہ بنا ہوا ہے۔ یہ کربلا کے اسٹیشن سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر ہے۔

ذرا غور فرمایئے! تین دن کی بھوک پیاس، گرمی کی شدت، ریگستان اور وہ فوجوں کا انبوہ لیکن بچوں نے فوجوں کو سات میل دور بھگایا ہے۔ سات میل کہہ دینا آسان ہے۔ لیکن اگر ریگستان میں خالی سات میل چل کر ہی دیکھئے تو مسافت کا پتہ لگ جائے گا۔ یہ جناب زینبؑ کے دودھ کا اثر اور جناب عباسؑ کے سکھائے ہوئے فنونِ جنگ کا کام تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں نے اس قدر شدید جنگ کی ہے کہ فوج میں ہراس پھیل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک طرف علیؑ لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف جناب جعفر طیار حملہ آور ہیں۔ صفیں ٹوٹ چکی تھیں، رسالے منتشر ہو گئے تھے۔ آخر دُعا یاد آئی۔ کسی نے پکار کر ہا، آپ کی والدہ کہتی ہیں۔ کہاں تک اُمت کو قتل کرو گے۔ دودھ نہیں بخشوں گی۔" بچوں کو خیال آیا کہ ہم تو شہید ہونے کا وعدہ کر کے آئے ہیں، ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے دل میں شہادت کا شوق بڑھ گیا۔

پھر کیا تھا بھاگی ہوئی فوجیں پلٹنے لگیں۔ انبوہ پر انبوہ اُمنڈ آئے، تلواریں چمکنے لگیں۔ کمانیں کڑکیں اور تیر برسنے لگے۔ دونوں زخموں سے چور ہو گئے۔ ایک شقی نے ایک بھائی کو تلوار لگائی، دوسرے بھائی نے بڑھ کر بھائی کے قاتل کو جہنم رسید کیا۔ کچھ دیر لڑنے کے بعد دوسرے بھائی کو بھی کسی نے تلوار ماری۔ آواز آئی۔ یَا اَخَاہُ اِدْرِکْنِیْ، امام حسینؑ مدد کے لئے دوڑے۔ فوج بھاگی۔ بچے زمین پر بسمل ملے۔ لاشیں اُٹھائیں،

خیمے میں لائے۔ لاشوں کو عورتوں نے گھیر لیا۔ آہ و بکا کرنے لگیں۔ بچوں کے سرہانے جناب زینبؑ کھڑی تھیں۔ رو کر فرمایا۔ اے میرے بہادرو! شاباش تم نے خاندانی وقار اور شجاعت کا حق ادا کر دیا، تم نے مجھے بابا علیؑ اور اماں فاطمہؑ سے سُرخ رو کر دیا۔ تم نے میرے شیرو! میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔ ہائے دل چاہتا ہے کہ تین بند مرثیے کے حسب حال پیش کروں۔

شب کو خوشامدیں مری کرتے تھے بار بار ۔۔۔ ماں دودھ ہم کو بخش دے مادر جگر نگار
ان بھولی بھالی باتوں پہ ماں ہو گئی نثار ۔۔۔ باتیں وہ رات کی مجھے بھولیں گی نے وہ پیار

ماں واری، سرخرو ہوئے تم سب کے سامنے
(ہائے) لو دودھ میں نے بخش دیا ان سب کے سامنے

تابوت اٹھاتی دھوم سے مرتے وطن میں گر ۔۔۔ ہوتا پدر بھی ساتھ جنازے کے نوحہ گر
قبریں بناتی ماں کی لحد کے ادھر اُدھر ۔۔۔ کیا حشر ہوگا پہنچے گی یثرب میں جب خبر

امّ البنینؑ پیٹتی روضے پہ جائیں گی
صغریٰؑ کے پاس بیبیاں پرسے کو آئیں گی

یہ بین کرکے لاش سے لپٹی وہ نوحہ گر ۔۔۔ غش آیا سانس اُٹ گئی، ٹکڑے ہوا جگر
اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر ۔۔۔ بانو پکاری سوئے علمدارؑ دیکھ کر

بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
لاشے اٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے

(اس شعر کو دو دفعہ پڑھ کر مجلس ختم کیجیے)

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

☆☆☆

آٹھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ تم سے تبلیغ کا معاوضہ سوائے اپنے اقرباء کی محبت کے اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔

تبلیغ کا معاوضہ بنا کر محبت کا سوال کیا گیا ہے۔ اگر معاوضے میں مال مانگا جاتا تو مال دے کر جان بچائی جا سکتی تھی۔ اگر جان طلب کی جاتی تو جان قربان کر کے اولاد محفوظ کی جا سکتی تھی۔ اگر اولاد کے لئے مطالبہ ہوتا تو اولاد فدا کر کے ایمان سلامت رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن رسولؐ اللہ نے ان میں سے کوئی چیز نہیں مانگی ہے بلکہ اُنھیں سوائے محبت کے اور کچھ درکار نہیں ہے۔ دیکھنے میں محبت ایک معمولی چیز ہے۔ لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس سے زیادہ قیمتی آپ کو کوئی اور چیز نہیں ملے گی۔

اگر اقرباء سے محبت کرتے ہیں اور اپنے مال سے بھی محبت کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ کی محبت میں کمی ہے۔ اِسی طرح اگر آپ نے اپنی جان یا اولاد کو پیارا سمجھا تو یہ "جان" (ہنس کر) لیجئے کہ اقربا کی محبت میں اتنی ہی کمی آ گئی ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص منصور دَوَانیقی بادشاہ کے ایک خاص آدمی کے گھر گیا دیکھا کہ رمضان کے مہینے میں دن کے وقت وہ کھانا کھا رہا ہے۔ اس نے پوچھا کیا آپ روزہ نہیں رکھتے ہیں؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ رونے لگا۔ اس شخص نے سبب پوچھا تو بتایا کہ میں منصور دوانقی کے خاص آدمیوں میں سے ایک تھا۔ ایک دفعہ رات کے وقت منصور کا غلام میرے پاس آیا اور کہا کہ خلیفہ آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ منصور کے پاس گیا۔ منصور نے پوچھا۔ تم مجھے کس قدر چاہتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں آپ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ وہ خاموش ہو گیا اور کہا کہ چلے جاؤ۔ میں گھر واپس آ گیا۔ ابھی آیا ہی تھا کہ وہ غلام پھر آیا اور کہا۔ آپ کو خلیفہ یاد کر رہے ہیں۔ میں گیا۔ خلیفہ نے

پوچھا۔تم ہمیں کتنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا میں آپ کو اپنی جان بلکہ اپنی اولاد سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ یہ سن کر منصور پھر خاموش ہو گیا اور کہنے لگا تم جا سکتے ہو۔ میں واپس آ گیا۔ پھر تیسری مرتبہ وہی غلام آیا۔ میں اس کے ساتھ گیا۔ خلیفہ نے پوچھا۔ تمہیں ہم سے کتنی محبت ہے؟ میں نے عرض کیا اگر جان چاہیئے تو حاضر ہے۔ اگر اولاد چاہیئے تو اولاد حاضر ہے بلکہ میں تو اپنا ایمان تک آپ کو پیش کر سکتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ منصور خوش ہو گیا اور میں سمجھا کہ چلو جان چھٹی۔

اب منصور نے مجھے ایک تلوار دی اور کہا کہ اس غلام کے ساتھ چلے جاؤ اور جو کچھ یہ کہے کرتے جاؤ۔ غلام مجھے ایک مقام پر لے گیا۔ اس نے ایک حجرہ کھولا۔ اس میں سے بیس سید، اولادِ فاطمہؑ زنجیروں میں بندھے ہوئے نکالے اور کہا۔ ان کو قتل کر دو۔ یہ سید ہیں۔ میں نے تلوار اُٹھائی اور سب کو قتل کر دیا۔ پھر وہ غلام آگے بڑھا اور دوسرے حجرے میں سے اتنی ہی تعداد کے سید زنجیروں میں جکڑے ہوئے نکالے اور مجھے کہا کہ قتل کر دو۔ چونکہ میں خلیفہ سے ایمان کا وعدہ کر چکا تھا۔ مجبوراً میں نے سب کو قتل کر دیا۔ پھر تیسرے حجرے سے بیس سید نکالے اور ان کو قتل کیا۔ جب چوتھے حجرے پر پہنچے تو اُن میں سیدوں میں ایک ضعیف نورانی شکل کے سید تھے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہم تو شہید ہو ہی جائیں گے لیکن تو مسلمان ہو کر اولادِ فاطمہؑ کا کیوں خون بہا رہا ہے۔ حشر میں تیرا گریبان ہوگا اور ہمارا ہاتھ ہوگا۔ وہاں جناب فاطمہؑ کو کیا جواب دے گا۔ یہ سننا تھا کہ دل پر بہت اثر ہوا اور ہاتھ رُک گیا۔ غلام نے گرج کر کہا۔ اس کے کہنے پر نہ جانا۔ جو کچھ خلیفہ سے وعدہ کیا ہے اس کی تعمیل کرو۔ مجبوراً میں نے ان سب کو بھی قتل کر دیا۔ یہ کہہ کر وہ شخص رونے لگا اور بولا کہ اب اس کے بعد مجھے روزہ نماز کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے اور میں جہنم سے کسی طرح بچ نہیں سکتا ہوں۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ محبت کے حدود بہت وسیع ہیں اور محبت کرنے والوں کو جان، اولاد اور ایمان سب کچھ پیش کرنا پڑتا ہے۔ آیت میں صرف اقرباء کی محبت ضروری ہے۔ مگر یہ کلام قدرت ہے۔ اس میں نہ کوئی لفظ زیادہ ہے اور نہ کم ہے۔ اگر

رسولؐ اللہ محبت کا سوال کرتے تو اس طرح کہتے۔ "میں تم سے اپنے فلاں کام کا معاوضہ سوائے میرے اقربا کی محبت کے کچھ نہیں مانگتا ہوں۔" مگر قدرت نے سوال کرنے سے پہلے قُل کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کہنے کا حکم دینے والے یعنی خدا پر ایمان لاؤ پھر زبان سے کہنے والے، رسولؐ کی اطاعت کرو۔ معلوم ہوا اللہ اور رسول دونوں مقدم ہیں تب ہی تو ان کے حکم سے اقرباء کے ساتھ محبت کی جائے گی۔ آپ ذرا قُل کا لفظ نکال کر دیکھ لیجئے۔ کلامِ خدا، اللہ کا کلام ہی نہیں رہے گا بلکہ اس میں کتنے ہی نقص پیدا ہو جائیں گے۔ اسی لئے تو قرآن کا دعویٰ ہے: فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ خدا کے کلام سے منکر ہونے والو! اس جیسی ایک سورت ہی لا کر دکھا دو۔

اقربا سے محبت کرنا خدا کے حکم کی تعمیل ہے اور رسولؐ کے فرمان کی اطاعت ہے۔ اب کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ آیت میں صرف اقربا کی محبت کا حکم ہے اور اللہ و رسولؐ کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ محبت میں کسی کی شرکت نقص ہے۔ اگر اقربا سے بھی محبت کرے اور جان یا اولاد کو بھی چاہے تو یہ محبت میں نقص ہوگا اسی لئے اقربا کی محبت سے کسی چیز کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے اور یہ نہیں کہا گیا ہے کہ مثلاً اگر اقربا کے مقابلے میں کسی حاکم یا بادشاہ کی اطاعت کرنا پڑے تو کر لینا۔ لہٰذا جب اقربا کو بلا استثناء تن من دھن سب کچھ تج دیا گیا تو پھر اقربا کی محبت کے ساتھ اللہ اور رسولؐ، ایک نہیں بلکہ دو دو کی محبت کو شریک کرنا اصولِ محبت کے منافی ہے۔ اس سے محبت میں نقص آ جاتا ہے۔۔ میں اس کا جواب سوائے اس کے کیا دوں کہ اقربا کی محبت، رسول کی محبت ہے اور رسول کی محبت اللہ کی محبت ہے۔

سنیئے! زَيِّنُوْا مَجَالِسَكُمْ بِذِكْرِ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ لِاَنَّ ذِكْرَهٗ ذِكْرِيْ وَذِكْرِيْ ذِكْرُ اللّٰهِ عِبَادَةٌ۔ اپنی مجلسوں کو علیؑ کے ذکر سے زینت دیا کرو کیونکہ علیؑ کا ذکر میرا ذکر ہے اور میرا ذکر اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کا ذکر عبادت ہے۔ جب علیؑ کا ذکر رسولؐ کا ذکر ہے تو علیؑ کی محبت رسولؐ کی محبت ہوئی اور رسول کی محبت اللہ کی محبت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ مومنین کو حکم دیا ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ لہٰذا بموجب حکمِ خدا راکعین کے ساتھ ہونا پڑے

گا۔ پھر فرمایا۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔
اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ سچوں کے ساتھ ہونے کا یہی تو مطلب ہے کہ ان کے کہنے پر چلیں، ان کی اطاعت کریں اور ان سے محبت رکھیں۔ اب بتایئے کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ ہوں یا سچوں کی اطاعت کریں۔ پھر تیسرا حکم: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ
اللہ کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو رسول کی اور صاحبانِ حکم کی جو تم میں سے ہیں۔ اب یہ تین ہو گئے بتایئے! رکوع کرنے والوں کا ساتھ دیں یا سچوں کے ساتھ رہیں یا اللہ، رسولؐ اور صاحبانِ امر کی اطاعت کریں۔ ادھر اقربا کی محبت نے تو بالکل ہی جکڑ رکھا ہے کہ کسی دوسرے کی طرف رُخ کر ہی نہیں سکتے ہیں تو کیا قرآن میں متضاد احکام آئے ہیں ایک خدا ایک رسولؐ اور ایک ہی قرآن ہے تو پھر بھلا متضاد احکام کیسے آسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی تفسیروں نے اسلام میں فرقے پیدا کر دیئے ہیں اگر اقربا کو پہچان لیتے اور سمجھ لیتے کہ یہ اقربا رسولؐ کے خاکی جسم کے رشتہ دار نہیں بلکہ نور رسالت کے قرابت دار ہیں اور اسی وجہ سے معاوضہ تبلیغ کے حقدار ہیں تو ان سے تفسیر پوچھتے اور اسلام میں فرقے نہ ہونے پاتے اور نہ کوئی اختلاف ہوتا۔

جب ہم ان الفاظ کی تفسیر دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ راکعین، صادقین اور اولی الامر ایک ہی چیز ہے، اقربا کو طرح طرح کے الفاظ نے پہچوایا گیا ہے۔ کبھی انہیں راکعین کہا، کبھی صادقین بتایا کبھی اولی الامر کہہ کر شناخت کرائی اور اَطِیْعُوا کہہ کر تو پورا اتہ پتہ بتا دیا کہ رسولؐ کے بعد ان ہی کی اطاعت ہے۔

آیت کے الفاظ دیکھیے اَطِیْعُوا اللّٰہَ ۔ اللہ کی اطاعت کرو۔ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ وَاُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۔ یہاں اَطِیْعُوا کا لفظ نہیں ہے۔ یا تو آیت میں صرف ایک اَطِیْعُوا کا لفظ آتا ہے، جس کے تحت سب کی اطاعت کا حکم دے دیا جاتا یعنی آیت یوں ہوتی۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَاُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ اور اگر رسولؐ کے لئے الگ اَطِیْعُوا کا لفظ لانا تھا تو پھر اُولِی الْاَمْر کے

لئے بھی ایک اور اَطِیْعُوْا ہونا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوا اللہ اور رسولؐ کے درمیان جو اَطِیْعُوْا کا لفظ ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت میں فرق ہے۔ اور چونکہ رسولؐ اور اولی الامر کے درمیان اَطِیْعُوْا کا لفظ نہیں لایا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت ایک جیسی ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ خدا نے تو رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت "بلا فصل" رکھی اور درمیان میں اَطِیْعُوْا کا لفظ نہیں آنے دیا لیکن بندوں نے اولی الامر کے معنی دنیاوی بادشاہ سمجھ لیئے۔ بھلا جب رسولؐ اور دنیاوی بادشاہوں کی اطاعت ایک جیسی ہوگئی تو پھر دین ہی دینِ خدا کہاں رہا یہ تو شاہی قانون بن گیا۔

خدا کو دیکھیئے کہ اس بات کے لئے انتظام کئے اور اپنے بندوں کو سمجھایا کہ دینِ خدا اور چیز ہے اور دنیاوی بادشاہت دوسری چیز ہے۔ فرعون کے زمانے میں حضرت موسیٰؑ کو پیدا کیا۔ فرعون کو دنیا کی بادشاہت دے دی اور حضرت موسیٰؑ کو اپنا اولی الامر بنایا۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں نمرود کو دنیا کا بادشاہ بنایا اور دینِ خدا کی حکومت حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمائی۔ یعنی دین کی بادشاہت الگ رکھی اور دنیا کی بادشاہت علیحدہ قرار دی۔ پھر حضرت سلیمانؑ پیغمبر کو دونوں بادشاہتیں دے کر یہ بھی سمجھا دیا کہ دین کے بادشاہوں کے لئے دُنیا کی بادشاہت حرام نہیں ہے ورنہ لوگ یہ کہہ دیتے کہ جو دین کا بادشاہ ہوتا ہے وہ دنیا کا بادشاہ نہیں ہوسکتا۔

قدرت نے ہر طرح سے سمجھا دیا کہ دین کے بادشاہوں کی اطاعت واجب ہے۔ اگر دین کا بادشاہ موجود ہو اور اس کے پاس سلطنت وحکومت نہ ہو تب بھی اس کی حکمرانی میں فرق نہیں آئے گا۔ تم کو اسی بے تاج بادشاہ کی پیروی کرنی پڑے گی۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے جنگیں کیں لیکن قدرت نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کو مارنے کا حکم نہ دیا۔ یہاں تک کہ چالیس جنگوں تک نوبت پہنچی۔ حضرت موسیٰؑ کے پاس عصا تھا۔ چاہتے تو فرعون کا خاتمہ کر دیتے لیکن اس سے یہ ہوتا کہ دنیاوی بادشاہت پر برسرِ اقتدار آنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کا حکم چلتا۔ اس لئے قدرت نے ان کو فتح نہیں دلائی بلکہ حضرت

موسیٰ شکست پر شکست کھاتے چلے گئے۔ لیکن ان کی نبوت اور دین کے بادشاہ ہونے میں فرق نہ آیا۔

ایک وقت وہ آیا کہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے مقابلے سے دریا کی طرف بھاگنا پڑا۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی بھاگے جا رہے ہیں اور فرعون کا لشکر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ دریائے نیل آ گیا۔ اب نہ آگے کو بھاگنے کی گنجائش ہے اور نہ پیچھے "خیریت" ہے۔ حضرت موسیٰ کے پاس تو ڈنڈا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے کام لیتے اور معجزہ دکھاتے۔ مگر (ہنس کر) عصا دریا پر تو مارنے کا حکم آیا لیکن فرعون پر اور اس کی فوج پر ڈنڈا اٹھانے کا حکم نہ آیا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود پر غالب نہیں کیا گیا۔ قدرت نے حضرت ابراہیم کے لئے آگ کو تو ٹھنڈا کر دیا اور گلزار بنا دیا مگر نمرود کو جان سے نہ مارا۔ تو وجہ یہ ہے کہ اگر حضرت موسیٰ فرعون کو عصا سے مار ڈالتے اور حضرت ابراہیم نمرود پر غلبہ حاصل کر لیتے تو لوگ ان کو دنیا کا بادشاہ سمجھتے اور کہتے کہ موسیٰ اور ابراہیم بڑے بہادر اور طاقتور تھے، ان کو دین خدا کا حاکم نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

اس لئے نبیوں کے زمانے میں ایسے ایسے لوگوں کو بادشاہت دی گئی جو دین کے پکے اور اونچے درجے کے دشمن تھے تاکہ دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ وہ بادشاہ بھی مومن تھے اور وہ دین کی خدمت کر رہے تھے۔ دو دین کے حاکموں میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے فرعون کو بادشاہت دی تاکہ ایک طرف خدائی کا دعویٰ کرنے والا ہو اور دوسری طرف ہمارا اولی الامر ہو۔ پھر حضرت موسیٰ کو ہرایا اور بھگایا کہ لوگ طاقتور سمجھ کر حضرت موسیٰ کی اطاعت نہ کریں۔

حضرت ابراہیم پر نمرود کو جو خدا ہونے کا دعویٰ کرتا تھا غالب کر دیا اور ان پر آگ کو گلزار بنا کر سمجھا دیا کہ دین خدا کے حاکم بے تاج کے بھی صاحب امر ہوتے ہیں۔ مگر جناب ابراہیم کو ہجرت کرنا پڑی۔ اسی طرح جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مکے میں دنیا کی بادشاہت الگ رکھی گئی اور رسالت کا دعویٰ کرایا گیا۔ جب رسولؐ اللہ پر مکے

والوں نے سختیاں کیں تو شق القمر کا معجزہ کر دکھایا مگر ہجرت کو ہٹانے کے لئے کسی قوت کے اظہار کی اجازت نہیں دی گئی۔

غور کیجئے کہ اس میں کیا راز تھا۔ جو شخص اُنگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر سکتا ہو، جس کا خادم جبرائیلؑ ہو اور صاحب ذوالفقار حضرت علیؑ بھی ساتھ ہوں اُس وقت جہاد نہ کیا اور وطن سے نکل گئے، بلکہ چھپ چھپ کر اور غاروں میں پناہ لے کر ہجرت فرمائی۔ اگر رسولؐ چاہتے تو اس وقت بھی مکے میں حکومت حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن سمجھانا یہ تھا کہ دین کے بادشاہ کے لئے دُنیا کی سلطنت ضروری نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس دنیا کی سلطنت نہ ہو تب بھی وہ دین کا حکمران اور بادشاہ رہے گا۔

جناب سلیمانؑ کو نبوت کے ساتھ دنیا کی بادشاہت دے کر یہ سمجھا دیا کہ جب رسولؐ اللہ کو مکے سے ہجرت کر کے مدینے میں سلطنت مل جائے تو نبوت میں فرق نہیں آئے گا۔ (صلوات)

معلوم ہوا اولی الامر سے مراد دنیاوی بادشاہ نہیں لئے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی دنیاوی بادشاہ حکم دے تو اس کی اطاعت اس وقت تک ہی کی جا سکتی ہے جب تک اس کا حکم رسولؐ اور صاحبانِ امر کے حکم سے نہ ٹکرائے اور اُن کی محبت کو ٹھیس نہ لگے۔ ورنہ بادشاہ کا حکم رد کر دیا جائے گا اور دینِ خدا کے حاکموں کی اطاعت کی جائے گی۔

خدا ایک ہے، واحد ہے اور لاشریک ہے۔ دو خدا نہیں ہو سکتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو کبھی اللہ کہتا ہے، کبھی رحیم، کبھی رحمٰن، کبھی کریم، کبھی غفور، کبھی قیوم کہتا ہے۔ تو کیا دنیا میں اتنے اللہ ہیں۔ جتنے نام ہیں۔ خدا ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔ اگر چند خدا ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد برپا ہو جاتا۔ معلوم ہوا خدا تو ایک ہی ہے مگر اُس نے اپنے آپ کو مختلف ناموں سے پہنچوایا ہے۔ جیسے رسولؐ اللہ کو قرآن میں کہیں مبشر کہا کہیں سراج کہا کہیں شاہد کہا کہیں نبی وغیرہ کہا اور مختلف ناموں سے پکارا۔ اسی طرح اقربا کو کہیں راکعین کہا کہیں صادقین کہا کہیں انعمت علیہم کہا۔ اور کہیں اولی الامر کہا گیا ہے۔ نام مختلف ہیں مگر مراد وہی اقربا ہیں، صفات

مختلف ہیں مگر موصوف ایک ہی ہے۔ ان ہی کے لئے محبت کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی ہماری جان کے مالک ہیں، یہی ہمارے مال کے مالک ہیں، یہی ہماری اولاد کے مالک ہیں، یہی ہمارے تن من اور دھن ہر چیز کے مالک ہیں، یہی ہمارے ایمان کے مالک ہیں، یہی ہمارے امام ہیں اور یہی ہمارے خلیفہ ہیں۔

ورنہ اگر کہیں راکعین اور ہوں، صادقین اور ہوں، اولی الامر اور ہوں، امام اور ہوں، خلیفہ اور ہوں، اقربا اور ہوں اور اہلِ بیت اور ہوں تو پھر ایک شخص کس کس طرف کو جائے گا اور کس کی اطاعت کرے گا۔

جناب موسیٰؑ ایک طرف تو فرعون سے ہارے اور بھاگے مگر دوسری طرف پانی پر حکومت کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اصل حاکم ہم ہیں۔ خدا کی مصلحت کے پابند ہیں، ورنہ کمزور نہیں ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ آگ میں تو چلے گئے مگر آگ کو گلزار کر کے دنیا کو سمجھا دیا کہ ہم مجبور نہیں ہیں، صرف خدا کی مصلحت کے پابند ہیں۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکے میں پتھروں سے کلمہ پڑھوا دیا۔ درختوں کو چلا کر دکھا دیا، چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔ ستارے کو چوکھٹ پر بلا لیا۔ مگر رات کو ہجرت کر کے غریب الوطن بن گئے اور زبردستی نہیں کی کہ ہم قدرت کی مصلحت کے پابند ہیں۔ اسی طرح اقربا نے ظاہری بادشاہت کے لئے طاقت کا مظاہرہ نہ کیا اور ظلموں پر ظلم سہتے رہے۔ لیکن یہ ضرور ظاہر کر دیا کہ ہم کمزور نہیں ہیں۔

دشمنِ اہلِ بیتؑ متوکل بادشاہ کا زمانہ ہے۔ اس نے اپنے ایک ہندی شعبدہ باز کو آمادہ کیا کہ امام علی نقیؑ کو شرمندہ کر کے دکھائے۔ اس نے کہا کہ ایک دعوت کا اہتمام کرو اور اس میں امام علی نقیؑ کو بھی مدعو کرو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بادشاہ نے بہت سے لوگوں کی دعوت کر دی۔ جب سب کھانے کے لئے دسترخوان پر آ بیٹھے اور کھانا شروع کیا تو امامؑ نے بھی روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس شعبدہ باز نے جادو کے ذریعے روٹی کو حرکت دی اور وہ امامؑ کے آگے سے سرک گئی۔ امامؑ نے دوسری روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بھی سرک گئی۔ لوگ ہنسنے لگے۔ جب تین مرتبہ ایسا ہی ہوا تو امامؑ نے غیظ میں قالین پر

بنے ہوئے شیر کی تصویر کی جانب دیکھا اور فرمایا خُذْ اَسَدَا ۔ اے تصویر شیر ہو جا اور اس شعبدہ باز کو کھا جا۔ لمحہ نہ گزرا تھا وہ تصویر اصلی شیر بن گئی۔ لوگوں میں ہراس پھیل گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، لینے کے دینے پڑ گئے۔ سب کھانا وانا بھول گئے۔ شیر شعبدہ باز کی طرف جھپٹا اور اسے پکڑ کر سب کے سامنے ہڑپ کر گیا۔ پھر واپس آ کر قالین پر اپنی تصویر کی جگہ لیٹ گیا۔ اور پلک جھپکی تو لوگوں نے دیکھا کہ اصلی شیر پھر تصویر بن چکا ہے۔

بادشاہ کو اپنے بہترین جادوگر کی موت کا بہت دُکھ ہوا۔ اکڑ مکڑ سب بھول گیا۔ جناب! بادشاہت کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر امام سے التجا کرنے لگا کہ آپ بیشک معجزنما ہیں اب آپ اس شیر سے شعبدہ باز کو اُگلوا دیجئے۔ امامؑ نے فرمایا کہ اگر حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپوں کو نگل کر اُگل دیتا تو یہ شیر بھی تیرے شعبدہ باز کو اُگل دیتا۔

کَلَامُ الْاِمَامِ اِمَامُ الْکَلَامِ ۔ امام کا کلام، کلام کا امام ہوتا ہے۔ اگر میں یا آپ ہوتے تو سیدھا جواب دے دیتے کہ "اب شیر سے شعبدہ باز کو نہیں اُگلواؤں گا۔" لیکن اگر آپ امامؑ کے کلام پر غور فرمائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی انتہا نظر آئے گی۔ آپ نے فرمایا اگر حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپوں کو اُگل دیتا تو آج یہ شیر اس شعبدہ باز کو اُگل دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک طرف فرعون تھا اور دوسری طرف حضرت موسیٰؑ تھے اسی طرح آج ایک طرف تُو ہے اور دوسری طرف میں ہوں۔ وہاں فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو شرمندہ کرنے کے لئے جادوگر بلائے تھے، یہاں تُو نے مجھے شرمندہ کرنے کے لئے شعبدہ باز کو بلایا تھا۔ وہاں حضرت موسیٰؑ نے جادوگروں کا جادو باطل کر دیا۔ اور یہاں (ہنس کر) میں نے تیرے شعبدہ باز ہی کو صاف کر دیا۔ "وہاں حضرت موسیٰؑ کے پاس عصا تھا جس کے جسم تھا لیکن یہاں تصویر کہ جس کا کوئی جسم ہی نہیں ہوتا، میں نے اس پر حکمرانی دکھائی ہے۔ وہاں حضرت موسیٰؑ نے سانپوں کو اس لئے نہیں اُگلا تھا کہ فرعون کہتا موسیٰؑ کا جادو میرے جادوگروں سے بڑھا ہوا ہے اور ان کو جادوگر بنا دیا جاتا۔ یہاں میرا شیر تیرے شعبدہ باز کو اس لئے نہیں اُگلے گا تاکہ تو یہ نہ کہہ سکے کہ میں نے بھی شعبدہ دکھایا ہے۔۔۔

شعبدے میں صرف نظر کا دھوکا ہوتا ہے ورنہ سب چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ عصا کا سانپوں کو نہ اُگلنا اور شعبدہ باز کا وجود مٹ جانا بتاتا ہے کہ یہ شعبدہ نہیں ہے بلکہ معجزہ ہے۔ اولی الامر کی یہی شان ہوتی ہے کہ اگر تصویر کو بھی حکم دے دے تو زندہ مخلوق بن جاتی ہے۔

امام حسینؑ نے بھی یہی کیا کہ جب یزید نے ان کا مقابلہ کیا تو اسے مارا نہیں بلکہ خود مظلوم بن گئے لیکن کٹے ہوئے سر سے نیزے پر قرآن کی تلاوت کر کے بتا دیا کہ ہم کمزور نہیں ہیں۔ صرف خدا کی مصلحت کے پابند ہیں ورنہ ہم ایسے اولی الامر ہیں کہ موت بھی ہم پر غالب نہیں آسکتی اور سروتن کی جدائی ہماری زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ ہم اب بھی اسی طرح بول سکتے ہیں جس طرح زندگی میں، ہم اسی طرح دیکھ سکتے ہیں جس طرح زندگی میں اور ہم اسی طرح ہدایت کر سکتے ہیں جس طرح زندگی میں ہدایت کرتے رہے۔

جس طرح حضرت موسیٰ نے فرعون کے مقابلے میں، حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے مقابلے میں اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفارِ مکہ کے مقابلے میں مظلومیت اختیار کی تھی اسی طرح امامِ مظلومؑ نے خدا کی مصلحت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

جناب موسیٰ کو توریت عطا ہوئی تھی لیکن معجزہ دکھانے کے لئے علیحدہ عصا دیا گیا تھا اور ہمارے نبیؐ کو خدا نے ایسی کتاب دی جو ہدایت بھی کرتی ہے اور معجزہ بھی پیش کرتی ہے۔ جناب موسیٰ کا عصا ختم ہو گیا اور اب دنیا میں اُس کا وجود نہیں ہے لیکن ہمارے نبیؐ کی کتاب معجزہ ہے اور اب بھی موجود ہے بلکہ اتنی ترقی پر ہے کہ گھر گھر میں موجود ہے۔ امام حسینؑ نے اس معجزنما کتاب پر ایسا معجزہ پیش کیا کہ قیامت تک کوئی ایسا معجزہ پیش نہیں کر سکے گا۔ امام نے بھرے بازاروں میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے کٹے ہوئے سر سے نیزے پر تلاوت کر کے یہ دکھا دیا کہ جس طرح قیامت تک قرآن معجزہ ہے اسی طرح قیامت تک میرے عمل کا بھی ثانی نہیں ہے۔

قرآن میں روزے رکھنے کا حکم ہے، آپ نے اور آپ کے بچوں نے کربلا میں ایسا روزہ رکھ کر دکھا دیا کہ جس کی نظیر نہیں ملے گی۔ نمازیں ایسی پڑھیں کہ تیر اور تلواروں میں خالقِ حقیقی کی عبادت ہو رہی تھی۔ زکوٰۃ اس طرح ادا کی کہ بعد شہادت انگوٹھی کے ساتھ اُنگلی بھی لوگ کاٹ کر لے گئے۔ حج سے محروم نکلے تو قدرت نے امام حسینؑ کے روضے کی زیارت کا ثواب حج کے برابر مقرر کیا۔ خمس لینے کے اگرچہ خود حقدار تھے لیکن خدا کی راہ میں بچیوں کے بُندے اور عورتوں کی چادریں لٹا دیں۔

جہاد تو ظاہر ہے کہ کس شان سے کیا ہے۔ ایک طرف بہتر ۷۲ تھے اور دوسری طرف ساری سلطنت کا زور تھا۔ بچوں تک کے حوصلے کا یہ عالم ہے کہ جس وقت پیارے بھائی امام حسنؑ کی نشانی، جناب قاسمؑ نے جنگ کے لئے اجازت کو کہا تو آپ نے بھتیجے سے پوچھا کَیْفَ الْمَوْتُ عِنْدَکَ یَا بُنَیَّا ۔ اے بیٹا! تمہارے نزدیک موت کیسی ہے؟ جناب قاسمؑ نے خوش ہو کر برجستہ کہا: یَا عَمَّاہُ اَلْمَوْتُ عِنْدِیْ اَحْلیٰ مِنَ الْعَسَلِ چچا جان! موت تو میرے لئے شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے۔ امام نے قاسمؑ کو سینے سے لپٹا لیا۔ ہائے بھائی حسنؑ کی نشانی تھی کس طرح اجازت دیتے۔ رونے لگے اور جناب قاسمؑ کو سمجھا کر واپس کر دیا کہ تیری بیوہ ماں کو تیرے باپ کا ہی غم کافی ہے۔ جناب قاسمؑ کو واپس آتا دیکھ کر اُمِ فروہؑ پریشان ہو گئیں۔ پوچھا قاسمؑ! کیوں واپس آرہے ہو۔ کیا موت سے ڈرتے ہو اور ماں کو شرمندہ کرو گے؟ جناب قاسمؑ نے بتایا کہ اماں جب اجازت لینے جاتا ہوں، چچا مجھے سینے سے لگا کر رونے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم میرے بھائی حسنؑ کی نشانی ہو۔

اُدھر حال یہ تھا کہ ہر ایک عورت اپنی اپنی قربانی دینے کے لئے بچوں کو ساتھ لے کر امامؑ کے پاس جا رہی تھی اور ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ سب سے پہلے میرے بچے فدا ہو جائیں۔ امام چاہتے تھے کہ سب سے پہلے اپنے بیٹے علی اکبرؑ کا داغ اُٹھائیں۔ جناب عباسؑ بار بار سامنے آجاتے تھے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے تھے: مولا پہلے غلاموں کا مرنے کا حق ہوتا ہے۔ امام فرماتے تھے بھائی عباسؑ تمہارے دم سے تو سب کو ڈھارس

ہے۔ جناب اُم فروہ حضرت قاسمؑ کو لے کر امام حسینؑ کی خدمت میں چلیں، پہلے جناب عباسؑ سے کہا۔ اے مشکل کشا کے فرزند! میری لاج رکھ لیجئے۔ امام حسینؑ میرے بیٹے کو اجازت نہیں دیتے۔ یہ یتیم ہے، اس کا باپ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ ہائے کس کو سفارش کے لئے لاؤں۔ اے عباسؑ! تم ہی میرے قاسمؑ کو اجازت دلوا دو۔ جناب عباسؑ نے غم میں ڈوب کر اپنا سر جھکا لیا۔ قاسمؑ وہ تھے جنہیں حضرت عباسؑ نے فنونِ جنگ سکھائے تھے۔ جناب قاسم حضرت عباسؑ کے شاگرد تھے۔ آخر مجبور ہو کر جناب عباسؑ نے جناب قاسمؑ کو امام حسینؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ ماں ساتھ ساتھ جناب قاسمؑ کے کھڑی ہیں۔ جناب عباسؑ نے کہا۔ آقا! عجب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ مرنا میں چاہتا ہوں۔ مگر اس بچے کی ماں نے مجبور کر دیا۔ شہزادہ قاسمؑ کی سفارش لے کر آیا ہوں۔ امام حسینؑ نے جناب قاسمؑ کو سینے سے لگا لیا اور رو کر کہا۔ بیٹا! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تیرا چچا زندہ رہے اور تجھے مرنے کی اجازت دے دے؟

کھڑی ہوئی ماں نے قاسمؑ کے بازو کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک تعویذ کھول کر امام کو پیش کیا۔ امام نے کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا: "حسنؑ اپنا یہ ناچیز ہدیہ پیش کرتا ہے شرفِ قبولیت بخشیئے" امام حسینؑ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کبھی خط کی طرف دیکھتے تھے کبھی قاسمؑ کے چہرے پر حسرت کی نظر ڈالتے تھے۔ آخر رو کر فرمایا: میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ گود کے پالے ہوؤں کو روؤں اور خاک و خون میں غلطیاں دیکھوں۔

جب جناب قاسمؑ کو جنگ کی اجازت مل گئی تو خوشی میں دوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ جناب قاسمؑ گھوڑے کی سواری بھی بہت عمدہ جانتے تھے فوراً گھوڑے کو مہمیز کیا اور بڑے کر و فر سے میدان میں تشریف لائے۔ جنگ دیکھنے کے لئے ایک طرف جناب عباسؑ آگے بڑھ کر کھڑے ہوئے اور دوسری طرف امام حسینؑ کھڑے ہوئے۔ جناب قاسمؑ نے مقابلے کے لئے رجز پڑھا اور پہلوانوں کو مقابلے کے لئے طلب کیا۔ پسر سعد نے اپنے پہلوانوں کو مقابلے کے لئے بھیجا۔ اور کہا کہ جو اس لڑکے کا سر لائے گا وہ بہت انعام پائے گا۔ کئی پہلوان اپنے زعم میں آئے کہ معمولی کام ہے مگر آتے ہی ایک دو وار

میں "پارسل" ہو گئے۔

یہ دیکھ کر فوج اشقیا میں کھلبلی مچ گئی۔ عمر سعد نے ارزق شامی پہلوان کو مقابلے کے لئے جانے کا حکم دیا۔ ارزق عرب کا ایک مشہور شہسوار اور فیل تن پہلوان تھا۔ اس نے جنگ سے کہا۔ ہوں! اس بچے کے مقابلے کے لئے مجھے کیوں بھیجتا ہے۔ میرے چار لڑکے ہیں، ان میں سے ایک کو بھیجے دیتا ہوں وہ ابھی اس کا سر لے آئے گا۔

واقعی ارزق نے یہ سچ کہا تھا کہ یہ بچہ ہے۔ کیونکہ جناب قاسمؑ جب مدینے سے چلے تھے تو ماں کے ساتھ زنانہ محمل میں سوار ہو کر آئے تھے۔ وہ ماں اب در، خیمہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور جناب قاسمؑ لاکھوں خونخواروں کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ارزق کا لڑکا مقابلے کے لئے آیا۔ دونوں میں لڑائی شروع ہوئی۔ جناب عباسؑ اپنے شاگرد کو دیکھ رہے ہیں اور ارزق اپنے لڑکے کی جنگ دیکھ رہا ہے۔ دونوں میں تلوار کے ردوبدل ہونے لگے۔ جب ارزق کا لڑکا وار کرتا ہے تو جناب قاسمؑ روکتے ہیں اور جب جناب قاسمؑ وار کرتے ہیں تو ارزق کا لڑکا کانواں کاٹ کر اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جناب قاسمؑ کا ایک وار پڑا۔ تلوار کے زناٹے کی آواز آئی اور ارزق کے لڑکے کی گردن کٹ کر دور جا گری۔ فوراً جناب عباسؑ نے داد دی۔ "مرحبا، مرحبا، یا قاسمؑ"! شاباش، شاباش اے قاسمؑ! جناب قاسمؑ نے پھر اشقیا کو للکارا۔ "ہے کوئی جو مقابلے کے لئے آئے۔"

اب ارزق کا دوسرا لڑکا مقابلے کے لئے نکلا۔ آخر بھائی کے انتقام کا جوش ہوتا ہی ہے۔ اس نے پورے جوش سے مقابلہ کیا مگر تھوڑی ہی دیر میں جناب قاسمؑ نے اسے بھی قتل کر دیا۔ تیسرے لڑکے کو جوش آیا۔ بھائیوں کا بدلہ لینے کے لئے للکارتا ہوا نکلا اور شروع ہی میں جناب قاسمؑ پر سخت وار کیا۔ مگر شیر خدا کے پوتے نے نہایت آسانی سے وار رد کر دیا اور پھر فوراً ایک تلوار ایسی لگائی کہ واصلِ جہنم ہوا۔ چوتھا لڑکا بھائیوں کے انتقام میں مخمور شیر غضبناک کی طرح جھپٹا۔ مگر جناب قاسمؑ نے ایک ہی وار میں اس کے بھی دو ٹکڑے کر دیے۔ اب کیا تھا ارزق کی نظر میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ چار بیٹے مارے گئے۔

غصّے سے آنکھوں میں خون اُتر آیا تلوار اُٹھائی، نیزہ بھی سنبھالا، اپنی شان اور غرور سب کچھ بھول گیا۔ بچے قاسم پر خوفناک دیو کی طرح دانت پیستا ہوا حملہ آور ہوا۔

امام حسینؑ جناب قاسمؑ کی ماں کی طرف دوڑے ہوئے آئے اور گھبرا کر کہا۔ بھابی، بھابی! ماں کی دعا اولاد کے حق میں جلد قبول ہوتی ہے۔ ابھی ابھی قاسمؑ کے مقابلے میں عرب کا ایک مشہور قوی ہیکل پہلوان آیا ہے۔ بھابی! قاسمؑ کے لئے جلد بال کھول کر دعا کرو۔ ماں نے سر کے بال کھول دیئے اور بارگاہِ الٰہی میں جناب قاسمؑ کی سلامتی کے لئے دعائیں کرنے لگیں۔ بارالہٰا میرا قاسمؑ بچہ ہے۔ اسے مشہور پہلوان سے مقابلے کا حوصلہ عطا فرما۔ بارالہٰا! میرے دودھ کی لاج تیرے ہاتھ ہے، میرا قاسمؑ ماں کا سر بلند کرے۔ یا اللہ قاسمؑ کو اس پہلوان پر فتح دے دینا پھر چاہے اپنے پاس بلالینا۔ امام حسینؑ نے بھی دعا مانگی۔ یا اللہ! صدقہ حسینؑ کی بیکسی کا، قاسمؑ کو امان میں رکھنا۔ یا اللہ! اس کی ماں پہلوان کے خوف سے رو رہی ہے تو قاسمؑ کو فتح دے کر اس کی روتی ہوئی ماں کو ہنسا دے۔ پروردگار ہنسا دے۔

جنگ شروع ہوئی۔ ارزق نے غصّے میں بے آپے ہو کر جناب قاسمؑ پر پہلے نیزے سے وار کیا۔ جناب قاسمؑ نہایت پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئے اور اس کا وار خالی گیا۔ ارزق نے دوبارہ پیچھے ہٹ کر نیزہ تول کر وار لگایا۔ جناب قاسمؑ نے ارزق کا وہ وار بھی رد کر دیا۔ دشمنِ خدا غصّے کے عالم میں بار بار نیزہ قاسمؑ کو مارتا تھا اور وہ ہر بار اس کے وار کی کاٹ کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ جناب قاسمؑ نے ایک تلوار اس کے نیزے پر اس زور سے لگائی کہ نیزہ دو ٹکڑے ہو کر گر گیا۔ اب ارزق نے فوراً تلوار سنبھال لی اور دونوں میں ردو بدل ہونے لگے۔ بعض نے لکھا ہے کہ جناب قاسمؑ کی تلوار ارزق کے سر پر پڑی اور بعض نے لکھا ہے کہ جناب قاسمؑ نے ارزق کو نیزے کی اَنی پر اُٹھا کر گھوڑے سے اتنا بلند کیا کہ ساری فوج نے دیکھا اور پھر اُسے زمین پر پٹخ کر مار دیا۔ جناب عباسؑ نے جوش میں بھر کر جناب قاسمؑ کو داد دی۔ مرحبا، مرحبا، شاباش، قاسم شاباش! اور عمر سعد کو پکار کر کہا کہ اب بھی کوئی اور پہلوان تیرے پاس مقابلے کے لئے ہے؟ اس موقع پر کیا خوب

شعر کہا ہے۔ ؎

کیوں پھر کوئی اُس فوج سے نکلے گا اکڑ کے
دیکھو او پسرِ سعد! کہ یوں لڑتے ہیں لڑکے

جب ارزق مارا گیا تو پہلوانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور حضرت قاسمؑ کے مقابلے میں آنے سے گھبرانے لگے۔ عمر سعد نے حکم دیا کہ سب فوج مل کر حملہ کرے اور اس لڑکے کو چاروں طرف سے گھیر لے۔ فوج حرکت میں آگئی اور جناب قاسمؑ کو نرغے میں لے لیا۔ جناب قاسمؑ مثلِ شیرِ غضبناک کے جنگ کر رہے تھے اور لڑائی شدید ہو رہی تھی۔ جس طرف کو حضرت قاسمؑ رُخ کرتے تھے، پرے کے پرے صاف کر دیتے تھے۔ فوج میں بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جناب قاسمؑ فوج کے دریا میں تیر رہے ہیں۔ ہر طرف فوجیں تھیں اور درمیان میں قاسمؑ تھے۔ لڑتے لڑتے بائیں جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا اور رکاب میں پاؤں رکھنا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا آپ تسمہ ٹھیک کرنے کے لئے جھکے کہ ایک شقی نے موقع پا کر تلوار ماری۔ جناب قاسمؑ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔ آخری آواز دی۔ یَا عَمَّاہُ اِدْرِکْنِیْ۔ چچا جان! امداد کے لئے آیئے۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ حمید ابن مسلم کربلا میں موجود تھا، وہ کہتا ہے کہ اس آواز پر امام حسینؑ ایسے جھپٹ کر آئے جیسے شاہین شکار پر آتا ہے۔ اور شیر غضبناک کی طرح فوج پر حملہ کیا اور لاکھوں میں ڈھونڈ کر جناب قاسمؑ کے قاتل عمرو بن سعد ازدی کے تلوار ماری۔ اُس نے تلوار کو ہاتھ پر روکا۔ اس کا ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹ کر جدا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اہلِ کوفہ کے سوار اس کی طرف دوڑے کہ حسینؑ کے ہاتھ سے بچا کر اُسے لے جائیں۔ امامؑ نے گھڑ سواروں پر حملہ کر دیا اور انھیں بھگا دیا۔ لیکن ادھر کے گھوڑے اُدھر اور اُدھر کے گھوڑے اِدھر دوڑنے سے جناب قاسمؑ کا لاشہ پامال ہو گیا۔ جب غبار فرو ہوا تو دیکھا کہ امام حسینؑ اس طفل کے سرہانے کھڑے ہیں اور وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ آپ نے حسرت سے فرمایا۔ بیٹا! خدا کی قسم چچا پر یہ امر بڑا شاق ہے کہ تو پکارے اور وہ جواب نہ دے سکے۔ گھوڑوں کے دوڑنے سے جناب قاسمؑ کی ادھر کی پسلیاں اُدھر اور

اُدھر کی پسلیاں اِدھر آ گئی تھیں۔ ہڈیاں چور چور تھیں۔ لاش اس قابل ہی نہ تھی کہ اُٹھا کر لائی جا سکے۔ امام حسینؑ نے زمین پر چادر پھیلائی۔ اور اس میں جناب قاسمؑ کی لاش کو رکھا۔ اس طرح گٹھری میں باندھ کر لاش کو خیموں میں لائے۔ ماں نے دیکھا تو چیخ کر لاشے پر گر پڑی۔ ہائے قاسمؑ ہائے دولہا قاسمؑ کی صدائیں عورتوں میں بلند تھیں۔ امام حسینؑ سر جھکائے کھڑے تھے۔

اَلَا لَعْنَتُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۃ

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۃ

☆☆☆

نویں مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۃ

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۃ (صلوات)

(اے رسولؐ!) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ کا معاوضہ سوائے اپنے اقرباء کی محبت کے اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔

اگر یہ آیت نازل نہ ہوتی تب بھی جناب رسولؐ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ایسی ہے کہ جو بھی انھیں مانے گا۔ ان سے محبت ضرور کرے گا۔ اور محبت کا یہ طریقہ ہے کہ جب کوئی کسی پر احسان کرتا ہے تو وہ اس سے محبت کرتا ہے اور محسن کے عزیز و اقارب سے بھی محبت کرتا ہے کیونکہ اگر کوئی کسی سے محبت کرے اور اس کے عزیز و اقارب کا دشمن ہو تو یہ کس کام کی محبت ہوگی۔

آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسولؐ کے اقربا کا مرتبہ بلند کرنا مقصود ہے ورنہ لوگ یہ کہہ دیتے کہ جب رسولؐ کو رسولؐ مان لیا تو اب ان کے اقربا چاہے اچھے ہوں یا بُرے ہوں ہمیں تو رسولؐ کے لحاظ میں ان کی محبت کرنی ہی پڑے گی۔ اِس سے رسولؐ کے

اقربا ہلکے درجے کے معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا آیت نے بتا دیا کہ رسولؐ کے اقربا کا درجہ اتنا بلند ہے کہ وہ تبلیغ رسالت کا معاوضہ لینے کے حقدار اور مختار ہیں اگر تم ان سے محبت کرو گے تو وہ رسولؐ کے لحاظ میں نہیں ہوگی بلکہ تبلیغ کا معاوضہ جو تم پر چڑھا ہوا ہے وہ ادا کرو گے!

اگر کوئی ہمارے وقت پر کام آئے اور ہمیں کچھ قرضہ وغیرہ دے دے تو ہم اس کے احسان مند ہو جاتے ہیں اور اس کے عزیزوں تک سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جب ہم اس کی رقم واپس کرتے ہیں تو ہر عزیز کو نہیں دیتے بلکہ قریب سے قریب کا عزیز دیکھتے ہیں۔ اگر اس کا بیٹا موجود ہو تو بیٹے کے موجود ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو نہیں دیتے۔ اور اگر کئی بیٹے ہوں تو ان میں بھی ہر ایک کو نہیں دیتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آوارہ تو نہیں ہے۔ جب دنیاوی ادائگی کا یہ حال ہے تو پھر تبلیغِ رسالت کا معاوضہ دیتے وقت کیوں نہ عزیزوں پر غور کیا جائے۔

بیٹے سے زیادہ کوئی کسی کا حقدار نہیں ہوتا۔ رسولؐ اللہ کے بظاہر کوئی بیٹا نہیں ہے۔ لیکن اگر قرآن سے پوچھا جائے تو رسولؐ اللہ کے کوئی بیٹا ہے یا نہیں تو قرآن کہتا ہے کہ ایک نہیں بلکہ رسولؐ کے دو بیٹے ہیں۔ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ جب نجران کے نصاریٰ نے یہ نہ مانا کہ جنابِ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے نہیں تھے تو خدا نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ تم اپنے بیٹوں کو لاؤ۔ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں۔ تم اپنی عورتوں کو لاؤ ہم اپنی عورتوں کو لائیں۔ تم اپنے نفسوں کو لاؤ ہم اپنے نفسوں کو لائیں اور پھر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت پڑھ دیں۔

آیت میں بیٹوں، عورتوں اور نفسوں کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور عربی میں قاعدہ ہے کہ ایک کے لئے واحد دو کے لے تثنیہ اور دو سے زائد کے لئے جمع کا صیغہ آتا ہے۔ لیکن یہاں رسولؐ اللہ بیٹوں کی جگہ حسنؑ اور حسینؑ کو لے گئے۔ یعنی جمع کی جگہ تثنیہ کو لے گئے۔ معلوم ہوا آیت میں تو بہت سے بیٹوں کی گنجائش تھی لیکن رسولؐ کے پاس دو سے زائد بیٹے نہیں تھے۔ اسی طرح آیت میں بہت سی عورتیں لے جانے کی گنجائش

ہے لیکن جب رسولؐ کے پاس ایک عورت کے سوا اور کوئی عورت نہ ہو تو وہ کس کو لے جائیں۔ نفسوں میں بھی، اگر علیؑ کے سوا کوئی اور نفس ہوتا تب ہی تو رسولؐ اُسے مباہلے میں لے جاسکتے تھے۔

آیئے! رسولؐ ہی سے پوچھیئے کہ یہ آپ کے بیٹے ہیں یا نواسے ہیں۔ ارشاد ہوگا کیسے بیٹے اور کیسے نواسے: اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَاَنَامِنَ الْحُسَیْن۔ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اگر حسینؑ نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا۔ آپ کہیں گے کہ عجیب رشتہ بتا دیا۔ یہ الفاظ محبت کے تقاضے میں نکلے ہیں یا قرآن کے مطابق ہیں۔ قرآن رسولؐ کی شان بیان کرتا ہے:۔ مَایَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ رسولؐ اپنی خواہش سے کوئی کلام نہیں کرتا ہے جب تک کہ اس پر وحی نازل نہ ہو۔

معلوم ہوا، رسولؐ کا کلام یا قرآن ہوسکتا ہے یا وحی کی تفسیر جسے حدیث کہتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَاَنَامِنَ الْحُسَیْن کی تائید میں کوئی آیت ہونی چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ خدا کلمہ کی مثل بیان کرتا ہے کہ پاک کلمہ ایک درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اُس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ وہ اللہ کے حکم سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ کلمہ میں ہوں اور اُس درخت کی جڑ میں ہوں اور شاخیں علیؑ و فاطمہؑ ہیں اور میوے حسنؑ و حسینؑ ہیں۔ اس کے پتے اُن کے شیعہ ہیں۔ آیت میں پھل کا ذکر ہے مگر پتوں کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر رسول اللہؐ نے یہ کیسے فرمایا کہ اس درخت کے پتے اُن کے شیعہ ہیں۔

خدا کے کلام میں کوئی لفظ زیادہ یا کم نہیں ہوتا ہے۔ فطری قانون ہے کہ جس درخت پر پھل آتا ہے اس پر پتے ہونے ضروری ہیں۔ ہم نے بارہا ایسے درخت دیکھے ہیں کہ جن کی صرف جڑ زمین میں گڑی ہے اور ان کے کوئی شاخ وغیرہ نہیں ہے۔ اسی طرح

آپ شاخوں والے سیکڑوں درخت دیکھتے ہیں مگر ان پر پھل لگا ہوا نہیں ہوتا لیکن ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آسکتا کہ کسی درخت پر پھل لگے ہوں اور اس پر پتے نہ ہوں بلکہ پتے اتنے ہوتے ہیں کہ پھل چھپ جاتے ہیں۔ اِس لئے خدا نے پھل کے بعد پتوں کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ (صلوات)

قدرت کے یہاں سے جو غذا درخت کو ملتی ہے وہ جڑ کو دی جاتی ہے۔ جڑ اس غذا کو شاخوں تک پہنچاتی ہے پھر شاخیں اس کو مجتمع کر کے پھل کو پیش کر دیتی ہیں اور کچھ اس میں سے پتوں کے حلق میں ٹپکا دیتی ہیں۔ مگر صرف ان پتوں تک غذا پہنچتی ہے جو شاخ کے دامن سے لپٹے ہوئے ہوں اور بارش یا آندھی آئے تو دامن نہ چھوڑیں۔ اگر پتے شاخ کا دامن چھوڑ دیں اور جڑ سے آکر لپٹ جائیں اور ہر وقت جڑ کی صحبت میں رہیں تو جڑ ان کو کچھ نہ دے گی۔ پتے براہِ راست جڑ سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ جڑ تو صرف شاخوں کو غذا دیتی ہے۔ جو پتے شاخوں سے لپٹے رہتے ہیں ان کو جڑ کا فیض پہنچتا ہے۔

اگر پتے شاخوں سے ٹوٹ کر جڑ کے پاس جمع ہو جائیں اور بارش ہو اور وہ پتے بھیگ بھی جائیں تب بھی ان کو غذا نہیں ملے گی۔ وہ خشک ہو جائیں گے۔ اور ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو پتے درخت سے ٹوٹ کر نیچے گر جاتے ہیں اور خشک ہو جاتے ہیں، ان کو غریب عورتیں یا بھٹیاری جھاڑو سے جمع کر کے لے جاتی ہیں اور چولھے یا بھاڑ میں جھونک دیتی ہیں۔ جڑ کو اُن کی کوئی پروا نہیں ہوتی اور نہ شاخیں ان کا خیال کرتی ہیں۔

البتہ وہ پتے جو شاخوں کو چھوڑ کر نہیں جاتے اور ان سے وابستہ رہتے ہیں۔ شاخیں ان کو غذا بھی دیتی ہیں اور ان کی حفاظت بھی کرتی ہیں۔ اگر کوئی شاخ پر لگے ہوئے پتوں کو توڑتا ہے تو کھینچنے پر شاخ بھی جھک جاتی ہے اور پتوں کو جانے نہیں دیتی بلکہ بعض اوقات خود ساتھ ٹوٹ جاتی ہے۔ اور ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ درخت کا مالک بھی شاخ پر لگے ہوئے پتوں کو توڑنے سے منع کرتا ہے اور توڑنے والے کو سزا دیتا ہے۔ معلوم ہوا۔ اُسی پتے کی قدر و منزلت ہے جو شاخ سے لپٹا رہے اور اسے چھوڑ کر نہ بھاگے۔

اب سُنیئے۔ الکلمۃ طیبہ ایک درخت ہے جس کی جڑ محمدؐ، شاخیں علیؑ و فاطمہؑ اور پھل

حسنؑ و حسینؑ ہیں۔ ہر درخت کی جڑ کہہ سکتی ہے کہ میرا وجود پھل سے ہوا ہے اگر پھل نہ ہوتا تو درخت بھی نہ ہوتا۔ اور ہر پھل بھی کہہ سکتا ہے کہ میرا وجود درخت کی وجہ سے ہے۔ اگر درخت نہ ہوتا تو پھل بھی نہ ہوتا۔ معلوم ہوا درخت پھل کی وجہ سے ہے اور پھل درخت کے ذریعے سے ہے۔ اسی طرح رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ کا مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ حسینؑ اپنے نانا رسولؐ اللہ سے ہیں لیکن اَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ کا مطلب یہ ہے کہ اگر حسین نہ ہوتے تو میری تبلیغ رسالت مٹ جاتی۔ چونکہ اسلام کا قیام امام حسینؑ کی وجہ سے ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ میں حسینؑ سے ہوں۔

جب عالم ارواح میں خدا نے سب کے سامنے کچھ آزمائشیں اور قربانیاں پیش کیں کہ پہلے انھیں منظور کرو۔ تب خلقتِ آدمؑ وجود میں آئے گی۔ کیونکہ حضرت آدمؑ کو ایسی سرزمین میں بھیجا جانا تھا جہاں شیطان گمراہ کرنے والا تھا۔ لہذا ضروری تھا کہ پہلے بخششِ آدم کا انتظام ہو جائے۔

جناب آدمؑ کی روح بڑھی۔ پالنے والے! میری آزمائش کر لے۔ میں انسانوں کی بخشش کے لئے جنت چھوڑ دوں گا۔ ارشاد ہوا۔ جنت چھوڑنے سے کیا ہوتا ہے تم تو زمین پر جا کر روؤ گے اور صبر نہ کر سکو گے۔ جناب نوحؑ کی روح بڑھی۔ پروردگار! میں آزمائش کے لئے تیار ہوں۔ میں طوفان میں بیٹے کو غرق کرا دوں گا مگر اُمت کو بچا لوں گا۔ حکم ہوا ایسے بیٹے کو غرق کرانے سے کیا فائدہ جس میں دنیا کو غرق کرا دو۔ بات تو جب ہے کہ دنیا پر آنچ نہ آئے اور اپنا بیٹا غرق کرا دو۔ حضرت ابراہیمؑ کی روح آگے آئی۔ عرض کیا۔ اے معبود! بیٹے کی قربانی "میں" دوں گا اور دُنیا پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ جواب ملا۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیٹے کی قربانی دینا اُمت کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔ جناب موسیٰؑ کی روح پیش ہوئی۔ پروردگار کھلی آنکھوں سے دریائے نیل میں چھلانگ لگا دوں گا۔ مگر اُمت کو بخشوا دوں گا۔ آواز آئی۔ کہاں چھلانگ لگاؤ گے۔ تمہارے آدمی تو یہاں تک کہیں

گے کہ پانی کی دیوار میں کھڑکیاں لگا دے تا کہ ہمیں اطمینان ہو جائے کہ ہمارے ساتھی بھی بخیریت چل رہے ہیں اور غرق نہیں ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کی روح سامنے آئی۔ اے خدا اور اے خالق! نہ آنکھوں پر پٹی باندھوں گا اور نہ دریا ہو گا کہ کھڑکیوں کا مطالبہ کروں گا۔ میں تیری راہ میں سولی پر چڑھ جاؤں گا۔ جواب دیا۔ بس اکیلے سولی پر چڑھو گے۔ چلو، ہم تمہیں وہاں سے اُٹھا کر بخیریت عرش چہارم پر پہنچا دیں گے۔ امام حسینؑ کی روح بڑھی۔ پالنے والے! ایک کی قربانی مانگتا ہے۔ بہتر کی قربانی دوں گا۔ جنت نہ سہی، نانا کا مدینہ چھوڑوں گا، اُمت کو غرق نہیں کروں گا بلکہ زیر خنجر اُمت کے لئے دُعا کروں گا۔ آنکھوں پر پٹی نہیں باندھوں گا بلکہ بیٹے کے سینے سے برچھی کا پھل نکالوں گا۔ دریا میں چھلانگ نہ سہی تین دن کا پیاسا دُنیا سے جاؤں گا۔ سولی پر نہ سہی نیزے پر بلند ہوں گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی دوں گا۔ بہن زینبؑ کی چادر دوں گا، سکینہؑ کے گوشوارے دوں گا اور علی اصغرؑ کا گلا دوں گا۔

خدا نے یہ قربانی منظور فرمائی۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ کی خلقت وجود میں آئی۔ اگر حسینؑ یہ قربانیاں منظور نہ کرتے تو بشر پیدا نہ ہوتا اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وجود بھی دنیا میں نہ آتا۔ اس لئے آپؐ نے فرمایا: وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ اور میں حسینؑ سے ہوں۔

یہ تو عالمِ ارواح کا واقعہ تھا۔ اب ذرا دُنیا کے واقعات دیکھئے۔ جناب ابراہیمؑ کو جناب اسمٰعیلؑ کے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ آپ اُسے بجالائے اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری چلائی۔ دنبہ کے خون کی دھار ہاتھ پر پڑی اور وہ ثابت قدم رہے تو خدا نے ارشاد فرمایا: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اے ابراہیمؑ تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ۔ بے شک ہم اس طرح آزما کر اپنے بندوں کو بدلہ دیتے ہیں۔ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ۔ یقیناً یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔ ہم نے اسے ایک عظیم قربانی سے بدل دیا۔ وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ۔ اور ہم نے اسے آنے والے کے لئے اُٹھا رکھا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی قربانی قبول ہوئی مگر یہ قربانی ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک بڑی قربانی ذبح عظیم سے بدل دی گئی۔ بظاہر حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ دُنبہ ذبح ہوا تھا لیکن دُنبہ کی قربانی حضرت اسمٰعیلؑ سے عظیم نہیں ہو سکتی۔ عظیم کا لفظ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کو گھٹا رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ قربانی حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے بڑھی ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ ذات ایسی ہونی چاہیئے جو حضرت اسمٰعیلؑ کی نبوت، امامت اور قربانی سب پر افضل مانی جائے۔ جناب اسمٰعیلؑ کی نسل میں سرکار دو عالم کے سوا کوئی نبی نہیں ہوا۔ اور رسولؐ کی نسل میں امام حسینؑ سے زیادہ عظیم قربانی نہیں ہے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ کسی چیز کا فدیہ اس کے مقابلے میں عظیم نہیں ہوا کرتا بلکہ اس سے کم درجہ کی چیز کو فدیہ دے کر عظیم چیز کو بچایا جاتا ہے۔ آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی شخص نے اپنی بکری کو بچانے کے لئے اپنے لڑکے کا فدیہ دیا ہو۔ پھر حضرت اسمٰعیلؑ کا فدیہ عظیم کیوں ہے۔ اگر حضرت اسمٰعیلؑ سے فدیہ عظیم ہے تو اُن کو کیوں بچایا جا رہا ہے بلکہ اس عظیم چیز ہی کو بچانا چاہیئے تھا۔

معلوم ہوا حضرت اسمٰعیلؑ میں کوئی نہ کوئی راز ایسا ہے جسے بچانے کے لئے یہ ذبحِ عظیم بھی فدیہ دیا جا رہا ہے۔ اور وہ ہمارے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ہے کیونکہ آپ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے تھے۔ اگر جناب اسمٰعیلؑ کو نہ بچایا جاتا اور ذبح کر دیا جاتا تو حضورؐ پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ اِس لئے یہ قربانی ملتوی کر دی گئی۔ چونکہ امام حسینؑ رسولؐ اللہ سے کم درجہ پر تھے اِس لئے فدیہ قرار دیئے گئے اور حضرت اسمٰعیلؑ سے بلند تھے اِس لئے ذبحِ عظیم کہا گیا۔

رسولؐ اللہ جانتے تھے کہ حسینؑ نے اپنی قربانی پیش کر کے مجھے دنیا میں آنے کا موقع دیا ہے لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ میں بھی حسینؑ پر کوئی فدیہ قربان کروں۔ ایک دن آپ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک زانو پر آپ کے فرزند جناب ابراہیم بیٹھے تھے اور دوسرے زانو پر امام حسینؑ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت جبرائیلؑ نازل ہوئے۔ عرض کی یا رسولؐ اللہ! خدا ارشاد فرماتا ہے کہ ان دونوں فرزندوں کا جمع ہونا خلافِ مصلحت ہے لہٰذا ایک فرزند کو

دوسرے پر قربان کر دو۔

جناب ابراہیمؑ فرزند تھے اور امام حسینؑ نواسے تھے۔ پھر جناب ابراہیمؑ اکلوتے تھے اور امام حسینؑ کے دوسرے بھائی امام حسنؑ بھی تھے۔ اگر امام حسینؑ کو قربان کر دیا جاتا تو حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کی نسل چل سکتی تھی اور حضرت ابراہیمؑ کے باقی رکھنے سے محمدؐ کی نسل بھی رہتی مگر آپؐ یہ جانتے تھے کہ ابراہیم میری بشریت کا بیٹا ہے اور حسینؑ میری رسالت کا بیٹا ہے اور حسینؑ میری رسالت کا فرزند ہے۔ حسینؑ کی وجہ سے بنی آدم دنیا میں آئے ہیں اور حسینؑ ہی کے فدیے سے میں جناب اسمٰعیلؑ کے صلب میں بچا ہوں۔ لہٰذا آپ نے اپنے بیٹے ابراہیمؑ کو فدا کر دیا۔ جناب ابراہیمؑ کو بخار ہوا اور تیسرے روز وہ راہیِ جنت ہو گئے۔

جناب فاطمہؑ نے دیکھا کہ میرے بابا کا وجود حسینؑ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر بابا نہ ہوتے تو میں بھی نہ ہوتی۔ لہٰذا آپ نے جناب زینبؑ کو تیار کیا اور وصیت فرمائی کہ حسینؑ کو تنہا نہ چھوڑنا۔ جدھر جائیں تم بھی ساتھ ساتھ جانا۔ یہ ہی خیال امام حسنؑ کو تھا۔ آپ نے جناب قاسمؑ کو فدیہ بنایا اور وصیت نامہ لکھ کر ان کے بازو پر تعویذ باندھ دیا۔ حضرت علیؑ کو بھی اپنے فدیے کا فکر دامنگیر ہوا۔ آپ نے جناب عقیلؑ کو بلایا۔ جناب عقیلؑ عرب کے نسل جاننے والوں میں بہت ماہر تھے۔ حضرت علیؑ نے اُن سے کہا کہ میرے بیٹے حسینؑ پر کربلا میں سخت وقت آنے والا ہے اور میں اُسوقت دنیا میں نہ ہوں گا۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ کسی ایسے بہادر خاندان میں شادی کروں جس سے ایسا فرزند پیدا ہو جو میری طرف سے کربلا میں حسینؑ کا فدیہ ہو۔

جناب عقیلؑ نے سب سے بہادر قبیلے کے سردار جناب حزام کی بیٹی کا نام لیا اور حضرت علیؑ کی شادی ان سے ہو گئی۔ جناب اُم البنینؑ صاحب معرفت بی بی تھیں، جب باپ کے گھر سے رخصت ہو کر حضرت علیؑ کے گھر آئیں تو حجرے میں داخل نہیں ہوئیں بلکہ چوکھٹ پر بیٹھ گئیں اور حسنؑ و حسینؑ سے کہا۔ بچو! میں تمہاری ماں بن کر نہیں آئی بلکہ میں تمہاری کنیز بن کر آئی ہوں اور خدمت کرنے آئی ہوں۔ ان سے چار بیٹے حضرت عباسؑ،

عبداللہ، جعفر اور عثمان بن علیؑ پیدا ہوئے۔

جب جناب عباسؑ بہت بچے تھے۔ ایک دن حضرت علیؑ کے زانو پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت علیؑ نے گنتی یاد کرانی شروع کی اور فرمایا: بیٹا! کہو واحد" جناب عباسؑ نے کہا واحد"۔ پھر فرمایا۔ کہو اِثْنَیْنِ یعنی دو"۔ جناب عباسؑ نے سر اٹھایا اور باپ کی طرف دیکھا۔ بابا جان! جس زبان سے "ایک" کہا اس زبان سے دو کیونکر کہوں۔ مطلب یہ تھا کہ خدا ایک ہے۔ دو کیونکر کہوں۔ حضرت علیؑ کو اتنا پیار آیا کہ سینے سے چمٹا لیا۔

جب ذرا بڑے ہوئے تو ایک دن باہر سے کھیل کر گھر میں آئے۔ ماں نے پیار میں مذاق سے پوچھا۔ عباسؑ! یہ تو بتاؤ کہ تمہیں امام حسینؑ نے کتنے میں خریدا ہے جو ہر وقت ان کو آقا آقا کہتے رہتے ہو؟ جناب عباسؑ نے بھولی بھالی زبان میں جواب دیا۔ اماں جان! جتنے میں آپ کو جناب فاطمہؑ نے خریدا ہے کیونکہ آپ بھی تو اپنے آپ کو ان کی کنیز کہتی رہتی ہیں۔ جناب اُم البنین ہنس پڑیں۔

جب حضرت عباسؑ کی عمر تقریباً پندرہ سال کی ہوئی تو حضرت علیؑ کو جنگِ صفین درپیش آگئی۔ مخالف گروہ کے پاس اسی ۸۰ ہزار کا لشکر تھا۔ حضرت علیؑ جنگ کو گئے تو ان کے ساتھ جناب عباسؑ بھی جنگ میں چلے گئے۔ جناب عباسؑ کو حضرت علیؑ فنونِ جنگ سکھایا کرتے تھے۔ جب جنگ زوروں پر ہوئی تو حضرت علیؑ کو خیال آیا کہ کربلا میں میں نہیں ہوں گا۔ آج صفین میں لڑا کر دیکھوں کہ عباسؑ کربلا میں کس طرح لڑے گا۔ لہٰذا جناب عباسؑ کو لڑنے کے لئے بھیجدیا اور چہرے پر نقاب ڈال دی۔ پھر پیچھے پیچھے جنگ دیکھنے کے لئے خود بھی اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر چل دیئے اور فوجیوں میں جا ملے تاکہ پہچانے نہ جائیں اور جناب عباسؑ کی جنگ دیکھ سکیں۔

یہ نقاب پوش لڑکا نیزہ ہلاتا ہوا میدانِ کارزار میں پہنچا اور شیر کی طرح ھَلْ مِنْ مُبَارِزْ کی صدا بلند کی جس سے میدان گونج اٹھا۔ معاویہ نے ایک مشہور پہلوان یزید ابن اشعث کو مقابلے کا حکم دیا۔ اس نے کہا لوگ مجھے ایک ہزار پہلوانوں کے برابر سمجھتے ہیں اور آپ مجھے اس لڑکے سے لڑنے کے لئے بھیج رہے ہیں! میرے سات فرزند ہیں ان

میں سے ایک کو بھیجے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر بڑے بیٹے کو اشارہ کیا۔ وہ جھومتا ہوا نقاب پوش کے مقابلے میں آیا اور آتے ہی بڑے زور سے نیزے کا ایک وار کیا۔ نقاب پوش نے نہایت چابکدستی سے وار کو رد کرتے ہوئے اس کے ایک نیزہ مارا اور وہیں ڈھیر کر دیا۔ یہ دیکھ کر ابنِ اشعث غصے میں بھر گیا۔ بیٹے کا داغ لگا، فوراً دوسرے بیٹے کو بھیجا۔ ذرا دیر ہوئی تھی کہ وہ بھی مارا گیا۔ پھر تیسرا بیٹا چلا، اس کے بعد چوتھا، غرض جو آتا رہا، ختم ہوتا ہے۔ اب تو ابن اشعث کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ نیزہ لئے ہوئے بڑے غصے سے مست ہاتھی کی طرح جھومتا اور چنگھاڑتا ہوا آیا اور بڑی تیزی سے حضرت عباسؑ پر نیزے کا وار کیا۔ آپ نے اس کے وار کو تلوار پر روکا اور فوراً ایک وار اس کے سر پر لگایا۔ وار بھرپور پڑا۔ اور اس کا بھاری بھرکم جسم مٹی کے تودے کی طرح زمین پر آ رہا۔ ٹھنڈا ہو گیا۔

ابنِ اشعث کے قتل کے بعد لوگوں میں ہراس پھیل گیا اور کسی کو نقاب پوش کے مقابلے میں آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ ھٰـذَا عَـلِـیٌّ"۔ ھٰذَا عَلِیٌّ"۔ "ارے! یہ تو علی کے لڑ رہے ہیں۔ علی لڑ رہے ہیں۔" یہ دیکھ کر حضرت علی قلبِ لشکر سے مسکراتے ہوئے نکلے اور اپنا گھوڑا بڑھا کر حضرت عباسؑ کے گھوڑے کے برابر لائے اور اُن کے چہرے پر سے نقاب اُلٹ دی۔ اور فرمایا: ھٰـذَا قَـمَـرُ بَنِیْ ھَاشِمْ۔ ارے اندھو! دیکھو میں کہاں ہوں۔ یہ تو قمر بنی ہاشم ہیں۔

جب حضرتِ عباسؑ جوان ہوئے تو اتنے خوبصورت اور قد آور جوان تھے کہ آپ اور حضرت علی اکبرؑ جب مدینے کے بازاروں سے گزرتے تھے تو انھیں دیکھ کر لوگوں کا اِن پر سے نظر ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا اور دیر تک دیکھتے رہتے تھے۔

جب مولائے مشکل کشا حضرت علی کا وقتِ رحلت آیا تو آپ نے اپنے سب بیٹوں کو بلایا اور امام حسنؑ کے سپرد کیا لیکن حضرت عباسؑ کا ہاتھ امام حسینؑ کے ہاتھ میں دیا اور رو کر فرمایا۔ عباسؑ! اپنے آپ کو حسینؑ کا غلام سمجھنا۔ میں نے تمھیں کربلا کے لئے ذخیرہ کیا ہے۔ تم میری طرف سے فدا ہو جانا۔

جب ولید، حاکم مدینہ نے امام حسینؑ کو طلب کیا تو اٹھارہ بنی ہاشم آپ کے ساتھ

ہو لئے تھے۔ لیکن امام حسینؑ نے سب کو ولید کے دروازے پر روک دیا۔ اور فرمایا کہ اس نے مجھے تنہا بلایا ہے۔ مروان نے ولید سے کہا کہ حسینؑ کا سر لینے کے لئے اس سے بہتر موقع نہیں آئے گا۔ امامؑ نے بلند آواز میں فرمایا۔ تیری کیا مجال ہے جو تو میرا سر لے سکے۔ آواز کا بلند ہونا تھا کہ تمام بنی ہاشم اندر دوڑ پڑے۔ سب سے پہلے حضرت عباسؑ داخل ہوئے اور مروان کو پکڑ کر اُٹھالیا اور چاہا کہ زمین پر پٹخ کر ماردیں۔ لیکن امامؑ نے روک دیا کہ عباسؑ! ہم جنگ میں اپنی طرف سے پہل کرنا نہیں چاہتے۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ کربلا میں پہنچ گئے اور فوجوں پر فوجیں آآکر جمع ہو گئیں۔ تو ابن زیاد نے کربلا کے سپہ سالار ابن سعد کو ایک سخت حکم بھیجا کہ یا تو جلد امام حسینؑ کا سر قلم کر کے بھیج دے ورنہ تمام لشکر چھوڑ کر شمر کے حوالے کر دے۔ یہ حکم دیکھ کر ابن سعد لشکر لے کر امام حسینؑ کے خیموں کی طرف حملے کے لئے چلا۔ یہ محرم کی نویں تاریخ اور شام کا وقت تھا۔ جب امام حسینؑ نے لشکر کو آتے دیکھا تو جناب عباسؑ سے فرمایا۔ بھائی! ان لوگوں سے جا کر پوچھو کہ یہ کیا چاہتے ہیں۔ جناب عباسؑ، امام حسینؑ کے ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ فوراً جناب عباسؑ کوئی بیس سواروں کو لے کر جن میں زہیر ابن قین اور حبیب ابن مظاہر بھی تھے، لشکر کے سامنے آئے اور انھیں روک کر سبب پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ یا تو امام حسینؑ بیعت کر لیں ورنہ ہم لڑیں گے۔ جناب عباسؑ نے کہا کہ اس بات کا جواب میں ابھی امام حسینؑ سے لا کر دیتا ہوں۔ جناب عباسؑ گھوڑا اڑا کر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اُن سے کہو کہ سوچنے کے لئے ایک دن کی مہلت دے دیں اور اگر وہ واپس نہ جائیں تو انھیں دفع کر دو۔ جناب عباسؑ گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے واپس آئے اور انھیں کل تک کے لئے لوٹا دیا۔

شام ہوئی تو شمر نے جناب عباسؑ کو توڑنے کے لئے ایک چال چلی۔ اس نے حاکم سے کہا کہ عباسؑ کی والدہ ہمارے قبیلے کی ہیں، ان کے بیٹے حسینؑ کے ساتھ ہیں لہٰذا میرے بھانجوں کے لئے امان لکھ دی جائے۔ اس نے امان لکھ دی۔ شمر امان نامہ لے کر گھوڑے پر سوار خیام حسینؑ کی طرف آیا۔ اور جناب عباسؑ کو پکارا۔ آپ اس کے پاس

جانا نہیں چاہتے تھے لیکن امام حسینؑ نے فرمایا کہ جا کر سُن تو لو کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ جناب عباسؑ شمر کے پاس گئے اور پوچھا۔ کیا بات ہے؟ اس نے فریب دینے کے لئے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ آپ میری بہن کے بیٹے ہیں۔ میں آپ سب بھائیوں کے لئے امان لایا ہوں۔ جناب عباسؑ نے جھڑک کر جواب دیا۔ خدا کی تجھ پر لعنت، تیری امان پر لعنت، تو ہمارا ماموں بن کر ہمارے لئے تو امان لایا ہے مگر رسولؐ کے فرزند کے لئے امان نہیں۔ شمر شرمندگی کے عالم میں واپس چلا گیا۔

جب شب عاشور حضرت عباسؑ خیموں کی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے تھے تو زہیر ابن قین آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ اے فرزند امیر المومنین! میں آپ سے ایک بات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا۔ ضرور بیان کرو۔ پھر یہ وقت ہاتھ میں نہیں آئے گا۔ عرض کی۔ اے ابوالفضلؑ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے والد بزرگوار نے اپنے بھائی عقیل سے کہا تھا کہ میں ایک بہادر خاندان میں شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس سے میرے ایسا فرزند پیدا ہو جو میرے حسینؑ کا قوت بازو ہو۔ جناب عقیل نے ان کی شادی آپ کی والدۂ گرامی سے کرادی تھی۔ یاد رکھیے! اسدُ اللہ نے آپ کو اسی دن کے لئے ذخیرہ فرمایا ہے۔

یہ سُننا تھا کہ جناب عباسؑ نے گھوڑے پر جوش شجاعت میں ایک انگڑائی لی کہ تسمۂ رکاب ٹوٹ گئے اور فرمایا: یَا زُهَيْرُ اَتُشَجِّعُنِيْ۔ اے زہیر کیا مجھے شجاعت دلاتے ہو؟ کل دیکھ لینا کہ کیسی جنگ کرتا ہوں۔ زہیر نے محبت سے پوچھا کہ مولا! کیسی جنگ کا ارادہ ہے؟ بہادری سے فرمایا۔ صبح کو ملک شام کا تختہ الٹ دوں گا۔ اور شام کو ملک شام سے یزید کا سر لاکر امامؑ کے قدموں میں پھینک دوں گا۔ یہ فرما رہے تھے کہ پیچھے سے امام حسینؑ تشریف لائے۔ کچھ کچھ باتیں آپ نے بھی سُن لی تھیں۔ التجا کے لہجے میں فرمایا۔ عباسؑ! مجھے یہاں مظلومیت سے مقابلہ کرنا ہے۔ اگر تمہارا یہ ارادہ ہے تو مدینے واپس چلے جاؤ! اے عباسؑ! یہ جلال کا وقت نہیں ہے۔ حضرت عباسؑ نے گردن جھکالی اور نظریں نیچے کئے ہوئے غمگین آواز میں عرض کیا۔ آقا! معاف فرمایئے، میں حکم کی تعمیل

کروں گا۔ اگر آپ حکم دیں تو ابھی اپنا سر خود کاٹ کر اشقیاء کو دے دوں، مگر آپ واپسی کا حکم نہ فرمایئے۔ یہ غلام آپ کے قدموں کو نہیں چھوڑے گا۔

معزز سامعین! یہ انسان کی فطرت ہے کہ بہادر کے لئے فوج میں در آنا اور چمکتی ہوئی تلواروں، برچھوں اور نیزوں کو کھانا آسان ہوتا ہے لیکن اگر کسی جری کے بچے پیاسے ہوں اور دشمنوں نے پانی پر پہرے بٹھا دیئے ہوں تو ایک دلیر آدمی کے لئے لڑنے سے رُک جانا اور بچوں کی اَلْعَطَش کی صدائیں سُن کر صبر کرنا کہیں زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ حضرت عباسؑ کے لئے صبر کے مقابلے میں لڑ کر شہید ہو جانا کہیں زیادہ آسان تھا۔ لیکن حضرت عباسؑ کی وفا کو دیکھئے کہ آپ کو امام نے کئی بار ایسے موقعوں پر روکا ہے کہ آپ تڑپ اُٹھے اور اس امر کو آسان سمجھا کہ اپنی تلوار سے اپنا سر اُتار دیں۔ لیکن آقا کے حکم کی ہر موقع پر تعمیل کی۔

حضرت عباسؑ نے جنگ کے لئے سب سے پہلے اجازت طلب کی تھی لیکن امام حسینؑ اجازت نہیں دیتے تھے۔ جب سب عزیز و انصار شہید ہو چکے تو حضرت علیؑ اکبر اجازت مانگ رہے تھے۔ جناب عباسؑ بے چین ہو گئے۔ پریشان ہو کر دوڑے۔ اے آقا! یہ نہیں ہو سکتا کہ غلام کے ہوتے ہوئے شہزادہ جنگ کو چلا جائے۔ میں امیر المومنین کو کس طرح منہ دکھاؤں گا۔ انھوں نے مجھے اسی دن کے لئے ذخیرہ کیا تھا۔ مجھے انھوں نے آپ کی غلامی میں دیا تھا۔ میں صبح سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ سب کو اجازت دے رہے ہیں اور مجھے اجازت نہیں دیتے۔ میرے ہاتھوں کے پلے ہوئے چاند کے سب ٹکڑے شہید ہو گئے، ان کی ماؤں نے پچھاڑیں کھائیں اور میں دیکھتا رہا۔ آخر عباسؑ کا آپ کے قافلے میں ہونے کا کیا فائدہ؟ میرے بابا مجھ پر ناراض ہو رہے ہوں گے۔

امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کا حال دیکھا تو بے قرار ہو گئے اور رونے لگے۔ بھائی کو سینے سے لگا لیا۔ عباسؑ! تمہارے دم سے بڑی تسکین ہے، بیبیوں کو بڑی ڈھارس ہے، تم میرے لشکر کے علمدار ہو۔ اگر تمہیں اجازت دے دوں تو بیبیاں بے آس ہو جائیں گی۔ میری کمر ٹوٹ جائے گی۔

جناب عباسؑ نے رو کر کہا آقا! اب میں سینے سے لگانے کے قابل نہیں رہا۔ میرے فنونِ جنگ سکھائے ہوئے سب لڑکے شہید ہو چکے ہیں۔ اب وہ لشکر کہاں ہے جس کا علمدار تھا۔ جب امام حسینؑ بہت مجبور ہو گئے تو فرمایا کہ پہلے اپنی بہن زینبؑ سے اجازت حاصل کرلو۔

حضرت عباسؑ خیمے میں آئے اور جناب زینبؑ کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے سیلاب اشک رواں تھا۔ جناب زینبؑ نے پوچھا۔ عباسؑ! کیا بات ہے۔ بھائی حسینؑ کی خیر ہے؟ رو کر عرض کیا۔ شہزادی! اب اس غلام کی عزت آپ کے ہاتھ ہے۔ اگر علی اکبرؑ شہید ہو گئے تو اپنے بابا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں صبح سے غم پر غم برداشت کر رہا ہوں۔ میرے سامنے دل کے ٹکڑے اور جان سے زیادہ پیارے شہید ہوتے جا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے تلواروں اور نیزوں میں جاتے ہیں اور جب اشقیا ان بے کسوں کو مار دیتے ہیں تو میں ان کی لاشیں اُٹھانے میدان میں جاتا ہوں۔ میرا کام تھا کہ فوجیوں کے سر اُڑاتا لیکن اپنے مہ پاروں کے لاشے اُٹھا رہا ہوں۔ بیبیوں کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں نے ان کے بچوں کی لاشیں اُٹھا اُٹھا کر ماؤں کو دی ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ سارا قافلہ جنت میں پہنچ چکا ہے بابا علیؑ انتظار کر رہے ہونگے جناب فاطمہؑ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ شہزادی! آپ کریم ابن کریم کی بیٹی ہیں۔ میری سفارش کر کے آقا سے اجازت دلوا دیجیے۔

جناب زینبؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ گلوگیر آواز میں بیان کرنے لگیں۔ بھائی عباسؑ! اب مجھے بابا کی وصیت یاد آ گئی۔ بابا علیؑ جب کوفے کے بادشاہ تھے اور میں وہاں کی شہزادی تھی تو ایک دن بابا نے مجھ سے فرمایا تھا۔ زینبؑ! تو ایک دن اس کوفے میں قید ہو کر آئے گی، تیرے ہاتھ رسی سے بندھے ہوں گے اور تیرے سر پر چادر بھی نہ ہو گی۔ سر برہنہ بازاروں میں پھرائی جائے گی۔ بیٹی! اس دن صبر کرنا اور بد دعا نہ دینا۔

بھائی عباسؑ! میں حیران تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جس زینبؑ کا عباسؑ

جیسا بھائی ہو، اس کی چادر کون چھین سکتا ہے لیکن اب مجھے یقین ہو گیا کہ تمہاری شہادت کے بعد ہم بے کس ہو جائیں گے اور جس کا جو جی چاہے گا، ہمارے ساتھ سلوک کرے گا۔

ننھی سکینہؑ نے دیکھا کہ چچا خیمے میں آئے ہوئے ہیں۔ پیاسی تھی، چچا کے پاس آ کر کہنے لگی۔ چچا جان! پانی لا دیجئے۔ پیاس برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ جناب عباسؑ نے جناب سکینہؑ کو پیار کیا اور کہا۔ بیٹی! ابھی پانی لاتا ہوں، جاؤ اپنی مشک لے آؤ۔ جناب سکینہؑ دوڑی ہوئی گئیں اور خشک مشک لے آئیں۔ مشک حضرت عباسؑ کے ہاتھ میں دی۔ اُدھر سے حضرت امام حسینؑ خیمے میں تشریف لائے۔ جناب عباسؑ مشک دکھا کر رو کر کہنے لگے۔ آقا بچے پانی کے لئے کہہ رہے ہیں اگر اجازت ہو تو نہر سے پانی لے آؤں۔ اب امام حسینؑ کیا کرتے۔ قریب ہی سکینہؑ کھڑی تھی۔ حضرتؑ نے روتے ہوئے فرمایا۔ بھائی پانی کا بہانہ اچھا ہے۔ اب ہم کیسے منع کر سکتے ہیں۔ جاؤ اور بچوں کے لئے پانی کی کچھ سبیل کرو۔

بڑی مشکل سے حضرت عباسؑ کو پانی لانے کی اجازت ملی۔ میدان میں جانے کے لئے تیار ہوئے۔ ہتھیار لگائے۔ علم لیا۔ دوشِ مبارک پر خشک مشک رکھی۔ گھوڑے کی طرف بڑھے، تمام عورتیں درِ خیمہ تک رخصت کرنے کے لئے آئیں۔ سب کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھیں اپنی بے کسی پر رو رہی تھی امام حسینؑ نے کہا بھائی عباسؑ میں تمہیں سوار کراؤں گا۔ جناب زینب بڑھیں، آپ نہیں، میں رکاب پکڑوں گی کہ فضا میں جناب فاطمہؑ کی آواز آئی۔ بیٹا حسینؑ! عباسؑ میری سکینہؑ کا سقہ ہے، اس کی رکاب سنبھالنے کے لئے فاطمہؑ آ رہی ہے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

☆☆☆

دسویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ؕ (صلواۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغِ رسالت کا معاوضہ سوائے اپنے اقرباء سے محبت کے اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔

رسولؐ اللہ کی تبلیغ جس جس پر پہنچتی رہے گی اور وہ اُنھیں رسولؐ مانتا رہے گا اس پر تبلیغ کا معاوضہ واجب ہوتا رہے گا۔ آیت نے مسلمانوں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک وہ ہیں جو معاوضہ دینے والے ہیں، اور دوسرے وہ ہیں جو معاوضہ لینے والے ہیں یا یوں کہوں کہ معاوضہ لینے کے مختار اور ہیں اور معاوضہ کے قرضدار اور ہیں۔

ارشاد ہے: کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ہ ۔اور اسی طرح ہم نے تمھیں اُمتِ وسط قرار دیا کہ تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور تم پر رسولؐ گواہ ہو۔ اس آیت نے بھی یہی بتایا کہ رسولؐ کی اُمت کے دو طبقے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن پر گواہی دی جائے گی، دوسرے وہ طبقہ جو گواہی دینے والا ہے۔ جس کی گواہی دی جاتی ہے وہ اور ہوتا ہے اور جو گواہی دیتا ہے وہ اور ہوتا ہے۔ اور تیسری ذات رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہے جو سب پر گواہ ہیں۔

کہنے والے کہہ دیتے ہیں کہ اُمتِ وسط سے مراد درمیانی زمانے والے مسلمان ہیں۔ لیکن آیت ان کی کچھ صفت بھی بتا رہی ہے کہ وہ لوگوں کے اعمال پر گواہی دینے والے ہیں۔ اور گواہ وہ ہوتا ہے جو اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ سُنی سُنائی بات کی گواہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر درمیانی زمانے والے مسلمان یہ کرامات رکھتے ہوں کہ وہ لوگوں کے اعمال اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوں، تب تو آپ اُنھیں اُمتِ وسط لیجئے۔ لیکن اگر وہ ہم جیسے ہی ہوں جنہیں دوسروں کا تو کیا، خود اپنے اعمال کا پوری طرح پتہ نہ ہو، وہ

بھلا کیسے گواہی دے سکتے ہیں اور اُمّتِ وسط کہلا سکتے ہیں۔

گواہی دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگ اس درجہ پر فائز ہوں کہ ہمارے اعمال دیکھ رہے ہوں۔ تب ہی تو وہ خدا کے سامنے گواہی دے سکتے ہیں۔۔۔ لہٰذا جب تمام انسانوں کے اعمال خدا کے سامنے پیش ہوں گے تو اُن پر اُمّتِ وسط کی گواہی لی جائے گی۔ یا یوں کہوں کہ اعمال نامے پر اگی رپورٹ خراب ہے تو جب شروع کے ریمارکس مخالف ہوں گے تو معاملہ آخر تک بگڑتا چلا جائے گا۔

خداوند عالم نے تصریح کر دی ہے کہ یہ گواہی دینے والے تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔ ارشاد ہے:۔ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔ اے رسولؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اعمال کریں۔ ان کے اعمال اللہ رسولؐ اور مومنین دیکھیں گے۔ معلوم ہوا کہ لوگوں کے اعمال دیکھنے کی قوت اللہ رسولؐ اور مومنین میں ہے اور " دیکھنے کا لفظ تینوں کے لئے ایک دفعہ آیا ہے۔ گویا جس طرح اللہ اعمال دیکھتا ہے، اسی طرح اس کا رسولؐ اور مومنین اعمال دیکھ رہے ہیں۔

قُلِ اعْمَلُوْا لوگوں سے کہو کہ عمل کریں۔ یاد رکھیے! عمل نیت پر منحصر ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ۔ اعمال نیت پر منحصر ہیں۔ وضو کے لئے نیت ضروری ہے۔ اگر ایک شخص تین چلّو کی بجائے گھڑوں پانی منہ پر ڈال لے اور وضو کے لئے نیت نہ کرے تو بتائیے! کیا اُس کا وضو ہو جائے گا؟ معلوم ہوا کہ اگر نیت نہ کرے گا تو عمل بیکار ہو جائے گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیت کو کون دیکھ سکتا ہے۔ عام انسان تو بظاہر وضو کرتے دیکھے گا۔ اسے کیا معلوم کہ وضو کرنے والے نے نیت بھی کی ہے یا نہیں۔ پھر یہ گواہی تمام انسانوں کی ہے، ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ انسان کہاں کہاں ہیں۔ سب انسانوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے، نہ کہ ان کے اعمال دیکھ لیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اُمّتِ وسط میں وہ لوگ ہیں جو اعمال کو بھی دیکھتے ہیں اور نیتوں کو بھی دیکھتے ہیں۔

خداوند عالم آگے ارشاد فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۔ پھر ہم نے خدا کی کتاب کے وارث اپنے بندوں میں سے

چُن لئے ہیں۔ لیجئے! قرآن کے وارث بھی موجود ہیں۔ وارث کے اختیارات مالک جیسے ہوتے ہیں، چاہے وہ اس کو سفید کرے یا سیاہ کرے۔ بلکہ وارث مالک ہی ہوتا ہے۔ اور مالک کی اجازت کے بغیر اس کی چیز پر تصرف نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کتاب خدا کے وارث ہیں تو اُن کی اجازت کے بغیر کتاب پڑھ بھی نہیں سکتے، اس پر عمل کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور اگر کتاب پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا معاوضہ دینا ہے تو وارث کو دیجئے۔ کیونکہ کوئی دوسرا اس کا معاوضہ لینے کا حق دار نہیں ہوسکتا۔ اب معلوم ہوا کہ رسولؐ کے اقربا کو جو تبلیغ کا معاوضہ دیا جارہا ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ خدا نے ان کو قرآن کا وارث بنایا ہے۔ ورنہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وارث کوئی اور ہوا اور معاوضہ لینے والے اقربا ہو جائیں۔ (صلوٰۃ)

خدا نے کہیں وارث کا لفظ کہہ کر سمجھایا، کہیں اُمتِ وسط کہہ کر بتایا کہیں یہ بتایا کہ یہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ تم پر گواہ ہیں اور پھر واضح طور سے شناخت کرادی۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۞ ۔ ان کا پتہ یہ ہے کہ وہ رسولؐ کے اقربا ہیں۔ دیکھو تم معاوضہ دینا۔ یہ تمہارے گواہ ہو جائیں گے۔ ان سے محبت رکھنا، قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی اجازت ہو جائے گی۔ ان کے ہو کر رہنا، ان کو رضامند رکھنا، تمہارے اعمال قابلِ قبول ہو جائیں گے۔ (صلوٰۃ)

پھر رسول اللہ نے معاوضہ ادا کرنے والوں کی ایک علامت مقرر کردی کہ جو تم سے محبت کرنے والے ہوں گے وہی معاوضہ ادا کرنے والے ہوں گے، وہی تمہاری اطاعت کرنے والے ہوں گے وہی تمہارے ہوں گے اور وہی تمہیں رضامند کرنے والے ہوں گے۔ جنہیں تمہاری محبت نہیں، وہ تمہارے نہیں ہیں۔ وہ تمہاری اطاعت نہیں کریں گے۔ وہ تمہیں رضامند نہیں کریں گے۔

علامت دیکھ کر اصل چیز کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ جب آپ رات کا اندھیرا ختم ہونے اور صبح کی روشنی پھیلتے دیکھتے ہیں تو آپ پتہ لگا لیتے ہیں کہ دن نکلنے والا ہے جب آپ کسی کے گھر سے دھواں اُٹھتا ہوا دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ آگ جل رہی ہے۔ آگ کو ہم

آگ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں جلانے کی قوت ہوتی ہے۔ اگر کوئی چیز آگ کے انگارے کی طرح دہکتی ہوئی نظر آئے اور چھونے سے وہ ہاتھ کو نہ جلائے تو وہ آگ نہیں ہے بلکہ کوئی چمکیلا پتھر یا ہیرا ہوگا۔ اسی طرح اگر برف کا گولہ ٹھنڈا نہ ہو تو وہ برف نہیں، روئی کا گالا ہوگا۔

جس طرح آگ کی علامت جلانا اور برف کی علامت ٹھنڈا کرنا ہے۔ اسی طرح محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کی خوشی میں خوش ہو اور اس کے رنج سے غمگین ہو جائے۔ جو محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور محبوب کو ایذا پہنچانے کے درپے ہے، وہ جھوٹا ہے، اس کی محبت ایک نام ہے جو خلوص سے خالی ہے، وہ کاغذ کا پھول ہے جس میں خوشبو نہیں ہے، وہ ریگستان ہے جو دور سے چمکتا ہوا ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے پانی کا دریا ہے لیکن قریب جا کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت ہے، سراب ہے، محبت کا دعوے دار بننے سے محبت حاصل نہیں ہوتی، کوئی جاہل ملا محمد فاضل نام رکھ لینے سے عالم نہیں بن سکتا۔ اگر کسی اندھے کا نام نین سکھ رکھ دیا جائے تو اُس کی آنکھوں میں روشنی نہ آئیگی لہٰذا محبت تو ان متوالوں میں نظر آتی ہے جو محبوب کی بقا کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں جو اس کی اطاعت کے لئے گوش برآواز رہتے ہیں۔ اور جو اُس کی تکلیف سُن کر بے چین ہو جاتے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: مَنْ لَا یَحْزَنُ عَلٰی مَصَائِبِنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔ جو شخص ہمارے مصائب پر غمگین نہیں ہوتا۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ طاقتِ لسانی سے آگ کے شعلوں کو ریشم کے لچھے اور بڑھیا کے سفید بالوں کو برف ثابت کرنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "امام حسینؑ کو شہادت کا درجہ ملا ہے اور اُن کا مرتبہ بلند ہوا ہے اس لئے خوشی کرنی چاہیے۔" انہیں رسولؐ کی وفات پر بھی خوشی کرنی چاہیے۔ کیونکہ حضورؐ بھی تو دنیا کی قید سے چھوٹ کر مالکِ جنت بنے تھے۔

جناب اسمٰعیلؑ خدا کے حکم سے ذبح ہو رہے تھے لیکن دُنبہ آجانے سے آپ بچ گئے۔ ان کے بچنے کی خوشی میں مسلمان چار ہزار سال سے دوگانہ پڑھ رہے ہیں اور خوشی

منا رہے ہیں۔ یہاں بھی انہیں اس پہلو کو دیکھنا چاہیئے کہ حضرت اسمٰعیلؑ شہادت کے مرتبے سے محروم ہو گئے۔ لہٰذا عید منانے کی جگہ ان کے غم میں ماتمی لباس پہننا چاہیئے تھا۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ذبح ہونے سے بچ گئے تو مسلمان عید مناتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں لیکن فاطمہؑ کا لعل اور رسول کا نور نظر کربلا کے میدان میں تین دن کا بھوکا پیاسا ذبح کر دیا گیا تو اُن کے ذبح ہو جانے پر افسوس نہیں کرتے۔ اگر بکری کے بچے کے بچنے پر خوشی ہوتی ہے تو ذبح ہو جانے پر رنج کرنا کیوں ضروری نہیں۔

معلوم ہوا محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کی خوشی میں خوش ہو اور اُس کی تکلیف سُن کر بے چین ہو جائے۔ کسی کی خوشی کے وقت رنجیدہ ہونا اور کسی کے رنج پر اظہار مسرت کرنا دشمنی کی علامت ہے۔ اور رنج و خوشی کا کوئی اثر نہ لینا کہ نہ خوشی سے غرض اور نہ رنج سے مطلب، یہ غیر ہونے کی علامت یا دلیل ہے۔

سورۂ الحمد میں ہمیں اس کی تفصیل یوں ملتی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ اے خدا! ہمیں سیدھی راہ پر قائم رکھ۔ یہ نہیں کہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت کر اس سے تو یہ ہوگا کہ ابھی ہم سیدھی راہ پر نہیں ہیں۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ ان لوگوں کی راہ چاہتے ہیں، جن پر تو نے اپنا انعام نازل فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کچھ بندے ایسے ہیں جن پر خدا کا انعام ہوتا ہے۔ یہ انعام پانے والے جو بھی ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ انعام دوستوں پر ہوا کرتا ہے غیروں پر نہیں ہوا کرتا۔

اگر آپ کسی بھی فرقے سے خدا کے نیک بندوں اور ان لوگوں کی فہرست بنوائیں جن پر خدا کا انعام نازل ہوا ہے تو کوئی فرقہ بھی حسینؑ کا نام اس فہرست سے نہیں نکال سکتا اور جو نکال دے گا تو خود اس فرقے کے نزدیک ہی یہ فہرست بیکار قرار دی جائے گی۔ امام حسینؑ کی ایسی ذات ہے کہ ہر فرقے کے نزدیک اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ کی فہرست میں ان کے قاتلوں کے نام لازمی لانے پڑیں گے کیونکہ دونوں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہو نہیں سکتے۔

معلوم ہوا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ان لوگوں کی راہ ہے جو امام

حسینؑ اور ان کے مثل لوگوں کی راہ ہے اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ اُن لوگوں کی راہ ہے جو حسینؑ کے قاتلوں یا ان کے مثل لوگوں کی راہ ہے اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ ان لوگوں کی راہ ہے جو نہ حسینؑ سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ان کے قاتلوں سے واسطہ رکھتے ہیں۔

امام حسینؑ کی محبت کا ہر فرقہ دعویٰ کر رہا ہے لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ جس طرح لوگ مسجدیں بناتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہیں اسی طرح ان دعویداروں میں امام حسینؑ کی محبت کی بھی کوئی علامت ہونی چاہیئے۔ دیکھ لیجئے کہ صرف ایک فرقہ ہے جو عزا خانے بناتا ہے، جہاں رسولؐ کے اقربا کو عوض دیا جاتا ہے، ان کی خوشی میں محفلیں کی جاتی ہیں اور ان کے رنج و مصائب میں مجلسیں برپا ہوتی ہیں۔

تبلیغ پہنچنے کا ہر فرقہ ثبوت دے رہا ہے لیکن معاوضہ ادا کرنے کا ثبوت صرف ایک فرقے کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ سَیَتَفَرَّقُ اُمَّتِیْ مِنْ بَعْدِیْ سَبْعَۃً ثَلَاثَۃً کُلٌّ "فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدٌ" میرے بعد میری اُمت کے تہتر ۷۳ فرقے ہو جائیں گے، اور ایک کے سوا سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔

یہاں رسولؐ اللہ نے اُمتی کا لفظ فرمایا ہے۔ یعنی ان کا امت میں ہونا تسلیم ہے۔ اگر یہ فرماتے کہ میری اُمت میں سے گنہگار جہنم میں جائیں گے، تب بھی تعجب کی بات ہوتی کیونکہ آپ شفیع محشر ہیں اور شَفِیْعُ الْمُذْنِبِیْنَ کہلاتے ہیں۔ اگر گنہگاروں کی شفاعت نہیں کریں گے تو کیا نیک بندوں کی شفاعت کریں گے۔ ان کو تو سفارش کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ شفاعت کی تو گنہگاروں کو ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن رسولؐ اللہ نے اُمت کا لفظ ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت میں ہونے کے باوجود جہنم میں جائیں گے۔ نیک و بد کی تصریح نہیں کی ہے۔ معلوم ہوا یہ تبلیغ کا معاوضہ نہ دینے کی سزا ہے۔ جو تبلیغ کا معاوضہ ادا کرے گا اس کے اعمال قابلِ قبول ہوں گے اور جس نے تبلیغ کا معاوضہ ہی نہیں دیا اس کے اعمال پر اجر ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی لئے فرمایا کہ بہتر فرقے جہنمی ہوں گے اور ایک فرقہ نجات پائے گا۔

روزہ، نماز، حج، زکوۃ اور مسجدیں ہر فرقے میں موجود ہیں مگر امام باڑہ صرف ایک فرقے کی خصوصیت ہے، جہاں اقربا کی خوشی میں محفلیں کی جاتی ہیں اور ان کی مصیبتوں پر نوحہ خوانی ہوتی ہے۔ محبت والوں کی یہی علامت ہے تا کہ وہ خوشی میں خوش ہوتے ہیں اور رنج میں غمگین ہوتے ہیں۔

ایک مقام پر خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا ہے۔ یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ قیامت کے دن ہر انسان کو اس کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔ اسلام کے سب فرقوں میں امام حسینؑ کی ذات پر سب کو اتفاق ہے کہ وہ سردار ہیں مگر ان کو اماموں کی فہرست میں صرف ایک فرقے نے لیا ہے اور جب ان کا نام آتا ہے تو امام کا لفظ ساتھ کہتا ہے یعنی امام حسینؑ کہتا ہے۔

اسلام کے دوسرے فرقوں نے جن جن لوگوں کو امام مانا ہے وہ اُن سب اماموں سے حضرت حسینؑ کو افضل مانتے ہیں مگر امام نہیں سمجھتے۔ قرآن کہتا ہے کہ قدرت ہر انسان کو اس کے امام کے ساتھ بلائے گی لہٰذا جو لوگ امام حسینؑ کو امام مانتے ہیں وہ ان کے ساتھ جائیں گے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ امام کو اُس کے ماننے والوں سے علیحدہ کر لیا جائے، جہاں ماننے والے جائیں گے وہیں امام بھی ساتھ جائیں گے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جہاں امام حسینؑ جائیں گے وہیں ان کے ماننے والے بھی جائیں گے۔ اب یہ بتاؤں کہ امام حسینؑ کہاں جائیں گے تو سنیئے: رسول اللہؐ کی حدیث ہے: اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ جب جنت کے سردار ہیں تو یہ ضروری ہوا کہ امام حسینؑ جنت میں لازمی ہوں گے اور چونکہ ہر فرقہ اپنے امام کے ساتھ ہوگا لہٰذا امام حسینؑ کا ماننے والا فرقہ ان کے ساتھ جنت میں جائے گا۔ (صلوات)

حیرت ہوتی ہے کہ دنیا امام حسینؑ کو سب سے افضل سمجھتی ہے مگر علامت کوئی نظر نہیں آتی۔ امام حسینؑ ستاون برس تک دنیا میں رہے۔ مگر انھیں ایک دن کے لئے بھی نہ

رسول کا جانشین سمجھا، نہ رسول کی ریاست کا مالک سمجھا، نہ خلیفہ سمجھا بلکہ حد یہ ہے کہ ایک دن کے لئے قاضی بھی نہ سمجھا۔ پھر بھلا امام حسینؑ یزید جیسے ظالم کے ہاتھ سے کیسے بچ سکتے تھے۔

ان کو دنیا والوں نے کوئی عہدہ ہی نہ دیا تھا۔ نہ ان کے پاس دینی عہدہ تھا نہ کوئی دنیاوی عہدہ تھا۔ اگر دینی عہدہ بھی ہوتا اور لوگ انھیں امام مانتے تو کربلا میں بہتر ہزار آدمی ان کے ساتھ ہوتے، ایک سے ایک بڑھ کر ان کی حمایت کرتا۔ دنیا میں لوگوں کو بڑے بڑے حمایتی ملے ہیں لیکن جو حمایت حضرت عباسؑ نے امام حسینؑ کی کی ہے اس کی مثل اور نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے بھائی تھے لیکن ہمیشہ آپ نے امام حسینؑ کو آقا کہا ہے اور کبھی بھائی نہیں کہا۔ وہ اپنے آپ کو امامؑ کا غلام سمجھتے تھے۔

جب روز عاشورہ صبح کے وقت امام حسینؑ نے اپنی فوج یعنی جاں نثاروں کو مرتب کیا تو جناب عباسؑ کو علمدار فوج مقرر کیا۔ یوں تو حضرت عباسؑ علمداری کے حقدار تھے مگر حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ حضرت عباسؑ کی قوت کم کرنا چاہتے تھے اس لئے انھیں علمدار مقرر کیا ہوگا تاکہ ان کے ایک ہاتھ میں علم ہو تو دونوں ہاتھوں سے جنگ نہ کر سکیں اور صرف تلوار والا ایک ہاتھ کام کرے۔ اسی طرح حضرت عباسؑ کو جنگ کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی، صرف پانی لانے کے لئے سبیل کرنے کی اجازت ملی تھی۔ اگر حضرت عباسؑ کو جنگ کی اجازت مل جاتی تو یقیناً کوفہ اُلٹ کر رکھ دیتے۔

جناب سکینہؑ نے پانی کے لئے فریاد کی۔ حضرت عباسؑ نے بچوں کے لئے پانی لانے کی اجازت لی۔ امام حسینؑ نے جنگ کی اجازت نہیں دی بلکہ بچوں کے لئے پانی لانے کی اجازت دی۔ حضرت عباسؑ نے میدان میں جانے کی تیاری کی۔ ایک ہاتھ میں علم لیا، دوسرے ہاتھ میں تلوار لی اور دوشِ مبارک پر سکینہ کی خشک مشک رکھی، ماہرینِ جنگ کا قاعدہ ہے کہ غازی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سامان سے آزاد ہو تاکہ کھل کر جنگ کر سکے لیکن حضرت عباسؑ علم اور مشک لے کر ان کی حفاظت کی وجہ سے پابند ہو گئے تھے اور اس پر بھی کھل کر جنگ کرنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ پانی لانے میں جو مزاحمت

درپیش آئے اُسے رفع کرنے کی اجازت تھی۔ حضرت عباسؑ مشک لے کر جارہے تھے اور بچوں کو پانی کی بڑی امید ہو گئی تھی۔

حضرت عباسؑ میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ بچے خیمے سے باہر دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عباسؑ فوج میں داخل ہو گئے۔ بچے دیکھ رہے ہیں۔ ان کا علم نظر آرہا ہے۔ بچوں کی نظریں علم پر ہیں۔ علم دریا کی طرف جارہا ہے۔ جوں جوں دریا قریب ہوتا جارہا ہے۔ بچے خوش ہوتے جاتے ہیں۔ یکایک حضرت عباسؑ نے معرکہ کیا تو سب نے دیکھا کہ اشقیا پانی کا گھاٹ خالی چھوڑ چھوڑ کر بھاگے جارہے ہیں۔

گھاٹ خالی نظر آرہا ہے۔ حضرت عباسؑ نے دریا میں اپنا گھوڑا ڈال دیا ہے۔ مشک کو کاندھے سے اُتار کر پانی بھر رہے ہیں۔ بچوں کو یہ دیکھ کر کس قدر خوشی ہو رہی ہو گی اور کیا کیا تصور کر رہے ہوں گے۔

حضرت عباسؑ نے مشک کو کاندھے پر رکھ لیا۔ عَلَم سنبھالا اور خیمے کی طرف روانہ ہوئے۔ بچے دیکھ رہے ہیں کہ عَلَم واپس آرہا ہے۔ پھر چاروں طرف سے اشقیا نے بھاگ بھاگ کر حضرت عباسؑ کو گھیر لیا ہے۔ اب عَلَم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ عَلَم برابر خیمے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بچے مضطرب ہیں کہ الٰہی خیر ہو۔ اچانک عَلَم ایک طرف کو جھکا، معلوم ہوتا تھا کہ گر جائے گا۔ بچوں کی چیخیں نکلیں۔ پھر دیکھا کہ عَلَم سنبھل رہا ہے اور سیدھا ہو رہا ہے، پھر سب کی اُمید بندھ گئی۔

عَلَم برابر خیمے کی طرف آرہا ہے۔ چمکتی ہوئی تلواریں اور چمکتے ہوئے نیزے نظر آرہے ہیں۔ سوار گھوڑے دوڑائے بھاگے جارہے ہیں۔ چلتے ہوئے تیر دکھائی دے رہے ہیں۔ میدان فوج سے بھرا ہوا ہے اور سخت جنگ و جدل ہو رہی ہے۔ لیکن عَلَم برابر خیمے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اچانک دیکھا کہ علم کو جھٹکا آیا اور زمین کی طرف گرتا ہوا دکھائی دیا۔ بچوں کو اُمید تھی کہ جس طرح پہلے اُٹھا تھا، اب بھی اُٹھ جائے گا لیکن علم کافی دیر تک نہ اُٹھا۔ البتہ بچوں نے یہ دیکھا کہ پہلے جنگ خیموں کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن اب سب فوجیوں کا رُخ دریا کی طرف کو ہے۔

اچانک ایک دردناک آواز آئی۔ آقا! آخری سلام قبول کیجئے۔ دیکھا کہ امام حسینؑ میدان کی طرف بیتابانہ دوڑے۔ بچوں میں رونے کی آوازیں بلند ہوئیں سب شہیدوں نے امام حسینؑ کو اِدرکنی کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن حضرت عباسؑ نے مدد کے لئے نہیں پکارا بلکہ فرمایا : یَا آقَاہُ عَلَیْکَ مِنِّیَ اَلسَّلَامُ ۔ اے آقا! میرا آخری سلام قبول کیجئے۔

اب تو امام حسینؑ ہائے بھائی، ہائے بھائی! کہتے ہوئے دوڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ راستے میں ایک ہاتھ کٹا ہوا پڑا ہے۔ فوراً زمین پر جھک کر عباسؑ کا ہاتھ اُٹھایا اور پھر جلدی سے آگے بڑھے، دیکھا کہ دوسرا ہاتھ بھی کٹا ہوا پڑا ہے۔ پھر جھکے اور اس ہاتھ کو بھی اُٹھالیا۔

روایتیں تو یہ بتاتی ہیں کہ حضرت عباسؑ کے ہاتھ خیموں کی طرف واپسی کے وقت قلم ہوئے تھے نہر کی طرف جاتے ہوئے سلامت تھے لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر امام حسینؑ کو عباسؑ تک پہنچنے سے پہلے ہاتھ کیسے ملے۔ جناب مفتی سید احمد علی صاحب قبلہ نے رسالہ نجف الہند، میں تحریر فرمایا ہے:۔

"جب حضرت عباسؑ کے دونوں ہاتھ قلم ہوگئے تو انھوں نے مشک دانتوں سے پکڑ کر خیمے تک لانا چاہا۔ یہ عباسؑ کا رعب تھا کہ مشک کو کوئی چھین نہ سکا اور اس پر دور سے تیر برسائے۔ ہاتھ تو تھے نہیں جو مشک کی حفاظت کرتے، حضرت عباسؑ نے سر سے مشک کی حفاظت کرنی شروع کردی اور جو کوئی تیر آتا تھا اس کو سر پر روکتے تھے۔ عباسؑ بڑی تیزی سے کوشش کر رہے تھے کہ پانی خیمے تک پہنچادیں لیکن حرملہ کا ایک تیر مشک میں آکر لگا اور پھر مشک کے پانی کے ساتھ عباسؑ کا دل بھی پانی ہوکر بہنے لگا۔ آس ٹوٹ گئی۔

حضرت عباسؑ کو خالی مشک لے کر خیمے میں آنے سے شرم آئی۔ مایوسی کے عالم میں گھوڑے کا رُخ پھر دریا کی طرف موڑ دیا کہ اب خیموں میں جا کر کیا کروں گا۔ ہاتھ کٹ جانے کے باوجود کسی شقی کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ حضرت عباسؑ کے قریب آسکے۔ آپ دریا کی طرف اتنی دُور چلے گئے کہ کٹے ہوئے ہاتھ بھی بہت پیچھے رہ گئے۔"

یہ حضرت عباسؑ ہی کا کام تھا کہ ایک ہاتھ میں علم تھا اور دوسرے ہاتھ سے اتنی شدید جنگ کی کہ دشمن نہر کا کنارہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اگر دونوں ہاتھوں سے جنگ کرتے تو کیا حال ہوتا۔ پھر جب ایک ہاتھ علم والا ہاتھ کٹ کر گرا تو علَم کو گرنے نہ دیا بلکہ دوسرے ہاتھ سے سنبھال لیا۔ ہائے میرے آقا کا حال یہ ہے کہ کٹے ہوئے ہاتھ کے شانے سے خون بہہ رہا ہے اب ایک ہاتھ سے علَم کی بھی حفاظت کرنی ہے، مشک بھی بچانی ہے اور جنگ بھی کرنی ہے۔

تاریخیں بتاتی ہیں کہ جب تک یہ ہاتھ سلامت رہا۔ مشک میں تیر نہ لگنے دیا بلکہ ماہرین جنگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ہاتھ کتنا ہی مشک کی حفاظت میں ہے۔ ورنہ اگر ہاتھ حملہ کرنے کی طرف چلتا ہوتا تو کس کی مجال تھی جو حضرت عباسؑ کے اتنے قریب آسکے کہ تلوار سے ہاتھ کاٹ دے۔ جناب عباسؑ آتے ہی تیروں سے مشک کو بچانے میں مصروف تھے اس لئے دشمنوں کے حملے جسم پر کامیاب ہوگئے۔

جب دوسرا ہاتھ بھی قلم ہوگیا تو مشک کی حفاظت سر سے کرنی شروع کردی تب ہی تو ایک شقی نے سر مبارک پر گرز مارا جس سے سر شگافتہ ہوگیا۔ غازی چکرا کر گھوڑے پر جھومنے لگا۔ گرتے وقت سوار اپنے ہاتھ زمین پر ٹیک دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہائے عباسؑ کے ہاتھ کہاں تھے جو زمین پر گرنے میں سہارا دیتے۔ دانتوں میں مشک تھی اور ہاتھ قلم ہو چکے تھے۔

حضرت عباسؑ کا استغاثہ سُنا۔ امام حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی، بھائی کا سہارا ختم ہوا۔ ہائے بھائی، ہائے بھائی، کہتے ہوئے دوڑتے جاتے تھے۔ اور راستے میں حضرت عباسؑ کے ہاتھ اُٹھاتے جاتے تھے۔ حضرت عباسؑ کا عالم یہ تھا کہ زمین پر پڑے تھے اور ایک آنکھ میں تیر لگا تھا اور دوسری آنکھ میں سر کا خون بھر گیا تھا۔ کچھ نظر نہ آتا۔ جب امام حسینؑ حضرت عباسؑ کے پاس پہنچے تو آہٹ سے یہ خیال گزرا کہ قاتل کا سر کاٹنا چاہتا ہے۔ فوراً بے اختیار زبان سے نکلا۔ قاتل! ابھی ٹھہرو میرے بھائی کے آنے سے پہلے سر قلم نہ کرنا۔

امام حسینؑ حضرت عباسؑ کے سرہانے زمین پر بیٹھ گئے اور بھائی کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ پیار سے کہا۔ بھائی عباسؑ! اے میرے وفادار بھائی! میں آگیا! لو میں آگیا۔ حضرت عباسؑ کو جو معلوم ہوا کہ امام آئے ہیں۔ فوراً اپنا سر زانو سے ہٹا کر زمین پر رکھ لیا اور کہا۔ آقا! غلام کا سر زانو پر نہ رکھئے۔ پھر آہ بھر کر کہا آپ سے میری ایک وصیت ہے، اور یہ کہ خیمے میں میری لاش کو نہ لے جانا، امامؑ نے فرمایا، بھائی یہ کیوں؟ ہم تو صبح سے سب کی لاشیں اُٹھا رہے ہیں، پھر تمہاری لاش کیوں نہ خیمے میں لے جائیں۔ عرض کیا۔ آقا! مجھے بالی سکینہؑ سے شرم آتی ہے۔ پانی کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ اب بغیر پانی کے کیسے جاؤں۔ امام حسینؑ نے وعدہ کیا کہ تمہاری وصیت کو پورا کروں گا۔

اس کے بعد حضرت عباسؑ کہنے لگے آقا! میری رحلت کا وقت قریب ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کی آخری زیارت کروں مگر کیا کروں ایک آنکھ میں تیر لگا ہے اور دوسری آنکھ میں خون بھرا ہے۔۔ آہ، آہ! حضرت امام حسینؑ نے بھائی کی آنکھ سے خون صاف کیا۔ حضرت عباسؑ نے آنکھ کھولی، امام کے چہرے پر نظر کی۔ دیکھا کہ امام کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اور ایک ہاتھ سے کمر پکڑے ہوئے ہیں۔۔۔ امامؑ نے کہا۔۔ عباسؑ ۔۔ عباسؑ ۔۔! ہماری کمر ٹوٹ گئی۔ ہائے عورتوں کی ڈھارس ٹوٹ گئی۔ پھر امام حسینؑ کہنے لگے۔ میرے وفادار بھائی اتم نے مجھے ہمیشہ آقا کہا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ "ایک بار تو مجھے بھائی کہہ کر پکار لو۔" حضرت عباسؑ نے تڑپ کر کہا۔ آقا! میری ماں ام البنین ہیں، آپ کی والدہ سیدۃ النساء العالمین ہیں۔ میں کنیز کا بیٹا آپ کو کیسے بھائی کہہ سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر غلامانہ انداز میں نظریں جھکا لیں۔ حضرت امام حسینؑ بیتابانہ بھائی کے اوپر جھک گئے اور آنکھوں میں جھانک کر پکارا۔ عباسؑ ۔۔ عباسؑ! ۔۔ مگر حضرت عباسؑ نے تو ہمیشہ کے لئے نظریں جھکا لی تھیں۔ روح جنت کو پرواز کر چکی تھی۔

غمگین امام نے بھائی کو چھوڑا۔ علم اُٹھایا، مشک اُٹھائی۔ (رو کر) پانی تو بہہ ہی چکا تھا۔ خیمے کی طرف چلے۔ بچوں نے جو علم بلند ہوتے دیکھا۔ سکینہ نے پکار کر کہا۔ بچو آؤ میرے چچا پانی لے کر آ رہے ہیں۔ سب کو پانی دوں گی۔ قطار بنا کر کھڑے ہو جاؤ۔

میرے چچا کو تنگ نہ کرنا۔ باری باری پانی لینا۔ سب بچے اکٹھے ہو گئے۔ آتے ہوئے علَم کو دیکھنے لگے۔

ہائے جب علَم قریب آیا تو دیکھا کہ حضرت عباسؑ تو ہیں نہیں۔ حضرت امام حسینؑ علَم اُٹھائے ہوئے گردن جھکائے چلے آ رہے ہیں۔ سکینہؑ روتی ہوئی خیموں میں دوڑی۔ جناب زینبؑ کو کہا۔ پھوپھی اماں! چچا شہید ہو گئے، بابا علَم لا رہے ہیں۔ ہائے مر گئی۔ ہائے میں نے پانی لانے کے لئے کیوں بھیجا۔ ہائے میں کیا کروں۔ پھوپھی اماں میں کیا کروں۔ جناب زینبؑ نے بچی کو سمجھایا۔ اتنے میں امام حسینؑ علَم لئے ہوئے خیموں میں آئے بیبیاں تڑپ اُٹھیں۔ اب ہماری آس ٹوٹ گئی۔ ہائے اب ہماری چادریں چھین لی جائیں گی۔ ہائے اب ہمیں قیدی بنا لیا جائے گا۔ ہائے اب ہم بے کس ہو گئے، ہائے اب ہم بے وارث ہو گئے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

☆☆☆

گیارھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ۝ (صلواۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کا معاوضہ سوائے اپنے اقربا کی محبت کے اور کچھ نہیں مانگتا۔

اس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اقربا ایسے ہیں جن کو تبلیغ رسالت پر ایسا ہی اختیار ہے جیسا کہ مالک یعنی خود رسولؐ اللہ کو حاصل ہے ورنہ رشتہ دار ہونا اور چیز ہے اور معاوضے کا

مختار ہونا اور چیز ہے۔

رشتے دار تو ہمارے بھی ہوتے ہیں اور ہم بھی بہت سی چیزیں چھوڑ کر مرجاتے ہیں۔ کیا ہمارے سارے اقربا ہماری چیزوں کے وارث بنتے ہیں؟ ہماری زندگی میں بھی بہت سی چیزوں پر ہمارے اقربا کو مالکانہ اختیار ہوتا ہے اور وہ اُن کی قیمت وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہمارے اقربا کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہمارے مال پر تصرّف کر لیں۔ کیا ہماری بیوی کے رشتہ داروں یا ہمارے بیٹے کی بیوی کے رشتہ داروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہماری چیزوں کی قیمت وصول کر لیں۔ جب ہم اپنے لئے اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ سب رشتے دار ہماری چیزوں کے مختار ہو جائیں تو یہ کیسے مناسب ہے کہ رسولؐ اللہ کے سب رشتہ داروں کو ان کی چیزوں کا مختار سمجھ لیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے تمام انسانوں کو تبلیغ پہنچائی ہے اور وہ اس پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ اعمال خدا کے سامنے پیش ہوں گے اور دیکھا جائے گا کہ یہ نمازیں پڑھتا تھا یا نہیں، جن احکام کا اسے حکم دیا گیا تھا وہ اس نے کئے ہیں یا نہیں اور جن کاموں سے اسے روکا گیا تھا، ان سے باز رہا ہے یا گناہ کرتا رہا ہے۔ اس کے بعد اقربا سے سوال ہوگا کہ ان اعمال کا معاوضہ تمہیں وصول ہو چکا ہے یا نہیں۔ یا یوں کہیے کہ نامۂ اعمال کے ساتھ اقرباء کی یہ تصدیق ہونا ضروری ہے کہ اس کا معاوضہ وصول ہوگیا ہے یا نہیں۔ اگر کسی اعمال نامے کے ساتھ تصدیق نہ ہو تو قاعدے کی رُو سے اسے مسترد ہونا ضروری ہے۔

جب اعمال نامہ موجود ہے، تبلیغ پر عمل موجود ہے اور نمازیں و نیک کام درج ہیں لیکن معاوضہ ادا کرنے کی تصدیق نہیں ہے۔ تو خطرہ ہو سکتا ہے کہ کہیں سرقہ کا الزام نہ لگ جائے کہ تم نے بغیر معاوضہ ادا کئے تبلیغ پر تصرّف کیوں کیا ہے اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی وصولی درج ہے اور اقربا نے تصدیق کر دی ہے۔ کہ معاوضہ ہم تک پہنچ گیا ہے تو پھر اعمال رد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر قبول و وصول ہو چکا ہے اور اتفاق سے کسی عمل میں نقص نکل آئے اور وہ مسترد

کیا جانے لگے تو اعمال کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ جب آپ ہمارا عمل مسترد کر رہے ہیں تو ہمارا معاوضہ بھی واپس کیا جائے۔ بتایئے! جو معاوضہ قبول ہو چکا ہے اس کی واپسی کیسی؟ قبول چیز مسترد نہیں ہو سکتی۔ مقبول چیز کو رد کرنا ظلم کہلاتا ہے۔ بھلا جو ظلم کرنے سے سب کو منع کرتا ہو وہ خود معاذ اللہ ظلم کیسے کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا ایسے ہی موقع پر رحمت کام آئے گی اور ناقص اعمال بھی قبول ہو جائیں گے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اس کی رحمت بہت بڑی ہے۔ جب ناقص اعمال قبول ہو سکتے ہیں تو جنہوں نے معاوضہ نہیں دیا، ان کا بھی یہ گناہ رحمت بخش دے گی۔ لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ اگر معاوضہ ادا نہ کرنے کا گناہ بخش کر اعمال قبول کر لئے جائیں تو اس طبقہ پر تو رحمت ہو جائے گی مگر اقربا پر ظلم ہو جائے گا کہ معاوضہ تو ان کا تھا اور بخش دیا خدا نے۔ خدا کسی دوسرے کی چیز بخش کر اس پر ظلم نہیں کر سکتا۔ ہاں! البتہ وہ اپنا گناہ بخش سکتا ہے۔ مثلاً کسی نے نماز نہیں پڑھی تو یہ اُس نے خدا کا گناہ کیا۔ خدا اس کو معاف کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ کسی دوسرے کا معاوضہ بخش دے۔

معلوم ہوا کہ رحمت ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے دوسروں کے حقوق ادا کر دیئے ہیں۔ اقربا کو معاوضہ دے دیا ہے۔ اب گناہ اس کی رحمت سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ خدا کی رحمت کا تو یہ حال ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ رسولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا: مَنْ بَكىٰ عَلَى الْحُسَيْنِ اَوْ اَبْكىٰ اَوْ تَبَاكىٰ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔ جو حسینؑ پر روئے یا رُلائے یا رونے کی صورت بنائے، اس پر جنت واجب ہے۔ کسی کی مصیبت پر رونا اس سے محبت کی دلیل ہوتی ہے اور محبت کو رسول اللہ نے معاوضہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا جس نے معاوضہ ادا کر دیا، اس کے لئے خدا کی رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔ اب بڑے سے بڑا گناہ بھی خدا کی رحمت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔

روایت ہے کہ حشر میں ایک شخص پیش کیا جائے گا۔ اس کا نامۂ اعمال سیاہ ہوگا۔ فرشتے اسے عذاب کے لئے کھینچیں گے اور حکم ربی کے منتظر ہوں گے مگر خدا اسے اپنے خزانے سے کچھ موتی دے گا کہ یہ تیری امانت ہمارے پاس تھی، اسے لے جا کر

فروخت کردے۔

وہ شخص موتی لے کر حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئے گا کہ انھیں خرید لیجئے۔ حضرت آدمؑ جواب دیں گے کہ یہ موتی جتنے قیمتی ہیں، اتنی قیمت میرے پاس نہیں ہے۔ وہ شخص رنجیدہ ہو کر واپس چلا جائے گا۔ پھر حضرت نوحؑ کے پاس جائے گا۔ مگر وہ بھی یہی فرمائیں گے کہ میرے پاس اتنی قیمت نہیں ہے جتنے کے یہ موتی ہیں۔ اس لئے میں یہ موتی خریدنے سے مجبور ہوں۔ پھر وہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیگا۔ مگر وہاں سے بھی وہی جواب پائے گا۔ اور اسی طرح ہر نبی کے پاس جائے گا۔ اور ہر نبی انکار کردے گا۔ وہ شخص بڑا پریشان ہوگا کہ کیا کروں۔

آخر وہ اُن موتیوں کو لے کر حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جائے گا اور کہے گا کہ میں ان موتیوں کو بیچنا چاہتا ہوں مگر کوئی نہیں خریدتا۔ یا رسول اللہؐ آپ ہی خرید لیجئے! میں بڑا ضرورتمند ہوں۔ حضورؐ فرمائیں گے ہاں ہاں! ایسے گوہر میرے حسینؑ کے خزانے میں ہیں۔ فرشتوں کو حکم دیں گے کہ اس شخص کو حسینؑ کے پاس لے جاؤ۔

فرشتے اسے امام حسینؑ کے پاس لے جائیں گے۔ اور وہ امام حسینؑ کے سامنے موتی پیش کرے گا۔ امام حسینؑ اس سے موتی لے لیں گے اور پھر خدا کے سامنے پیش کریں گے اور عرض کریں گے۔ اے میرے پروردگار! یہ شخص گنہگار ہے مگر اس کے پاس جو موتی ہیں، یہ وہ آنسو ہیں جو میری مصیبت پر اس کی آنکھوں سے نکلے ہیں۔ کربلا میں میرے عزیزوں، میری بہنوں اور بیٹیوں کو رونے نہیں دیا گیا۔ رونے پر ان کے تازیانے مارے گئے۔ اے خدا! اس شخص نے مجھے دیکھا تک نہیں ہے، میری مصیبت کو غائبانہ سُنا تو اسے اتنا دکھ ہوا کہ یہ رونے لگا اور یہ وہی آنسو ہیں۔

اے خدا! اب تو ہی انصاف کر کہ اگر اس شخص پر مصیبت آپڑے اور یہ دوزخ میں جلے تو کیا میرا دل رنجیدہ نہیں ہوگا؟ کیا میں اس کے لئے نہیں روؤں گا؟ یا اللہ! یہ تیرا بے شک گنہگار ہے مگر اس نے مجھ پر تو احسان کیا ہے۔ میں اسے دوزخ میں جلتے ہوئے اور

تڑپتے ہوئے کیسے دیکھوں!

ارشاد الٰہی ہوگا۔ اے حسینؑ! کیا چاہتے ہو۔ عرض کریں گے۔ پروردگار اسے مجھ سے محبت ہے لہٰذا میرے ساتھ اسے بھی جنت میں جانے کی اجازت دے دے حکم ہوگا۔ اے حسینؑ! تم مالکِ جنت ہو، جس کو چاہو ساتھ لے جاؤ۔ امام حسینؑ اس کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں لے جائیں گے۔ (صلوٰۃ)

معلوم ہوا کہ ان کی محبت کے سہارے گنہگار کی بخشش ہو سکتی ہے۔ خداوند عالم کی رحمت گناہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ اگر ان کا دامن آپ کے ہاتھ میں ہے تو یقیناً خدا کی رحمت آپ کے لئے ہے۔ (صلوٰۃ)

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ بھلا رونے سے کہیں جنت واجب ہوتی ہے۔ ان کی بات بظاہر ٹھیک ہے۔ لیکن اوّل تو یہ قول جناب رسولؐ خدا کا ہے، کسی عام آدمی کا نہیں ہے۔ اگر معاذ اللہ رسولؐ بیکار باتیں کہہ سکتا ہے پھر تو آپ حدیث کو فضول سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر ان کی شان یہ ہے کہ وہ بغیر خدا کی وحی کے کلام ہی نہیں کرتے تو پھر اس حدیث کو فضول کہنے کے کیا معنی؟

سب کو معلوم ہے کہ خدا نے دو فرشتے منکر نکیر مقرر کئے ہیں جو ہر شخص کے اعمال لکھتے رہتے ہیں اور روز محشر جب اعمال نامے پیش ہوں گے تو یہ فرشتے ان اعمال کی گواہی دیں گے۔ آپ جب مجلسیں کرتے ہیں اور مجلس میں بیٹھتے ہیں تو خاتونِ جنت جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنے بیٹے کے غم میں مجلس میں آ کر شریک ہوتی ہیں اور ایک ایک کو دیکھتی ہیں کہ کون میرے بیٹے حسینؑ کے غم میں رو رہا ہے۔ اور جو آنسو عزاداروں کی آنکھوں سے نکلتے ہیں، انھیں اپنے رومال سے خشک کرتی ہیں اور کہتی ہیں۔ "یہ آنسو میرے حسینؑ کے زخموں کا مرہم ہیں۔"

آپ اندازہ کیجئے کہ نماز، روزے اور دوسرے اعمال کے گواہ فرشتے ہیں لیکن امام حسینؑ پر رونے کی گواہی دینے والی جناب فاطمہؑ ہیں۔ جنت حاصل کرنے کے لئے سب سے ضروری تبلیغ کا معاوضہ اقربا کو ادا کرنا ہے جس نے معاوضہ ہی نہیں دیا۔ اس کے

اعمال کا آگے چلنا مشکل ہے لیکن جس نے معاوضہ ادا کر دیا اور گواہ جناب فاطمہؑ ہیں تو خاتونِ محشر سے زیادہ اور کس کی گواہی ہو سکتی ہے، اب بھلا اُس کے اعمال کیسے کنڈم ہو سکتے ہیں؟ خاتونِ محشر کی گواہی پر اگر بخشش نہ ہو تو پھر کس کی گواہی پر بخشش ہوگی؟

اب تو سمجھ میں آیا کہ حسینؑ پر رونے سے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ رونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ امام حسینؑ کی مصیبتوں سے واقف ہیں لیکن وہ روتے نہیں۔ روتے صرف وہی ہیں جو محبّ ہیں، جن کو امام حسینؑ سے محبت ہے اور رسولؐ کی تبلیغ کا معاوضہ دیتے ہیں۔ معاوضہ دیئے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا۔ معاوضہ دینا ہے تو محبت رکھنی پڑے گی اور محبت ہے تو مصیبتیں سُن کر روئے بغیر نہ رہ سکو گے۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ اللہ اور اُس کے ملائکہ نبی پر صلوات بھیجتے ہیں۔ اے وہ لوگ جو ایمان لائے، تم بھی اس پر درود بھیجو اور ایسا درود بھیجو جیسا کہ سلام و تسلیم کا حق ہے۔ (صلواۃ)

خدا اور فرشتے نبیؐ پر صلوات بھیجتے ہیں۔ نبی واحد کا صیغہ ہے یعنی ایک نبی پر صلوات بھیجتے ہیں۔ انبیاء نہیں ہے کہ سب نبیوں پر صلوات بھیجتے ہوں اور نہ محمدؐ کا لفظ ہے کہ محمدؐ پر صلوات بھیجتے ہیں۔ لہٰذا مومنین اب یہ نہیں کر سکتے کہ نبی کے ساتھ دس بیس انبیاء کو شامل کر کے صلوات بھیجنے لگیں یا محمدؐ کے ساتھ ان کے رشتہ داروں پر بھی درود و سلام پڑھنے لگیں۔ اللہ کے کہنے کے مطابق صلوات اتنی ہی ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى النَّبِيِّ ۔یعنی اے خدا! نبی پر صلوات ہو۔

رسولؐ اللہ اپنی نبوت کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الْمَآءِ وَالطِّيْنِ ۔ میں اس وقت بھی نبی تھا۔ جب حضرت آدمؑ پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ یعنی حضرت آدمؑ کے خلق ہونے سے بھی بہت پہلے حضرت محمدؐ نبی تھے اور قرآن کے مطابق اللہ و فرشتے اس وقت بھی نبی پر صلوات بھیج رہے تھے۔ لیکن حضرت آدمؑ پانی اور مٹی کے درمیان تھے تو ظاہر ہے کہ اولادِ آدمؑ اور دوسرے انبیاء بہت بعد کی باتیں ہیں،

ان میں سے کسی پر اللہ اور فرشتے درود نہیں بھیج رہے تھے۔ بشری جسم کی صورت میں تو ہو نہیں سکتے کیونکہ انسانوں کی ابتداء حضرت آدمؑ سے ہوئی ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اس وقت رسولؐ اللہ نور کی صورت ہی میں تھے۔ یعنی اللہ اور فرشتے نبیؐ کے نور پر صلوات بھیج رہے تھے۔

چونکہ نور ایک تھا اس لئے عَلَى النَّبِي کہہ کر ایک نبی پر صلوات بھیجتے رہے لیکن جب یہ نور دُنیا میں آیا تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ رسولؐ خدا فرماتے ہیں۔ اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ ۔ میں اور علی ایک نور سے ہیں۔ پھر محمدؐ کا نور جناب فاطمہؑ میں بھی منتقل ہوا۔ لہٰذا اگر اب علی النبی کہہ کر صلوات بھیجی جائے تو کیا یہ پورے نور پر ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو صرف حضرت محمدؐ والے نور پر ہوگی اور باقی نور کے حصے خالی رہ جائیں گے۔ یہ سوال رسولؐ اللہ کی زندگی میں بھی کیا گیا۔ لوگوں نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ کیا ہم اس طرح صلواۃ پڑھیں اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ دُم بُرید صلوات نہ بھیجو۔ پوری صلواۃ بھیجو اور وہ یہ ہے: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ۔ یعنی میری آل کو بھی اس میں شامل کرو کیونکہ جس وقت خدا اور فرشتے صلوات بھیج رہے تھے اس وقت یہ نور پورا تھا لیکن اب چودہ حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے لہٰذا چودہ کے چودہ حصوں پر صلواۃ بھیجو تب پوری صلواۃ ہوگی۔

حضورؐ نے مزید تفصیل سے بتایا۔ اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ بَلْ كُلُّنَا مُحَمَّدٌ ۔ ہمارا اول بھی محمدؐ ہے، ہمارا آخر بھی محمدؐ ہے، ہمارا درمیانی بھی محمدؐ ہے بلکہ ہم تو کل کے کل محمدؐ ہیں۔ اس نور کے کسی حصے کا نام رسولؐ رکھ کر اس کے ذریعے دین اور قرآن کی تبلیغ کرا دی اور کسی حصے کا نام امام رکھ کر تبلیغ اور قرآن کی حفاظت سپرد کر دی۔ (ہنس کر) تاکہ جو معاوضہ لے وہ کام بھی تو کرے!

ائمہ کے سپرد ہے کہ وہ دین کی حفاظت کریں اور قرآن کے صحیح معنی سمجھائیں ورنہ حروف مقطعات، متشابہ آیات اور کلام خدا کے اصل معنی کون جانتا ہے؟ لہٰذا ائمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ۔ ہوں اور دین کی حفاظت کے لئے ہر طاقت

کا مقابلہ کر سکیں۔

اگر رسول کی شان خدا نے یہ بیان فرمائی ہے۔: مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ "يُوْحٰى" ۔ رسول تو اپنی خواہش سے کلام ہی نہیں کرتا جب تک کہ اس پر وحی نہ آئے۔ تو ائمہ علیہم السلام کے لئے ارشاد فرمایا وَ جَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً "يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ. اور ہم نے اُن کو ائمہ قرار دیا۔ وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ہم ان کی طرف نیک کاموں کی وحی کرتے ہیں۔

معلوم ہوا ائمہ کی طرف ہدایت کے لئے احکام آتے ہیں اور انھیں 'وحی' بھی ہوتی ہے۔ (ٹھہر ٹھہر کر سمجھا کر بولیں) جب اللہ نے انھیں بتایا ہے تو اُن سے کلام بھی کرے گا اور ہدایات کے احکام بھی بھیجے گا۔

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے تبلیغ کا معاوضہ اپنے لئے کیوں نہیں طلب کیا اور اقربا کو معاوضہ لینے کا کیوں مختار کر گئے؟ جناب! وجہ یہ ہے کہ جب تک کام کی تکمیل نہ ہو جائے، معاوضہ نہیں لیا جا سکتا۔ رسولؐ اللہ نے دین کے کل احکام پہنچا دیے تھے مگر ان کی حفاظت اور ان کے سمجھانے کا کام تو باقی تھا۔ لہٰذا نور کے جس حصے نے تبلیغ کی تکمیل کی اس نے معاوضے کا مطالبہ کیا مگر خود وصول نہیں کیا بلکہ جس حصے کے سپرد دین کی حفاظت اور قرآن کا سمجھانا چھوڑ گئے اسی حصے کو معاوضہ لینے کا مختار بنا گئے۔ (صلواۃ)

دین اور قرآن کچھ عرصے میں ختم ہونے والی چیزیں نہیں، یہ تو قیامت تک باقی رہنے والی چیزیں ہیں لہٰذا حفاظت کرنے والے ایسے ہی ہونے چاہئیں جو قیامت تک قرآن سے جُدا نہ ہوں۔ اسی لئے فرما گئے اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میرے اہلبیتؑ، اگر تم ان کے ساتھ متمسک رہو گے تو میرے بعد گمراہ نہ ہو گے اور ان میں جدائی نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ یہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچیں گے۔ یعنی دین اور دین کی حفاظت کرنے والے دونوں قیامت تک رہیں گے۔ (صلواۃ)

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، چاہے کافروں پر گراں ہی کیوں نہ گزرے۔

معلوم ہوا خدا اور کافروں میں بڑی کشمکش چل رہی ہے۔ کافر چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو بجھا دیں لیکن خدا اپنے نور کو ہرگز نہیں بجھنے دے گا۔ چاہے کافروں کو کتنا ہی گراں گزرے (ہنس کر) اللہ کافروں اور منافقوں کے بڑا سخت خلاف ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ اے نبی! کفار اور منافقون سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔

یہاں بھی وہی صلوٰۃ کی طرح اَلنَّبِيُّ کا لفظ آیا ہے کہ اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو۔ تاریخ دان جانتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے اپنی زندگی میں صرف کفار سے جہاد کئے ہیں مگر منافقین سے کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ اور رسول منافقوں سے لڑ بھی کیسے سکتے تھے؟ منافق تو وہ ہوتے ہیں جو بظاہر مسلمان ہوتے ہیں مگر دل میں اسلام نہیں رکھتے۔ اگر رسولؐ اللہ ایسے لوگوں سے لڑ پڑیں تو وہ صاف کہیں گے کہ دیکھو! ہم مسلمان ہیں کلمہ پڑھتے ہیں اور نماز میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ مگر دیکھو، رسولؐ اللہ ہمیں قتل کررہے ہیں۔ معزز سامعین ذرا بتایئے! رسولؐ اللہ منافقون سے جنگ کریں تو کیسے کریں؟

ادھر اَلنَّبِيُّ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ حکم خاص نبی ہی کے لئے ہے۔ اگر کوئی دوسرا نبی یا خود رسولؐ اللہ کی اُمت اس حکم کی تعمیل کردے تب بھی خدا کا حکم پورا نہیں ہوتا۔ یہاں تو بذات خود نبی ہی کو جہاد کرنا پڑے گا اور کافروں و منافقوں پر خوب سختی کرنی پڑے گی (ہنس کر) اور خوب ڈنڈا پھیرنا پڑے گا۔ جب تک رسولؐ اللہ منافقوں پر رگڑا نہ لگائیں، آیت پر عمل نہیں ہوتا۔ اور قرآن کہتا ہے کہ رسولؐ اللہ کی حالت یہ ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ عالمین میں کافر و منافق بھی آگئے۔ اگر رَحْمَةً لِّلْمُسْلِمِيْنَ کا لفظ ہوتا تو صرف مسلمانوں پر رحمت کرتے اور غیروں پر سختی کرتے لیکن

عالمین نے سختی کرنے سے بالکل ہی پابند کیا ہوا ہے۔ اب بتایئے! رسولؐ اللہ کریں تو کیا کریں۔ (صلواۃ)

جناب! ماننا پڑے گا کہ جس طرح صلواۃ والی آیت میں یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ سے مراد پورا نور تھا اسی طرح یہاں بھی اَلنَّبِیُّ سے مراد پورا نور ہی ہے۔۔۔ ورنہ اگر اَلنَّبِیُّ کے لفظ سے صرف حضرت محمدؐ مراد ہوتے تو رسولؐ اللہ اپنی زندگی میں منافقین سے ضرور جہاد کرتے۔ لیکن چونکہ نبی کہہ کر حکم ہوا ہے لہٰذا کل نور کو حکم ہوا ہے اسی لئے نور کے ایک حصے محمدؐ نے کفار سے جہاد کیا اور نور کے دوسرے حصے علیؑ نے منافقین کے خلاف تلوار اُٹھائی اور وہی سختی کی۔ اور وہ رگڑا لگایا جو قرآن کہتا تھا۔ اس آیت پر عمل حضرت محمدؐ نے کفار سے لڑ کر شروع کیا اور آلِ محمدؐ نے منافقین سے جہاد کر کے تکمیل کو پہنچایا۔

رسولؐ اللہ کے وقت میں اس کثرت سے منافقین تھے کہ قرآن میں پورا پورا سورۃ منافقین ہی نازل ہو گیا۔ مگر نہ رسولؐ اللہ نے ان سے جہاد کیا نہ انھیں پہچنوایا کہ فلاں فلاں منافق ہے، اس سے ہوشیار رہنا، اگر منافقین کی فہرست ہی بنا کر دے جاتے تب بھی مسلمان ان منافقین سے بچتے رہتے۔ لیکن ہوا یہ کہ رسولؐ اللہ انھیں مسلمانوں میں ویسا کا ویسا ہی مخلوط چھوڑ گئے۔

اب اس نور کے دوسرے حصوں یعنی آلِ محمدؐ کا کام دیکھئے کہ جس طرح رسولؐ اللہ نے تلوار اُٹھا کر کفار اور مسلمانوں کو الگ الگ کر دیا۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے تلوار اُٹھا کر مسلمانوں اور منافقوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ آپ بتایئے کہ اگر حضرت علیؑ اس نور کا دوسرا حصہ نہ ہوتے تو اس آیت پر ادھورا عمل رہ جاتا یا نہ رہ جاتا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسولؐ اللہ تو کفار سے جہاد کر کے چلے گئے لیکن منافقین سے جہاد کا سلسلہ بہت لمبے عرصے تک چلتا رہا اور نور کے اس دوسرے حصے کو بہت دشواریاں پیش آتی رہیں۔ حضرت علیؑ کو دیکھئے کہ انھوں نے رسولؐ اللہ کے زمانے میں بھی جنگیں کیں مگر منافق الگ نہ ہوئے۔ پھر رسولؐ اللہ کے بعد جنگِ صفین وغیرہ میں تلوار اُٹھائی مگر اب بھی منافق، مسلمانوں میں مخلوط ہی رہے۔

ان کے بعد حضرت امام حسنؑ کا زمانہ آیا، انھوں نے نہروان کی جنگ لڑی مگر دونوں طرف کے مسلمان تھے، اس لئے وہاں بھی اچھی طرح تفریق نہ ہو سکی۔ جب امام حسنؑ نے دیکھا کہ جب تک دنیا کی سلطنت بیچ میں رہے گی۔ یہ مسلمانوں اور منافقوں میں امتیاز نہ ہونے دے گی تو آپ نے کیا کیا؟ سلطنت چھوڑ ہی دی۔ اور صلح کر لی تا کہ مسلمان اور منافق علیحدہ علیحدہ ہو جائیں لیکن جناب! منافق تو بناوٹی مسلمان ہوتا ہے، اسے اب بھی مسلمانوں سے الگ پہچاننا مشکل ہے۔

لہٰذا جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ مسلمان اور منافق کسی طرح علیحدہ نہیں ہوتے تو اُنھوں نے آیت پر پورا پورا عمل کرنے کے لئے جنگ کا طریق کار ہی بدل دیا اور بزورِ شمشیر کی بجائے بزیرِ شمشیر جہاد کرنے کی بنیاد ڈالی۔ ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے کیا۔ تلواروں کے مقابلے میں قبضۂ شمشیر پر ہاتھ نہ ڈالا بلکہ اپنا تین دن کا خشک گلا خنجر کے نیچے رکھ دیا۔ نیزوں کے جواب میں برچھے بلند نہیں کئے بلکہ اٹھارہ سالہ کڑیل جوان علی اکبرؑ کا سینہ پیش کیا۔ تیروں کے بدلے برق اندازی نہیں کی بلکہ چھ ۶ مہینے کی ننھی جان علی اصغرؑ کا گلا قربان کر دیا۔ ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے کیا۔

امام حسینؑ اگر مدینے میں شہید ہو جاتے تو منافق بے نقاب نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے مدینہ چھوڑ کر مکہ تشریف لائے مگر یہاں بھی یزید کے بھیجے ہوئے آدمی قتل کرنے کے لئے حاجیوں کے بھیس میں آ گئے۔ امام حسینؑ عین حج کے موقع پر مکے سے بھی روانہ ہوئے کہ اگر یہاں قتل ہو گیا تو اصل قاتل ظاہر نہ ہوں گے بلکہ یہ کہہ کر قتل کو دبا دیا جائے گا کہ ہنگامے میں چند لوگوں نے امام حسینؑ کو قتل کر دیا۔ قاتل پکڑے تک بھی نہ جا سکیں گے۔ اُدھر کوفہ سے بلانے کے خطوط آ رہے تھے۔ وہاں حضرت مسلمؑ کو بھیج کر دنیا والوں کو سمجھا دیا کہ اگر کوفہ نہ جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم نے تو بہت بلایا مگر حسینؑ آئے ہی نہیں، اگر وہ ہمارا کہا مان لیتے تو بچ جاتے۔ حضرت مسلمؑ کے جانے سے معلوم ہو گیا کہ جو حال ان کا کیا ہے وہی سلوک امام حسینؑ کے ساتھ بھی کرتے۔

ہر طرف انتظام کرتے آ رہے ہیں کہ کہیں شہادت کا منشا چھپ نہ جائے۔ جب

کربلا میں پہنچے، ترائی سے خیمے اُٹھانے کا اصرار ہوا۔ بھلا حضرت عباسؑ کے ہوتے ہوئے ترائی سے خیمے اُٹھ سکتے تھے۔ مگر اُس وقت نہ لڑے اور خیمے اُٹھوا لئے کہ کہیں پانی کا نام نہ ہو جائے کہ پانی پر لڑے تھے۔ حضرت عباسؑ کے دل سے پوچھیئے کہ جو خیمے انھوں نے بچوں، عورتوں کی پیاس کے لئے ترائی کے پاس گاڑے تھے، جس وقت وہ خیمے اُکھاڑ رہے ہوں گے تو اُن پر کیا گزر رہی ہوگی۔ امام حسینؑ نے اُس وقت تک جنگ نہ کی جب تک گوشے گوشے کا اور ہر قسم کا آدمی دس تاریخ تک کربلا میں جمع نہ ہو گیا تاکہ شہادت کا مقصد چھپ نہ جائے۔ پھر یہ دیکھئے کہ ایک رات کی مہلت لے کر گمراہوں کو سوچنے کا موقع بھی دیا کہ جو امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہوگا وہ مومن ہو کر رہے گا چاہے وہ اس سے ایک گھنٹہ پہلے مخالف لشکر کا سردار حُر ہی کیوں نہ ہو اور جو امام حسینؑ کا قاتل ہوگا، وہ منافق ہوگا، چاہے وہ خلیفہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

چونکہ لڑائی کربلا میں تھی اور اصل قاتل شام میں تخت پر بیٹھے تھے ان کا عیاں کرنا مشکل تھا اس لئے کنبہ کی عورتوں کو پردہ نشین مخدرات عصمت و طہارت کو پس گردن ہاتھ بندھوا کر قیدی بنا کر شام میں بھیج دیا تاکہ دنیا دیکھ لے اور پہچان لے کہ اصل قاتل کون ہیں۔ اگر عورتیں قید ہو کر شام میں نہ جاتیں تو یزید قاتلوں کی فہرست سے اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا وہ صاف کہہ دیتا کہ لوگوں نے میرے حکم کے بغیر ہی امام حسینؑ کو قتل کر دیا ورنہ میں نے انھیں قتل کرنے کا حکم کہاں دیا تھا؟ سیدانیوں کا قید ہو کر جانا اور یزید کا سات سو کرسی نشینوں کے سامنے جناب زینبؑ کو زمین پر بٹھانا اور طشت میں امام حسینؑ کے دانتوں پر چھڑی مارنا بتاتا ہے کہ یزید ہی اصل میں امام حسینؑ کا قاتل تھا۔

دین کے لئے کوئی ایسی قربانی نہیں جو امام حسینؑ نے چھوڑ دی ہو، بوڑھے باپ کے لئے جواب بیٹے سے زیادہ کوئی پیارا نہیں ہوتا۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ لیکن ایک حضرت یوسفؑ کے گم ہو جانے پر اتنے روئے تھے کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ حضرت ابراہیم جلیل القدر خلیل اور پیغمبر تھے لیکن خدا کی راہ میں بیٹے کو

قربان کرتے وقت آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی۔ قربان جائیں ہماری جانیں مولا حسینؑ پر کہ امام حسینؑ نے حضرت علی اکبرؑ جیسا فرزند جو رشکِ یوسفؑ اور فخرِ اسمٰعیلؑ تھے، خدا کی راہ میں دے دیا۔

جب حضرت علی اکبرؑ پیدا ہوئے تو خدا نے انھیں رسولؐ کی شباہت عطا کی۔ خاندانِ بنی ہاشم عرب کا ممتاز خاندان تھا اور اس خاندان میں امام حسینؑ منتخب تھے۔ آپ کی اولاد میں حضرت علی اکبرؑ منتخب تھے، رسولؐ اللہ کی شبیہ تھے۔ دُور دُور سے لوگ زیارت کے لئے آتے تھے۔ جنھوں نے رسولؐ اللہ کو نہیں دیکھا تھا وہ حضرت علی اکبرؑ کی زیارت کر کے خوش ہوتے تھے۔

ماں نے بڑے ناز اور لاڈ سے پالا تھا۔ جب دیکھتی تھیں، دل خوش ہو جاتا تھا۔ اپنے اوپر فخر کرتی تھیں کہ خدا نے مجھے ایسا بیٹا دیا جو شبیہ رسولؐ ہے۔ کبھی نظرِ بد سے ڈرتی تھیں تو نذریں مانا کرتی تھیں، حضرت علی اکبرؑ میں رسولؐ اللہ کا حُسن ہی نہ تھا بلکہ شجاعت میں حیدرِ کرار، خُلق میں حسنِ مجتبیٰؑ اور علم و معرفت سے مزیّن تھے۔ عبادت میں ایسے کہ اذان سب سے عمدہ دیتے تھے۔ خاندان کی زینت تھے اور بزرگوں کی صفات کے ایک گلدستہ تھے۔ باپ کے لئے پروردگار کی ایک خاص نعمت تھے اور خاندان کی جان تھے۔

حضرت عباسؑ کو حضرت علیؑ نے فنونِ سپہ گری کی تعلیم دی تھی اور حضرت عباسؑ ایک خاص مکان میں خاندانِ بنی ہاشم کے لڑکوں کو فنونِ سپہ گری سکھایا کرتے تھے۔ ایک دن گھر کی عورتوں نے جناب زینبؑ سے کہا کہ ہم ان لڑکوں کا مقابلۂ جنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ جناب زینبؑ نے حضرت عباسؑ سے کہا کہ کسی دن ذرا گھر میں اپنی تعلیم تو دکھایئے۔ آپ کے خاندان کی عورتیں اور لڑکیاں جنگ دیکھنا چاہتی ہیں۔

حضرت عباسؑ نے گھر میں پردہ کا انتظام کیا۔ کیونکہ یہ وہ خاندان ہے جہاں خاندان کی لڑکیاں بھی خاندانی لڑکوں سے پردہ کرتی ہیں۔ پردے کے پیچھے عورتیں بیٹھ گئیں۔ جناب زینبؑ پردے کے پاس بیٹھی تھیں۔ حضرت عباسؑ جو اُستاد تھے ایک ایک لڑکے کو بلا کر مقابلہ دکھا رہے تھے۔ جب حضرت علی اکبرؑ کا نمبر آیا تو ایک طرف حضرت

عباسؑ ہتھیار لگائے کھڑے ہوئے اور دوسری طرف مقابلے کے لئے حضرت علی اکبرؑ کو کھڑا کیا۔ تلواروں کی لڑائی ہونے لگی۔ کبھی حضرت عباسؑ نے تلوار ماری، حضرت علی اکبرؑ نے ڈھال پر روکی۔ کبھی حضرت علی اکبرؑ تلوار مارتے تھے تو حضرت عباسؑ ڈھال پر روکتے تھے۔ تلوار کی لڑائی دکھانے کے بعد دونوں دلبروں نے نیزے سنبھال لئے۔

عورتیں بڑی حیرانی سے جنگ دیکھ رہی تھیں۔ مدِمقابل ایک دوسرے پر نیزے پر نیزے کے وار کر رہے تھے اور ہر ایک دوسرے کے وار کو رد کرتا چلا جا رہا تھا۔ کہ اچانک حضرت عباسؑ نے نیزے کو پھرتی کے ساتھ گھمایا اور حضرت علی اکبرؑ کے کلیجے کے سامنے لاکر ایک دم روک دیا۔ حضرت علی اکبرؑ اس وار کی کاٹ نہ کر سکے بالکل نیزے کی زد میں تھے۔

جنابِ زینبؑ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا، فوراً پردے سے نکل کر حضرت علی اکبرؑ کو سینے سے لگالیا اور کہا۔ ہائے! اگر یہ وار نہ رُکتا تو کیا ہوتا! میں کہتا ہوں یہ تو حضرتِ عباسؑ کا ہاتھ تھا، کہیں حضرت عباسؑ کے ہاتھ سے حضرت علی اکبرؑ کے نیزہ تھوڑا ہی لگ سکتا تھا۔ اے جنابِ زینبؑ! اگر آپ کربلا میں حصین ابن نمیر کو اسی سینے میں نیزہ مارتے ہوئے دیکھیں گی تو کیا حال ہوگا۔

حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ میں اتنی شباہت تھی کہ اگر کوئی پیچھے سے دیکھتا تھا تو پہچان نہیں سکتا تھا کہ حضرت علی اکبرؑ ہیں یا حضرت عباسؑ ہیں، حُسن وہ ہے جس کی تعریف دشمن کریں (رُندھی ہوئی آواز میں) بازار میں نیزوں پر سر جا رہے تھے۔ عورتیں کوٹھوں پر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ دیکھا کہ ایک نیزے پر گورا گورا سا خون میں بھیگی ہوئی نورانی سر ہے۔ ایک عورت کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ خدایا! اس جوان کی ماں کو موت آچکی ہو۔ یااللہ! اس کی ماں اس کا لاشہ نہ دیکھے۔

نیزے کے ساتھ ہی حضرت علی اکبرؑ کی والدہ جنابِ اُمِّ لیلیٰ کا اونٹ تھا، فرمانے لگیں۔ بی بی! اس جوان کی ماں کو کیوں کوستی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کی صورت جب ہم سے نہیں دیکھی جاتی تو اگر اس کی ماں دیکھے گی تو اُسکا کیا حال ہوگا۔ حضرت علی

اکبرؑ کی والدہ نے بے قرار ہو کر فرمایا۔ بی بی! اس کی دُکھیاری ماں میں ہی ہوں۔

شب عاشورہ حضرت عباسؑ اور امام حسینؑ خیموں کا پہرہ دے رہے تھے۔ رات کو ہر بچے کی ماں کو دیکھا کہ وہ خیمے میں اپنے اپنے بچوں کو سمجھا رہی ہیں کہ بیٹا! کل امام حسینؑ کی نصرت کا دن ہے۔ تم جناب فاطمہؑ کے لعل پر فدا ہونے میں پیش قدمی کرنا۔ جب اُمّ لیلیٰ کے خیمے کے سامنے آئے تو دیکھا کہ نور کا ٹکڑا شہزادہ علی اکبرؑ بیٹھے ہیں اور ماں ہاتھ میں شمع جلائے بیٹے کی صورت نظریں گاڑے دیکھ رہی ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں کنگھی ہے جو زلفوں میں کر رہی ہیں۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہیں۔ دل میں کہہ رہی ہیں۔ الٰہی! کل کو بھی یہ صورت دیکھنی نصیب ہوگی یا نہیں۔

جب حضرت عباسؑ شہید ہو گئے تو امام حسینؑ نے حضرت علی اکبرؑ سے رو کر فرمایا۔ بیٹا! اب ہم مرنے کو جا رہے ہیں۔ عترت حیدرِ کرار تمہارے سپرد ہے۔ تم اہل حرم کو مدینہ لے کر چلے جانا۔ جناب علی اکبرؑ بے قرار ہو گئے۔ عرض کیا بابا! مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ آپ مرنے کو جائیں اور میں وطن کو جاؤں۔ خدارا! شرمندہ نہ کیجئے۔ جہاں سب کو صبر کیا ہے وہاں اس غلام کو بھی صبر کیجئے اور رضا دیجئے۔ یہ کہہ کر حضرت علی اکبرؑ نے نظریں جھکا لیں اور آنسو بہہ کر رخساروں تک آ گئے۔

حضرت امام حسینؑ نے فرمایا۔ بیٹا! آنسو نہ بہاؤ۔ اگر میں نے ہی صبر کر لیا تو تمہاری والدہ اور جناب زینبؑ کا کیا ہوگا، پہلے ان سے اجازت حاصل کرو۔ ان سے اجازت لینی ضروری ہے۔ حضرت علی اکبرؑ خیمے میں تشریف لائے۔ ماں نے اور پھوپھی نے جب شہزادہ علی اکبر کو روتے ہوئے دیکھا، بے قرار ہو کر پوچھا۔ میرے لال کیوں رو رہے ہو؟ رو کر عرض کیا۔ بابا مرنے کو جا رہے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ وطن چلے جاؤ۔ مجھ سے تو زندہ وطن نہیں جایا جائے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اشقیا بابا کو شہید کریں اور میں گھر کو چلا جاؤں! اماں خدا کے واسطے مجھے اجازت دلوا دیجئے۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ جناب اُمِ لیلیٰ نے دل پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ بیٹا اپنے بابا سے اجازت لو، میں کون چیز ہوں۔ رو کر عرض کیا۔ اماں! میں نے بابا سے اجازت لینے کی بہت کوشش کی

مگر وہ کہتے ہیں کہ پہلے اپنی والدہ اور پھوپھی زینبؑ سے اجازت حاصل کرو۔ اماں! اب میری عزت آپ کے ہاتھ ہے۔ سارا قافلہ جا چکا ہے۔ اگر بابا میرے سامنے شہید ہو گئے تو میں اپنے ساتھیوں سے شرمندہ ہو جاؤں گا۔ منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔

جناب اُمِ لیلیٰ بے چین ہو گئیں۔ روتی جاتی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ بیٹا! دعا کرو کہ مجھے تمہارے اور تمہارے بابا کے سامنے موت آ جائے۔ ہائے! میں کہاں سے زبان لاؤں جو تمہیں مرنے کی اجازت دے دوں۔ حضرت علی اکبرؑ نے ہاتھ جوڑے، بگو گڑا کر کہا۔ اماں جان! دیکھئے! سب عزیز شہید ہو چکے ہیں، اگر میں شہادت سے منہ موڑوں گا تو دُنیا کیا کہے گی؟ چھوٹے بچے تو شہید ہو گئے اور علی اکبرؑ گھر میں بیٹھا رہا۔ وہ کہیں گے کہ اکبرؑ بھی کبھی نہ رُکتا مگر اُس کی ماں کے دودھ کا اثر تھا کہ جان چھپا کر گھر میں بیٹھ گیا۔

جب ماں نے یہ سُنا، دل پھٹنے لگا، بے قرار ہو گئیں۔ کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ کیا دیکھتی ہیں، امام حسینؑ خیمے میں تشریف لا رہے ہیں۔ جناب اُمِ لیلیٰ بیتابانہ دوڑیں اور امام حسینؑ کے قدموں پر گر پڑیں۔ حضرت امام حسینؑ سمجھے کہ بیبیوں نے میرے جنگ کے جانے کو سُن لیا ہے اب یہ مجھے روکنے کے لئے کہیں گی۔ اس پر امام حسینؑ رو رو کر کہنے لگے۔ اُمِ لیلیٰ! اب ہمیں نہ روکئے، ہمارا کوئی مونس و مددگار باقی نہیں رہا۔ میں بیبیوں سے اجازت لینے کے لئے آیا ہوں اور علی اکبرؑ کو گھر سنبھالنے کے لئے چھوڑ دوں گا۔ یہ تمہیں مدینے لے جائیں گے۔

حضرت علی اکبرؑ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ التجا کی نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگے کہ مشکل کشائی کا وقت ہے، میری اجازت کے لئے سفارش کر دیجئے۔ جناب اُمِ لیلیٰ مجبور ہو گئیں۔ ہاتھ جوڑ کر امام سے عرض کیا۔ آقا! اکبرؑ رو رو کر خوشامد کر رہے ہیں اور رخصت کے لئے بے قرار ہیں۔ سب بچوں کو اجازت مل گئی۔ ہائے میرے بچے کو اجازت نہیں ملتی۔ حضرت علی اکبرؑ سر جھکائے کھڑے تھے۔ امامؑ نے جوان بیٹے ہمشکل پیغمبر کی طرف دیکھا اور رو کر فرمایا۔ بیٹا! تم ہم کو تنہا چھوڑے

جا رہے ہو۔ ہائے بوڑھا باپ تمہارے بغیر کیسے جئے گا۔ جب نانا رسولؐ خدا کی زیارت کا مشتاق ہوتا تھا تو تیری صورت دیکھ لیا کرتا تھا۔ تمہاری ماں نے مجبور کر دیا بیٹا! اچھا بیٹا! اجازت ہے۔ مگر یاد رکھو میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔

جب حضرت علی اکبرؑ کو اجازت مل گئی تو میدان کی طرف جانے کے لئے تیار ہوئے۔ چلے تھے کہ ماں نے دامن پکڑ لیا۔ رو کر کہا بیٹا! پھر بھی آ کر یہ چاند سی صورت دکھاؤ گے؟ حضرت علی اکبرؑ ادب سے جھک گئے۔ تسلی کے لہجے میں کہا ہاں۔ اماں ہاں! اگر موت نے وقفہ دیا تو ضرور قدم بوسی حاصل کروں گا۔ حضرت علی اکبرؑ خیمے سے میدان کی طرف چلے۔

حمید ابن مسلم کہتا ہے کہ جب حضرت علی اکبرؑ کے میدان میں نکلنے کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ خیمے کا پردہ بار بار اُٹھتا تھا اور بار بار گرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جیسے ہی اکبر باہر نکلنا چاہتے تھے تو بیبیاں پیچھے سے دامن پکڑ لیتی تھیں اسی طرح کشمکش میں کافی دیر کے بعد حضرت علی اکبرؑ خیمے سے برآمد ہوئے۔ کچھ دور جانے کے بعد خیموں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پیچھے پیچھے حضرت امام حسینؑ آ رہے ہیں۔ خوشامد سے عرض کیا۔ بابا! اب صبر کیجئے۔ آپ صبر و رضا کے مالک ہیں۔ حضرت امام حسینؑ نے سرد آہ بھری۔ زار و قطار رو کر انصاف طلب لہجے میں فرمایا۔ اکبرؑ اگر تمہارے بھی تم جیسا جوان بیٹا ہوتا تو تمہیں معلوم ہوتا کہ جوان بیٹے کا داغ کیسا ہوتا ہے۔ ہائے اکبر تمہیں کیا معلوم؟ باپ پہ کیا گزر رہی ہے۔ حضرت علی اکبرؑ نے نظریں نیچی کر لیں۔ خاموش رہے۔ پھر حضرت امام حسینؑ نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے خود ہی کہا۔ بیٹا جاؤ۔ خدا حافظ۔

حضرت علی اکبرؑ میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ امام حسینؑ نے آسمان کی طرف رُخ کر کے فرمایا اے خدا گواہ رہنا۔ اب تیری راہ میں ایسے فرزند کو بھیج رہا ہوں جو رفتار و گفتار میں تیرے رسولؐ کے مشابہ ہے۔ جب رسولؐ اللہ کی زیارت کا اشتیاق ہوتا تھا تو علی اکبرؑ کو دیکھ لیا کرتا تھا۔

کربلا کے بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ جب حضرت علی اکبرؑ میدان میں پہنچے تو

لوگوں کو رسولؐ خدا یاد آ گئے۔ شرم کے مارے منہ پھیر پھیر کر رونے لگے۔ تاریخ کے الفاظ ہیں کہ چیخیں مار مار کر روئے مگر یہ لوگ یزید کے ہاتھوں دین بیچ چکے تھے وہ علی اکبرؑ تو کیا اگر رسولؐ اللہ خود بھی آتے تو ان کو بھی شہید کر دیتے۔

لڑائی شروع ہوئی۔ عمر ابنِ سعد نے عرب کے مشہور پہلوان طارق بن کثیر کو حکم دیا کہ جناب علی اکبرؑ سے مقابلہ کرے۔ وہ اپنا سر مغرور ہلا کر بولا یہ میری ہتک ہے۔ اس بچے سے جس کی ابھی مسیں بھیگنی شروع ہوئی ہیں، مقابلہ کرنا میری شان کے خلاف ہے۔ اس نے اپنے لڑکے کو حکم دیا کہ جناب علی اکبرؑ کے مقابلے کو جائے۔

طارق کا بیٹا زرہ اور خود میں ملبوس تلوار گھماتا ہوا مقابلے کے لئے نکلا۔ سمجھتا تھا کہ اس تین دن کے بھوکے اور پیاسے کو بآسانی ذبح کر دے گا۔ اُس نے للکار کر بڑی پھرتی سے حضرت علی اکبرؑ پر تلوار سے وار کیا۔ حضرت علی اکبرؑ کو فنونِ جنگ حضرت عباسؑ نے سکھائے تھے۔ شہزادے نے کمال مہارت سے پینترا بدلا وار خالی گیا اور پلٹ کر گردن پر ایسی تلوار رسید کی کہ خاک و خون میں لتھڑ گیا۔

بیٹے کی لاش دیکھ کر طارق بگڑ کر اُٹھا مگر اس کے بھائی نے روک دیا اور کہا کہ میں مقابلے کے لئے جاتا ہوں۔ بھتیجے کا بدلہ لینے کے لئے طارق کا بھائی، حضرت علی اکبرؑ پر حملہ آور ہوا۔ شہزادہ اس کا خون اپنی تلوار کو چٹانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ حضرت علی اکبرؑ نے اس کے وار کو روکا۔ اس نے پھر دوسرا وار کیا۔ شہزادے نے وہ بھی رد کر دیا۔ پھر وہ شقی پے در پے وار کرنے لگا۔ حضرت علی اکبرؑ کمال مہارت سے اُس کے وار کاٹتے جاتے تھے کہ اچانک ایک بھرپور وار ایسا کیا کہ دشمنِ خدا واصلِ جہنم ہوا۔

اب کیا تھا طارق کی نظروں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ بیٹے اور بھائی کا بدلہ لینے کے لئے دوڑ کر حضرت علی اکبرؑ پر وار کیا۔ شہزادے نے وار تلوار پر روکا، اور اپنی تلوار اس کے سر پر ماری۔ طارق نے علی اکبرؑ کی تلوار ڈھال پر روک لی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے پر وار کئے۔ کافی دیر رد و بدل کے بعد ایک دفعہ جو شہزادے کی تلوار چمکی تو شانے سے لے

کر چھاتی تک اُتر گئی۔ دشمنِ خدا کا کام تمام ہوا۔

یہ دیکھ کر عمر ابنِ سعد نے بکر بن غانم کو حضرت علی اکبرؑ کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ یہ پہلوان شامی نسل سے تھا اور بڑا شہ زور تھا۔ شامی پہلوان نے حضرت علی اکبرؑ پر اپنے فنونِ سپہ گری کا مظاہرہ کیا۔ شہزادہ بھی حیدر کرارؑ کا پوتا تھا۔ اس روباہ کو کیا نظروں میں لاتا۔ پھرتی کے چند وار ہی ہونے پائے تھے کہ حضرت علی اکبرؑ نے ایسی تلوار ماری کہ گردن کٹ کر دور جا گری۔

فوج کو حکم ہوا کہ ایک دم سب مل کر حملہ کرو۔ چاروں طرف سے تلواروں، نیزوں اور تیروں کے وار ہونے لگے۔ حضرت امام حسینؑ نے جناب علی اکبرؑ کو دو زرہیں اور سر پر لوہے کا خود پہنچا کر بھیجا تھا۔ ادھر حضرت علی اکبرؑ بھی شیرِ غضبناک کی طرح جھپٹے۔ صحیح روایات بتاتی ہیں کہ شہزادے کا رُخ جس طرف کو ہوتا تھا، فوجیں بھیڑ بکریوں کی طرح پیچھے کو بھاگتی تھیں۔ اور حضرت علی اکبرؑ گھوڑا دوڑاتے ہوئے بجلی کی طرح کبھی بائیں طرف کے لشکر میں گھس جاتے تھے اور کبھی دائیں طرف کی فوجوں میں در آتے تھے یہاں تک کہ فوج میں ابتری پھیلا دی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ جب فوجیں بہت دور پیچھے ہٹ گئیں تو شہزادے نے دیکھا کہ میدانِ کربلا لاشوں سے بھرا پڑا ہے جگہ جگہ زخمی تڑپ رہے ہیں۔

حضرت علی اکبرؑ مقابلے کے لئے کچھ دیر ٹھہرے رہے پھر کچھ سوچ کر بابا کی طرف گھوڑا موڑ دیا۔ امام حسینؑ میدان میں ایک مقام پر کھڑے ہوئے حضرت علی اکبرؑ کی جنگ دیکھ رہے تھے۔ جب حضرت علی اکبر امام حسینؑ کے پاس آئے تو ۶۹ کا غم کھائے ہوئے امام حسینؑ نے فتح مند بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا۔ پیار کیا، کمر پر ہاتھ سے تھپکی دے کر شاباش دی۔ پھر جوشِ مسرت سے روتے ہوئے کہا۔ بیٹا علی اکبرؑ ہم تمہاری جنگ دیکھ رہے تھے۔ تم نے بالکل اپنے دادا حیدر کرارؑ کی طرح دشمنوں کو پسپا کیا۔ حضرت علی اکبرؑ نے سر جھکا کر کہا۔ شکریہ۔ پھر عرض کیا۔ بابا! پیاس مارے ڈالتی ہے۔ هَلْ لَکَ إِلَى الْمَاءِ سَبِيلا۔ کیا پانی ملنے کی کوئی صورت ہے؟ اگر ایک گھونٹ پانی بھی مل جاتا تو پھر ان اشقیا سے ایسی جنگ کرتا کہ یادگار رہتی۔

معزز سامعین! اہل علم کا مجمع ہے۔ حضرت علی اکبرؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب خیموں میں پانی نہیں تھا تو اُنھوں نے امام حسینؑ سے پانی کا کیوں سوال کیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اکثر واعظین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ باپ بیٹے میں بے تکلفی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ حضرت علی اکبرؑ جنگ سے واپس آئے تھے تو ٹھیک دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ گرمی کی شدت، آگ کی طرح جلتا ہوا اسلحہ زیب تن اور پھر جنگ کی مشقت۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ جن سے حضرت علی اکبرؑ کی پیاس بہت بھڑک اُٹھی تھی۔ فطرتِ انسانی ہے کہ اپنے ہمدرد کے سامنے دکھ کی بات ہونٹوں پر آ ہی جاتی ہے اور اس سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ اس لئے حضرت علی اکبرؑ نے بے تکلفی میں باپ سے پیاس کا ذکر کر دیا۔ ورنہ دیکھ لیجئے کہ جناب زینبؑ کے بچوں نے یا کسی اور کے بچوں نے پانی کا سوال نہیں کیا۔ اور حضرت علی اکبرؑ نے بھی پانی کا سوال نہیں کیا۔ بلکہ پانی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بے تکلفی کی بات تھی، پانی مانگنا ہرگز مقصد نہ تھا۔

جواب تو درست ہے لیکن مومنین! انصاف سے بتایئے کہ جس امامؑ کے ۶۹ جاں نثار بغیر پانی کے دُنیا سے اُٹھ چکے ہوں، کیا اس امامؑ کے سامنے پانی کا ذکر کرنا مناسب ہے؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ میرے ذہن میں اس کا جواب یہ آیا ہے۔ جو لوگ علم بیان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام کی ایک قسم "حُسنِ طلب" بھی ہے۔ یعنی کوئی شخص جب صاف لفظوں میں کوئی چیز نہ مانگ سکے تو وہ اس چیز کا ذکر کر دیتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں خود بخود یہ خواہش جاگ اُٹھتی ہے کہ وہ اس کی ضرورت پوری کر دے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ بھوک لگی ہے، مخاطب خود بخود اسے روٹی کھلا دے گا۔

اب آپ جناب علی اکبرؑ کے اُس وقت کے حالات کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھئے تو بات بالکل صاف سمجھ میں آ جائے گی۔ حضرت علی اکبرؑ باپ سے ملنے کے لئے آئے تھے، پانی پینے کے لئے تھوڑا ہی آئے تھے۔ انھیں جلد ہی دوبارہ جنگ کے لئے جانا تھا۔ باپ سے اجازت مانگنی ہے۔ پہلی مرتبہ دیکھ چکے ہیں کہ کس قدر مشکل سے اجازت ملی تھی۔ اب اگر دوسری اجازت میں بھی اتنا ہی وقت لگ جائے تو اتنی مہلت کہاں ہے۔ سامعین

سوچئے! کیا جلدی سے یہ کہہ دیں کہ بابا! مجھے مرنے کے لئے اجازت دے دیجئے۔ نہیں۔ آخری وقت ہے، ایسا جملہ نہیں کہہ سکتے جس سے باپ کے دل کو ٹھیس لگے۔

جناب علی اکبرؑ نے کیا کیا؟ حسن طلب استعمال کیا۔ ایسا جملہ کہا جس میں اجازت مانگی گئی تھی اور مظلوم باپ کے دل کو ٹھیس بھی نہیں لگتی تھی۔ عرض کرتے ہیں: بابا! پیاس مارے ڈالتی ہے۔۔ اگر جملہ یہیں ختم ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ حضرت علی اکبرؑ پیاس سے گھبرا گئے ہیں لہٰذا جملے کو آگے جاری کیا۔۔ هَلْ لَکَ إِلَی الْمَاءِ سَبِیْلًا۔ بابا پانی ملنے کی کوئی سبیل، کوئی تدبیر بتائیے۔

پانی نہیں مانگ رہے، پانی کی طرف کا راستہ پوچھ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ پانی سوائے حوضِ کوثر کے کیا اور کہیں سے مل سکتا تھا۔ حوضِ کوثر کی طرف جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔۔ اب بات سمجھ میں آگئی کہ حوضِ کوثر پر تو مر کر ہی پہنچا جا سکتا ہے، مرنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔

اگر جملہ یہاں بھی ختم ہو جائے تو باپ کا دل ملول رہ جائے گا۔ لہٰذا آگے کو تسلی کے کلمات کہتے ہیں۔۔۔ بابا! اگر ایک گھونٹ پانی مل جاتا تو پھر اشقیا سے ایسی جنگ کرتا کہ یادگار رہتی۔ مطلب یہ کہ بابا ملول نہ ہوئیے۔ میں دشمنوں سے یادگار جنگ کروں گا اور انہیں جنگ کا مزہ چکھاؤں گا۔ اب بتائیے کہ اس طرح اجازت مانگنے سے باپ کو ٹھیس پہنچے گی یا امام کے دل کو ڈھارس ملے گی؟

فصاحت کی یہ بھی شرط ہے کہ جس شخص سے کلام کیا جائے، ضروری ہے کہ اس کی سمجھ میں پوری طرح آ جائے، امام حسینؑ نے بیٹے کے ایک ایک لفظ کا مطلب سمجھ لیا اور اسی رنگ میں جواب دیا۔ تل برابر فرق نہ آنے دیا۔ حضرت علی اکبرؑ نے کہا تھا بابا پیاس مارے ڈالتی ہے۔ امام حسینؑ نے جواب میں کہا: یَا بُنَیَّ هَاتِ لِسَانَکَ۔ بیٹا! اپنی زبان میرے منہ میں دے دو۔ مطلب یہ تھا کہ بیٹا! تم بے تکلفی میں کہتے ہو کہ پیاس مارے ڈالتی ہے، ارے اپنے بابا کو بھی دیکھ لو کہ وہ تم سے بھی زیادہ پیاسے ہیں۔ جونہی حضرت علی اکبرؑ نے اپنی زبان امام کے منہ میں دی۔ فوراً باہر کھینچ لی۔ یَا اَبَتَاہُ اَنْتَ

اَلْعَطَشْ ۔۔ بابا! آپ کی زبان تو میری زبان سے بھی زیادہ خشک ہے۔ باپ کا کام تھا کہ بیٹے کو ڈھارس دیں اور پیاس کی شکایت رفع کریں۔ سامعین! بتایئے! کیا حضرت علی اکبرؑ نے جو پیاس کا اظہار کیا تھا، اس کے جواب کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت ہو سکتی تھی؟ اگر امام معذرت کر لیتے کہ بیٹا پانی تو تین دن سے نہیں ہے، ورنہ تمہیں ضرور پانی پلاتا۔ تو فتح مند بیٹے کے لئے باپ کی طرف سے یہ کوئی مناسب جواب نہ ہوتا۔ یا نبی ابن نبی امام ٹھوکر مار کر زمین سے پانی نکال دیتے اور کہتے۔ بیٹا لو پیو۔ تو یہ بھی مناسب جواب نہ ہوتا۔ اس سے جناب علی اکبرؑ کے دل کو ٹھیس پہنچتی۔ پانی تو خیر نہ پیتے لیکن پانی دیکھ کر پیاسے شہید ہونے والے سب کے سب یاد آجاتے۔ لہٰذا امام نے اپنے منہ میں زبان دینے کو فرمایا۔

حضرت علی اکبرؑ کا دوسرا جملہ تھا: **هَلْ لَكَ إِلَى الْمَاءِ سَبِيْلًا** ۔۔ بابا! کیا پانی ملنے کی کوئی سبیل، کوئی تدبیر ہے؟ جس سے ان کا مطلب تھا کہ حوضِ کوثر کے سوا اور کہاں پانی ملے گا۔ اور حوضِ کوثر پر جانے کا مطلب تھا کہ جنگ کی اور مرنے کی اجازت دے دیجئے۔ امام نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ نہیں بیٹا! کوئی سبیل نہیں۔ اس سے مایوسی ہوتی۔ بلکہ جواب میں فرمایا۔ بیٹا! تمہارے دادا علی مرتضٰےؑ تمہارے منتظر ہیں، وہ تمہیں جامِ کوثر سے سیراب کریں گے۔ سامعین! بات بالکل صاف سمجھ میں آگئی۔ امام نے بیٹے کو پانی کا راستہ بھی بتا دیا، جنگ کی بھی اجازت دے دی، مرنے پر رضا بھی دے دی کہ جاؤ اپنے دادا علی مرتضٰیؑ کے پاس چلے جاؤ۔

اس کے بعد حضرت علی اکبرؑ نے باپ کے دل کو تسلی دینے کے لئے کہا تھا۔ بابا! اگر ایک گھونٹ پانی مل جاتا تو اشقیا سے ایسی جنگ کرتا کہ یادگار رہتی۔ امامؑ نے بھی دیکھا کہ پیاسے بیٹے کو مرنے کی اجازت دے دی ہے اس کا دل ملول رہ جائے گا اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اُتار کر جناب علی اکبرؑ کو دی اور فرمایا: لو بیٹا! یہ انگوٹھی لو۔ اسے اپنے منہ میں رکھ لو۔ جب تک یہ انگوٹھی تمہارے منہ میں رہے گی تمہیں پیاس کی تکلیف نہ ہوگی۔ بیٹے نے صرف ایک گھونٹ کی تمنا ظاہر کی تھی۔ امامؑ نے جنگ کے آخر تک پیاس کی تکلیف سے

بچانے کا انتظام کر کے بھیجا۔

جناب علی اکبرؑ شبیہ پیغمبر نے انگوٹھی منہ میں رکھی۔ بابا کو الوداعی سلام کیا۔ گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے دوبارہ میدان کارزار میں تشریف لائے۔ اتنے میں تمام فوجیں دوبارہ صف بستہ ہو چکی تھیں شہزادے نے صفوں کے آگے گھوڑا روک دیا۔ باآواز بلند رجز پڑھا۔ هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ ۔ ہے کوئی جو مقابلے کو آئے۔ امام حسینؑ کھڑے ہوئے بیٹے کی جنگ دیکھ رہے تھے۔ امامؑ نے دیکھا کہ دشمنوں نے ایک دم شہزادے کو نرغے میں لے لیا ہے۔ ہل چل مچی ہوئی ہے۔ تلواریں چمک رہی ہیں۔ نیزے چل رہے ہیں، تیر برس رہے ہیں۔ اُدھر علی اکبرؑ گھوڑے کو مہیز کئے فوج یزید کے سر اُڑاتے جا رہے ہیں۔ زخمی تڑپ رہے ہیں۔ ادھر کی فوج پیچھے ہٹ جاتی ہے تو اُدھر کی فوج آگے بڑھ آتی ہے۔ کبھی دوسری طرف کی فوج پیچھے ہٹتی ہے تو پہلی طرف کی فوج آگے بڑھ آتی ہے۔ بڑی زور شور کی جنگ ہو رہی ہے۔ شہزادے نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ایک مرتبہ امام نے دیکھا کہ شہزادہ لڑتے لڑتے فوجوں میں در آیا۔ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ امام لڑائی دیکھ رہے ہیں۔ نظریں علی اکبرؑ کو ڈھونڈ رہی ہیں کہ ایک دردناک آواز امامؑ کے کانوں میں آئی۔ یَا اَبَتَاهُ اِدْرِکْنِی۔۔ اے بابا! مدد کے لئے دوڑیئے۔

یہ سُنا تھا کہ امام حسینؑ بے تابانہ میدان کی طرف دوڑے۔ حال یہ تھا کہ بھائی عباسؑ کے مرنے سے کمر جھک گئی تھی اور علی اکبرؑ کا استغاثہ سُنا تو آنکھوں سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ گرتے پڑتے جا رہے تھے۔۔ کہتے جاتے تھے، بیٹا علی اکبرؑ آواز دو۔ تم کدھر ہو۔ بابا کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ جدھر سے حضرت علی اکبرؑ کی آواز آتی، اسی طرف کو تیزی سے دوڑنے لگتے۔ جب گرتے پڑتے زخمی بیٹے کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ جناب زینبؑ پہلے ہی حضرت علی اکبرؑ کے سرہانے موجود ہیں۔ ہائے بیٹے کا غم بھول گئے۔ رو کر فرمایا بہن زینبؑ! یہ کیا غضب کیا۔ ارے میری زندگی میں خیمے سے باہر کیوں نکل آئی ہو۔ بہن کو سمجھا کر خیمے میں واپس کیا۔ بیٹے کے سرہانے بیٹھے سر زانوں پر رکھا۔ دیکھا کہ علی اکبرؑ نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا ہوا ہے اور حالت یہ ہے کہ کبھی ایک پیر کو کھینچتے ہیں تو دوسرا پھیلا لیتے

ہیں اور کبھی دوسرا کھینچتے ہیں تو پہلا پیر پھیلا لیتے ہیں۔

امامؑ نے آہ بھر کر بیٹے سے کلام کیا۔ جانِ پدر! باپ کو پکار رہے تھے۔ لو باپ آ گیا۔ میرے لال! کیوں پیروں کو کھینچ رہے ہو، دل پر کیوں ہاتھ رکھا ہے؟ جناب علی اکبرؑ نے عرض کی۔ آہ بابا! سینے میں برچھی لگی ہے۔ اُف کیا کروں۔ بابا برچھی کا پھل ٹوٹ کر سینے میں پیوست ہو گیا ہے۔ ہائے اُف۔۔ بابا! سینے سے برچھی کا پھل نکال دیجیے۔

امامؑ نے آہستہ سے اکبرؑ کا سر زانوں سے ہٹا کر زمین پر رکھ دیا۔ جلتی ریت پر اکبر گردن پلٹنے لگے۔ امامؑ نے جھک کر برچھی کا پھل ہاتھ میں پکڑا، اوپر کھینچنے لگے۔ کھینچے کھینچتے جناب علی اکبرؑ کا جسم زمین سے اوپر اُٹھ آیا۔ مگر برچھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ امامؑ نے ایک ہاتھ بیٹے کے سینے پر ٹیک کر زور لگایا۔ برچھی نہ نکلی۔

ہائے امامؑ برچھی کا پھل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی مدد کرنے والا نہ تھا۔ اکبر پیر پھیلا اور کھینچ رہے تھے۔ بے کسی کا عالم تھا۔ بوڑھے باپ سے جوان بیٹے کی بیقراری دیکھی نہ گئی۔ خلیلِ کربلا نے آستینیں چڑھائیں جناب علی اکبرؑ کے اوپر جھکے اور دونوں ہاتھوں سے برچھی کے پھل کو مضبوطی سے پکڑا۔ یَا عَلِیُّ اِدْرِکْنِیْ۔۔ کہہ کر اوپر کو کھینچا۔ تین شاخوں والی برچھی سینے سے باہر نکل آئی۔ دیکھا کہ جناب علی اکبرؑ کا دل بھی برچھی میں بندھا ہوا باہر آ گیا۔ گھبرا کر بیٹے کے چہرے پر نظر کی۔ جناب علی اکبرؑ نے ایک ہچکی لی اور دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

ہائے ہائے امام تنہا رہ گئے۔ بڑی حسرت سے کہا۔ بیٹا علی اکبرؑ! اب ہم زیادہ دیر دنیا میں نہ رہیں گے۔ ہم بھی تمہارے پیچھے آتے ہیں۔ ہائے آستینیں چڑھائیں بیٹے کا لاشہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ بمشکل تمام لاشہ اُٹھایا۔ خیمے کی طرف لے کے چلے حضرت علی اکبرؑ کے پیر زمین پر خط دیتے جاتے تھے۔ جب خیمے کے قریب پہنچے۔ بچے دوڑ کر آ گئے۔ تین طرف سے بچے لاشہ اُٹھائے ہوئے تھے۔ ایک طرف امام تھے۔ لاش درِ خیمہ پر آئی۔ جناب لیلیٰ پچھاڑیں کھا کر لاش پر گر پڑیں۔ ہائے علی اکبرؑ اب کسے دولہا بناؤں گی۔ ہائے

میرے لال! تجھے اٹھارواں سال راس نہ آیا۔ بیٹا علی اکبرؑ! ماں کو بھی ساتھ لے چلو۔ ہائے اب میں زندہ نہیں رہوں گی۔ بیبیاں اور بچے جناب علی اکبرؑ کی لاش کے گرد سر پیٹ رہے تھے۔ خیمے میں کہرام برپا تھا کہ میدان سے آوازیں آنے لگیں۔ حسینؑ آؤ۔ یا کوئی اور ہے تو اُسے بھیجو۔ امامؑ نے فرمایا۔ بیبیو! حسینؑ کا آخری سلام لو۔ اب ہم میدان کو جارہے ہیں۔ ہائے بیبیاں رونا بھول گئیں جناب علی اکبرؑ کی لاش کو چھوڑ کر امام سے لپٹ گئیں اور کہا۔ ہمیں کس پر چھوڑے جارہے ہیں۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

☆☆☆

بارھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ۝ (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغِ رسالت کا اپنے اقربا کی محبت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا ہوں۔

یہ بات بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی نبی تبلیغ کرے تو اس کے بدلے میں ہم سے معاوضہ مانگے۔ اور رسولؐ اللہ کی ذات تو سب نبیوں سے اعلیٰ و افضل ہے پھر یہ بات ان کی شان کے بھی خلاف ہے کہ بندوں نے خود تبلیغ نہیں کرائی ہے بلکہ وہ تو تبلیغ کی اتنی مخالفت کرتے تھے کہ مکے میں رسولؐ اللہ پر کفار کی سختیاں مشہور ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ایک تو بندے تبلیغ کرانا نہیں چاہتے اور اُوپر سے اِن سے معاوضہ مانگا جارہا ہے۔

قل کا لفظ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ معاوضہ رسولؐ اللہ نے خود نہیں مانگا بلکہ خدا نے انھیں

حکم دیا ہے کہ اے رسولؐ! اس طرح کہہ دو۔ انھوں نے اسی طرح کہہ دیا۔ رسول اللہؐ تو خدا کا پیغام پہنچانے والے ہیں، انھوں نے معاوضے کا سوال خود نہیں کیا ہے۔ معلوم ہوا دراصل معاوضہ مانگنے والا اللہ ہے۔

اللہ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو دیتا ہے، ان پر اپنی بخشش اور کرم کرتا ہے۔ انھیں اچھی باتیں بتاتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ہر طرح سے مہربان ہے۔ مگر اپنے کاموں کی اُجرت نہیں لیتا۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ محبت یا کسی چیز کا سوال کرے، اور سوال بھی ہم جیسے خاکی بندوں سے کرے جو کسی قابل نہیں بلکہ ہر وقت اُسی سے مانگتے رہتے ہیں؟

خدا نے جو کچھ بھی کیا ہے، وہ سب اپنے بندوں کی بہتری ہی کے لئے کیا ہے وہ ہمیشہ اپنے بندوں کی بھلائی کا خیال رکھتا ہے۔ اُس نے ہمیں جو بھی احکام دیے ہیں وہ سب ہمارے ہی فائدہ کے لئے ہیں۔ جس طرح آپ اپنے بچے کی بھلائی کے لئے بیماری کے وقت اسے کڑوی دوائی پلاتے ہیں یا ٹیکہ لگواتے ہیں۔ لیکن آپ کا بچہ روتا چیختا ہے اور وہ نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ اسی کی بھلائی کے لئے ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہم ہیں کہ خدا بہت سے کام ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ مگر ہماری عقلیں اس کی مصلحت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس نے اگر اقربا سے محبت کرنے کا سوال کیا ہے تو اس حکم میں بھی یقیناً ہمارا ہی نفع ہے۔ ہماری ہی بھلائی ہے۔

ماہرین نفسیات جانتے ہیں کہ قیمت سے کسی چیز پر دو اثر پڑتے ہیں: اول یہ کہ اس چیز کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ آپ کو جو چیز مفت مل جاتی ہے، اس کو آپ مال مفت دل بے رحم کی طرح اُڑاتے ہیں لیکن جس چیز کی آپ قیمت ادا کرتے ہیں، اسے سنبھال کر رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ خداوند عالم کو اقرباء کی قدر و منزلت منظور تھی اس لئے ان کی قیمت مقرر کی۔

دوسرا اثر قیمت کا یہ پڑتا ہے کہ جب تک قیمت ادا نہ کی جائے۔ اس وقت تک وہ چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ جب تک اقربا سے محبت نہ کی جائے اس وقت

تک تبلیغ رسالت حاصل نہ ہو سکے گی۔ لوگ کہیں گے کہ تبلیغ نہ پہنچنے کا کیا مطلب؟ تمام تبلیغ، قرآن ہے اور قرآن ہمارے قبضے میں ہے۔ اب ہماری مرضی ہے کہ اقربا کو اجر دیں یا نہ دیں۔ قرآن تھوڑا ہی ہم سے کوئی چھین سکتا ہے، تبلیغ پر ہم قابض ہو چکے ہیں۔

میں عرض کروں گا کہ قرآن پر تم قابض نہیں ہو اور نہ ہمیں تبلیغ پہنچی ہے۔ بھائی! تبلیغ تو اس وقت تک پہنچ ہی نہیں سکتی جب تک کہ اس کی قیمت ادا نہ ہوگی۔ اور جو قرآن آپ کو ملا ہے، اسے میں سمجھاتا ہوں کہ وہ آپ کو کیا ملا ہے؟

اگر آپ اپنے خادم سے کہیں کہ آگ روشن کرو۔ تو آگ اس وقت تک روشن نہیں ہو سکتی جب تک چار مراحل سے نہ گزرے۔ پہلے آگ کا تصور آپ کے ذہن میں آئے گا کہ آگ روشن کرنا ہے۔ یہ وجود ذہنی ہے۔ پھر آگ کا لفظ ذہن سے بڑھ کر زبان پر آیا اور ہوا میں پھیل کر نوکر کے کان میں گیا اور اس کے دماغ میں بھی آگ کا تصور پیدا کر دیا۔ یہ وجود صوتی یعنی آواز کا وجود کہلاتا ہے پھر آگ لکھ دیا۔ اسے وجود تحریری کہتے ہیں۔

یہ ذہنی وجود، صوتی وجود اور تحریری وجود سب آگ ہی کے وجود ہیں۔ لیکن سچ بتایئے! کیا ان میں جلانے کی قوت ہے؟ آگ کا تصور کرنے سے دماغ میں حرارت نہیں آسکتی، آگ کہنے سے زبان نہیں جلا کرتی اور آگ لکھنے سے شعلے بلند نہیں ہوتے۔ شعلے تو اسی آگ سے اٹھیں گے جو اصلی وجود ہوگا۔ معلوم ہوا سابقہ تینوں وجود اثر سے خالی ہوتے ہیں جو کچھ ہوتا ہے وہ چوتھے وجود اور اصلی وجود میں ہوتا ہے۔ (صلوٰۃ)

اسی طرح قرآن کو سمجھ لیجئے۔ جب خدا کے پاس سے چلا تو وحی کہلایا، جب رسولؐ کی زبان پر آیا تو قرآن کہلایا اور جب لکھا گیا تو کتاب کہلایا۔ وحی تو ہم سُن نہیں سکتے، وہ تو رسولؐ پر آتی ہے۔ لہٰذا وحی تو ہمارے ہاتھ نہیں آسکتی۔ اب آیئے اصوتی وجود، وحی کے لفظ رسولؐ اللہ کی زبان سے نکلے، جیسے ہی رسولؐ اللہ نے قرآن تلاوت کیا۔ ہم نے لکھ لیا۔ لیجئے ہم تک قرآن اور کتاب پہنچ گئی۔ یہی ہے نا آپ کا مطلب کہ قرآن ہمارے قبضے میں آگیا۔

اچھا! وحی آئی تھی الف لام میم (الٓمٓ) رسولؐ اللہ کی زبان پر بھی یہی لفظ آئے اور ہم نے یہی لفظ لکھ لئے۔ اب بتایئے! ہمارے پاس کیا آیا اور ہم نے کیا سمجھا؟ دوسری مثال، پھر وحی آئی الف لام را (الٓرٰ) ہم نے وہ بھی لکھ لیا۔ مگر سمجھے کیا؟ جی کچھ نہیں۔ پھر آگے وحی آئی وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا ہم نے یہ بھی لکھ لیا۔ کیا سمجھے؟ جی! اللہ کی رسیّ ن کو مضبوط پکڑ لو (ہنس کر) بتایئے! اللہ کے کہیں رسیاں ہیں جو ہم پکڑ لیں؟ پھر کیا ہوا۔ علما نے اپنے قیاس سے کچھ نہ کچھ معنی بتا دیئے۔ بھلا بتایئے! قیاسی معنی کہیں اصلی مفہوم تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔ نہیں پھر دوسری آیتیں آئیں، روزہ نماز کے احکام آئے۔ کوئی ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے لگا۔ کوئی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے لگا، کسی نے پہلے روزہ افطار کر لیا، کسی نے بعد میں روزہ افطار کیا کیوں بھائی! اگر علماء کے پاس آیات کا صحیح مفہوم ہوتا تو یہ تفرقہ کیوں پڑتا؟ لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن ہمارے قبضے میں ہی نہیں ہے۔ نہ ہی تبلیغ ہم تک پہنچی ہے اور نہ ہی کتاب کا اصل مفہوم ہمیں ملا ہے۔ جناب! اگر آپ بھٹی کے اندر "آگ" کا لفظ لکھ دیں تو کیا اس سے بھٹی گرم ہو جائے گی۔۔؟ اسی طرح اگر آپ خوبصورت حمائلوں میں قرآن لکھ لیں تو کیا اس سے آپ کو اصل مفہوم حاصل ہو سکے گا؟ بھلا کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کسی نے قیمت نہ لی ہو اور اپنی چیز دوسرے کے قبضے میں دے دی ہو۔ تو پھر جناب رسولؐ اللہ قیمت لئے بغیر قرآن آپ کے قبضے میں کیسے دے سکتے تھے؟ کچھ آتی ہے بات آپ کی سمجھ میں! (صلوٰۃ)

قرآن کا اصل مفہوم اور منشائے باری تعالیٰ آپ کو اسی وقت معلوم ہو سکے گا جب آپ معاوضہ ادا کریں گے۔ جب تک آپ معاوضہ ادا نہیں کرتے، منشائے باری تعالیٰ کو پا نہیں سکتے اور جو منشائے باری تعالیٰ کو بتائے گا، وہی اصل قرآن کا وجود کہلائے گا، وہی قرآن ناطق ہوگا۔ خداوند عالم سورۂ دہر میں ارشاد فرماتا ہے: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ اے اہلِ بیتؑ! تم اللہ کے منشاء کے سوا کچھ چاہتے ہی نہیں ہو۔

جس طرح اِلَّا کا لفظ اِلَّا الْمَوَدَّۃَ میں آیا تھا اسی طرح اِلَّا کا لفظ یہاں اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ میں آیا ہے یعنی اہلِ بیت کا صرف ایک ہی منشا ہے اور وہ وہی ہے جو

اللہ کا منشاء ہے۔ معلوم ہوا کہ وحی رسولؐ اللہ پر آتی ہے۔ مگر خدا کے منشا کو اہلِ بیتؑ پورا کرتے ہیں۔ کلامِ خدا حضرت محمدؐ پر نازل ہوتا ہے مگر اس کا مفہوم اہلِ بیتؑ سمجھاتے ہیں، ارشاداتِ الٰہی حضورِ سرکارِ دو عالم پر اُترتا ہے مگر اس پر عمل اہلِ بیتؑ کرکے دکھاتے ہیں۔ اسی لئے تو رسولؐ اللہ قرآن لوگوں کے پاس چھوڑ گئے کیونکہ جانتے تھے کہ جب تک اہلِ بیتؑ کو معاوضہ نہ دیں گے۔ قرآن کا منشاء ہی نہ سمجھ سکیں گے۔ (صلواۃ)

کتابِ صامت سے آپ منشائے خداوند عالم معلوم نہیں کرسکتے۔ منشائے قدرت تو وہی بتائے گا جو کتابِ ناطق ہوگا۔ اسی لئے منبرِ رسولؐ پر حضرت علیؑ نے اعلان فرمایا سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِی ۔ جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو، قبل اس کے کہ میں تم میں نہ رہوں۔

الفاظ اور مفہوم میں جدائی نہیں ہوسکتی۔ قرآن الفاظ ہے اور اہلِ بیتؑ، اس کے معنی ہیں۔ تب ہی تو رسولؐ اللہ نے حدیثِ ثقلین میں فرمایا تھا کہ ان میں جدائی نہیں ہوسکتی یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔

قرآن کی شان یہ ہے کہ وہ رسولؐ خدا کی زبان پر جاری ہوتا ہے۔ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ۔ رسولؐ بغیر وحی کے کلام ہی نہیں کرتا۔ اور خداوندِ عالم کا منشاء وہ ہے جو اہلِ بیتؑ عمل کرکے دکھاتے ہیں۔ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ ۔ جو اہلِ بیتؑ کا منشا ہوتا ہے وہی اللہ کا منشا ہوتا ہے۔ (صلواۃ)

اچھا یہ بتایئے جو کسی کے مفہوم کو نہ سمجھے کیا وہ اس کے منشا کو پورا کرسکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مستری کسی عام آدمی سے کہے کہ ذرا پیچ اُٹھادو، تو وہ اُسے ہتھوڑا اُٹھادے گا۔ کیونکہ وہ اصل مفہوم کو نہ سمجھتا۔ اب دیکھئے کہ جب اہلِ بیتؑ خدا کے منشا کو پورا کرتے ہیں تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے مفہوم کو نہ سمجھتے ہوں؟ نہیں بلکہ وہ قرآن کے ایک ایک حرف کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا۔ فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے معلوم کرلو۔ یہ تمہیں حروفِ مقطعات، آیاتِ متشابہات اور آیاتِ بینات کا مطلب سمجھادیں گے۔

رسولؐ اللہ نے ان کو پہچنوانے کے لئے ہر قسم کا اہتمام کیا اور بار بار مسلمانوں کو ان کی معرفت کرائی۔ کبھی اہلِ بیت کو میدانِ مباہلہ میں لے گئے۔ کبھی امام حسینؑ کو حالتِ نماز میں پشت پر سوار کر کے بتایا، کبھی عید کے دن امام حسینؑ و امام حسنؑ کو کاندھوں پر چڑھا کر شناخت کرائی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ امام حسنؑ و امام حسینؑ چھوٹے تھے۔ عید آگئی۔ بچوں نے ماں سے کپڑوں کا سوال کیا۔ خدا نے جنت سے دو جوڑے بھیج دیئے۔ رسولؐ اللہ گھر سے عید گاہ کو نماز پڑھانے کے لئے چلے۔ امام حسنؑ و امام حسینؑ بھی ساتھ ہو گئے۔ جوانانِ جنت کے سردار رسولؐ اللہ کے ساتھ عید گاہ کی طرف جا رہے ہیں آپ کہیں گے کہ سردار تو وردی سے پہچانے جاتے ہیں۔ لہٰذا شہزادے آج جنت سے آئی ہوئی پوشاک زیبِ تن کئے ہوئے ہیں کہ دُنیا جنت کے سرداروں کو پہچان لے۔

آج کل لاہور کی شاہی مسجد میں رمضان کے جمعۃ الوداع کی نماز پڑھنے کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔ پھر کیا رسولؐ اللہ کے پیچھے عید کی نماز پڑھنے کے لئے صرف مدینہ شہر کے لوگ آئے تھے؟ نہیں بلکہ معلوم کس کس شہر سے لوگ آئے ہوں گے۔ ایک بڑا مجمع ہے۔

رسولؐ خدا گھر سے برآمد ہوئے۔ امام حسنؑ و امام حسینؑ ساتھ ہیں۔ جنت کے سرداروں کی وردی پہنے ہوئے ہیں۔ بچے نانا سے کہنے لگے۔ نانا جان! لوگوں کے پاس سواریاں ہیں، ہمارا اونٹ کہاں ہے؟ اگر رسول خدا کے پاس اونٹ نہ تھا تو کسی صحابی سے اونٹ منگا کر دے سکتے تھے۔ مگر نہیں ایسا نہیں کیا۔ وہ رسولؐ جو بغیر وحی کے کلام نہیں کرتے تھے آج فوراً جھک گئے اور ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے۔ اونٹ کی شبیہ بن کر فرمایا۔ فرزندو! میں تمہارا ناقہ ہوں۔ معلوم ہوا جانوروں کی شبیہ خود رسولؐ اللہ نے بن کر دکھایا۔ ذوالجناح کو بدعت مت کہو! اگر شبیہ بدعت ہے تو سب سے پہلی بدعت رسولؐ اللہ کر رہے ہیں!

خیر رسولؐ اللہ اونٹ بنے۔ بچے اُن پر سوار ہوئے۔ پھر بچوں نے کہا۔ نانا جان! سب کے ناقوں کی تو مہار ہے۔ ہمارے ناقے کی مہار کہاں ہے؟ رسولؐ اللہ نے اپنی

ایک زلف امام حسنؑ کے ہاتھ میں دے دی اور دوسری امام حسینؑ کے ہاتھ میں دے کر فرمایا، لو یہ تمہارے ناقے کی مہار ہے۔

معزز سامعین! کیا اس موقع پر دریافت کروں کہ یارسولؐ اللہ! آپ بغیر وحی کے کلام نہیں کرتے لیکن آج امام حسنؑ و امام حسینؑ کے کہنے پر چل رہے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ زلفوں کو مہار کہہ کر ان کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جناب! مہار کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ جس طرف کو سوار چاہے، سواری کو موڑ دیتا ہے۔ اب اگر امام حسنؑ و امام حسینؑ آپ کی مہار گھر کی طرف موڑ دیں تو آپ کو گھر واپس جانا پڑے گا۔ آپ تو بغیر وحی کے کچھ کر نہیں سکتے اور اب بچوں کے کہنے پر چل رہے ہیں؟ تو شاید رسولؐ پاک اس کا جواب یہ دیں کہ یہی تو سمجھا رہا ہوں کہ یہ خدا کی منشاء ہیں۔ یہ مجھے اسی طرف موڑیں گے جدھر کو خدا کا منشا ہو گا۔ (صلوٰۃ)۔۔ دُنیا والو! دیکھ لو! کہ رسالت آج امامت کے اشارے پر چل رہی ہے۔ جدھر کو امامت چاہے رسالت کو موڑ دے۔

جب بچوں نے مہار پکڑ لی تو کہنے لگے۔ نانا جان! سب کے ناقے تو بولتے ہیں لیکن ہمارا ناقہ نہیں بولتا۔ رسولؐ اللہ نے ایک دفعہ امام حسنؑ کے کہنے سے اور دوسری دفعہ امام حسینؑ کے کہنے سے کہا۔ اَلْعَفُو ، اَلْعَفُو۔ فوراً جبرائیل نازل ہوئے اور کہا۔ یارسول اللہ! خدا فرماتا ہے کہ اب تیسری مرتبہ اَلْعَفُو نہ کہنا، دوزخ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام حسنؑ کے کہنے سے کہا۔ اَلْعَفُو یعنی حسنؑ کے دوستوں کو بخش دے، ان پر دوزخ ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر دوبارہ کہا تو امام حسینؑ سے محبت رکھنے والوں کے لئے دوزخ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب چونکہ دوسروں کے لئے دوزخ ٹھنڈا کرنا نہیں تھا، اس لئے فوراً حضرت جبرئیلؑ منع کرنے کے لئے آ گئے کہ اب کہیں اَلْعَفُو نہ کہہ دینا۔ (صلوٰۃ)

رسولؐ اللہ نے خدا کی آیتوں پر عمل کر کے اقربا کو اتنا پہچنوایا کہ کوئی دوسرا اتنا تعارف نہیں کرا سکتا تھا۔ ان اقربا کو ہر مسلمان جانتا ہے اور زبان سے بھی اقرار کرتا ہے، مگر اقرار کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ علامتیں بھی ہونی چاہئیں۔ دوست دشمن آزمائش کے وقت پہچانے جاتے ہیں۔ دُنیا کے تمام انسان خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہیں، لیکن ان

کے عمل سے پتہ لگتا ہے کہ کون خدائے لاشریک کو ماننے والے ہیں اور کون غیروں کے سامنے جھکنے والے ہیں۔

اسلام کے تمام فرقے کم از کم امام حسینؑ کو تو رسولؐ اللہ کا اقربا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ ان کے اعمال بھی امام حسینؑ کی محبت اور موافقت میں ہونے چاہئیں۔ ان کے حالات کو بیان کر کے اور سن کر انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا چاہیئے۔ ان کی مصیبت سن کر اشک بہانے چاہئیں۔ لیکن اگر کوئی امام حسینؑ کا تذکرہ بند کرنے کی کوشش کرے تو پھر ویسا ہی اسلام ہوگا جیسا یزید پھیلانا چاہتا تھا۔

آہ! مسلمانوں کی تاریخ کس قدر شرمناک ہے کہ جس رسولؐ کا کلمہ پڑھتے تھے اسی کے اقربا پر وہ ظلم ڈھائے کہ دُنیا حیران رہ گئی۔ ایران کے شہر تبریز میں محرم کے عاشورہ میں بجائے جلوس نکالنے کے وہ لوگ واقعہ کربلا کو عمل کر کے پیش کرتے تھے۔ ایک طرف یزید کی فوج ہوتی تھی اور دوسری طرف امام حسینؑ اور اُن کے مختصر ساتھی ہوتے تھے۔ فرضی لڑائی دکھائی جاتی تھی۔

ایک سال جب محرم آیا تو انھوں نے امام حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کا کام کرنے کے لئے آدمی تیار کیے اور دوسری طرف یزید اور اُس کی فوج بنائی۔ تمام افسروں کا کردار ادا کرنے کے لئے تو آدمی مل گئے یہاں تک کہ ابن سعد اور شمر بننے کے لئے لوگ تیار ہو گئے مگر حرملہ کا کام کرنے کے لئے کوئی رضامند نہ ہوتا تھا۔

آخر کار ایک غیر مسلم شخص کو کچھ اُجرت دے کر لایا گیا۔ اسے تیر و کمان دے کر یزید کی فوج میں کھڑا کر دیا اور سمجھا دیا کہ جب ایک شخص جس کو حسینؑ کہتے ہیں، اپنے ہاتھوں پر ایک بچہ لے کر آئے اور پانی کا سوال کرے، اُس وقت تو تیر مار دینا۔

وہ تیر و کمان لئے ہوئے یزید کی فوج میں کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے بچے گھوڑوں پر آ کر تنہا لڑے اور انھیں یزید کی فوج نے دوڑ کر چاروں طرف سے گھیر لیا اور شہید کر دیا۔ ایک بوڑھا شخص آیا اور روتا ہوا ان کی لاشیں اُٹھا کر لے گیا۔ یزید کی فوج میں فتح اور خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

دوسری طرف چھوٹے چھوٹے بچے ہاتھوں میں پیالے لئے ہوئے ہائے پیاس ہائے پیاس کہتے ہوئے اور روتے ہوئے پھر رہے تے۔ یہ شخص دیکھتا رہا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ حضرت علی اکبرؑ میدان میں آئے، خوب لڑے اور شہید ہو گئے۔ امام حسینؑ اُن کی لاش بھی روتے ہوئے اُٹھا کر لے گئے۔

پھر خیمے سے ایک شیرخوار بچے کو ہاتھوں پر لے کر آئے۔ منتظم نے اس شخص کو آگاہ کیا کہ جب امام حسینؑ بچے کے لئے پانی مانگیں تو اُس وقت تو تیر چلا دینا۔ وہ اپنی تیر کمان سنبھال کر ہوشیار ہو گیا۔ امام حسینؑ فوج کے سامنے آئے اور کہا: اے میرے نانا کا کلمہ پڑھنے والو! میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا۔ یہ بچہ بے قصور ہے۔ اس کی ماں کا دودھ خشک ہو گیا ہے۔ پیاس سے اس کی جان پر آبنی ہے۔ اگر تمہیں کچھ خوف خدا ہے تو اس بچے کے منہ میں چند قطرے پانی کے ڈال دو۔

امام حسینؑ کا یہ کلام سُن کر وہ شخص رونے لگا اور تیر کمان پھینک دیا۔ کہنے لگا۔ مجھ سے اس بچے کے تیر نہیں مارا جا سکتا۔ ہائے! وہ کون ظالم تھا جس نے اس بچے کے تیر مارا تھا۔ اللہ! اللہ! غیر مسلموں پر تو امام حسینؑ کے مصائب کا یہ اثر ہو اور مسلمان ان کا حال سُننا بھی گوارا نہ کریں۔

تمام تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ جب امام حسینؑ کے سب عزیز و اقارب شہید ہو چکے اور آپ یکہ و تنہا رہ گئے تو میدان میں آ کر ایک بلند مقام پر کھڑے ہوئے اور استغاثہ بلند کیا هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا. هَلْ مِنْ مُغِيثٍ يُغِيثُنَا ۔ ہے کوئی جو میری مدد کے لئے آئے۔ ہے کوئی جو میری امداد کو پہنچے۔ خدا مصیبت کے وقت کسی کو تنہائی نہ دے۔ امام حسینؑ بے یار و مددگار ہیں۔ ہر طرف تلواریں چمک رہی ہیں۔ نیزے بلند ہیں۔ خون کے پیاسے تیر کمان لئے بیٹھے ہیں۔ جیسے ہی امام حسینؑ کا استغاثہ بلند ہوا میدان کربلا میں شہیدوں کی لاشیں تڑپنے لگیں۔ بعض کا بیان ہے کہ اُٹھ اُٹھ کر گرنے لگیں۔

خیمے میں کہرام برپا ہو گیا اور بیبیوں میں رونے کا شور اس قدر بلند ہوا کہ گمان

ہوتا تھا، شاید کوئی مر گیا ہے۔ امام خیمے کی طرف دوڑے۔ در خیمہ پر جناب فضہ کی حالت غیر ہے۔ امام گھبرائے ہوئے خیمے میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ علی اصغرؑ کی ماں بچے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ بی بی نے رو کر کہا۔ یا امامؑ؟ جب سے علی اصغرؑ نے استغاثہ سنا ہے، بے قراری سے رو رہے ہیں، کسی طرح نہیں چپ ہوتے اور اپنے آپ کو بار بار جھولے سے گرا دیتے ہیں۔ دودھ سے بھی منہ پھیر لیا ہے۔

امامؑ نے فرمایا۔ لاؤ! میرے علی اصغرؑ کو مجھے دے دو، میں اسے پانی پلانے کے لئے لے جاتا ہوں۔ جناب علی اصغرؑ کی والدہ نے بچے کو امامؑ کی گود میں دے دیا۔ امام حسینؑ نے دیکھا کہ بچے کی آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں۔ پھول سا چہرہ کملایا ہوا ہے۔ ہونٹ خشک ہیں۔ زبان پر کانٹے جمے ہوئے ہیں۔ رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔ رو کر فرمایا۔ آہ! میرے علی اصغرؑ کو بھی اجل لینے آ گئی ہے۔

جب امام حسینؑ بچے کو لے کر میدان کی طرف چلنے لگے تو سب بیبیوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر روتے ہوئے کہا۔ اللہ نگہبان۔ اللہ نگہبان۔ صبح سے دیکھ رہی تھیں کہ جو بھی میدان کی طرف جاتا ہے، زندہ واپس نہیں آتا۔ جناب بانوؑ کی آواز آئی۔ مولا! میرے بچے کی ایک دفعہ صورت اور دکھا دیجئے۔ امام حسینؑ پلٹ آئے، عبا کا دامن بچے کے اوپر سے ہٹایا۔ ماں نے بچے کی صورت دیکھی جھک کر منہ چوم لیا۔ پیار کرنے لگیں۔ امامؑ نے کہا۔ بس بانو! صبر سے کام لو۔ ماں نے بڑی مشکل سے گریہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اچھا میرے علی اصغرؑ! خدا حافظ۔ خدا حافظ۔

حضرت علی اصغرؑ نے ذرا دیر کے لئے آنکھیں کھولیں۔ اشارے سے ماں، پھوپھیوں کو سلام کیا۔ امام حسینؑ میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ دھوپ بڑی سخت تھی۔ حضرتؑ نے اپنی عبا کا دامن بچے پر ڈال دیا۔ جب اشقیا نے دیکھا تو فوج میں غل پڑ گیا کہ امام حسین قرآن لا رہے ہیں اور شاید صلح کرنا چاہتے ہیں۔

امام حسینؑ فوج کے سامنے آئے۔ عبا کا دامن اُٹھایا۔ لوگوں نے دیکھا، قرآن ناطق کا ایک ورق ہاتھوں پر ہے۔ امامؑ نے انصاف طلب لہجے میں فرمایا۔ اے لوگو! تم

نے ہمیں مہمان بلایا تھا۔ یہ علی اصغرؑ بھی تمہارا مہمان ہے۔ اب اگر تمہاری نظروں میں ئیں خطاوار ہوں تو اس بچے کا کیا قصور ہے؟ تین دن سے خیموں میں پانی نہیں ہے، اس کی ماں کا دودھ خشک ہو چکا ہے۔ پیاس سے بچہ جاں بلب ہے، چند لمحوں کا مہمان ہے۔ اگر مجھ تو اس کو جام بھر کر نہ دو، صرف ایک چلو پانی ہی دے دو کہ اس کے ہونٹ تر ہو جائیں۔

مگر کسی نے جواب نہ دیا اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے بعض فوجیوں کی تو یہ حالت ہوئی کہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ کچھ سپاہی ابن سعد کے پاس بھی گئے اور سفارش کی کہ ہم سے یہ حال نہیں دیکھا جاتا۔ حسینؑ کے بچے کو تھوڑا سا پانی دینے کی اجازت دے دے۔

ادھر جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ کوئی پانی نہیں دیتا تو جناب علی اصغرؑ کو جلتی ریت پر لٹا دیا۔ خود پیچھے ہٹ گئے اور کہا کہ اے لوگو! اگر تمہیں یہ گمان ہو کہ میں بہانے سے خود پانی پی لوں گا تو لو۔ میں نے بچے کو زمین پر لٹا دیا ہے تم خود اس کے منہ میں پانی ڈال دو۔ اس پر بھی کسی نے پانی نہ دیا تو حضرت نے گھبرا کر علی اصغرؑ کو گود میں اُٹھا لیا کہ ریت تپ رہی تھی۔ رو کر بچے سے فرمایا۔ بیٹا! تم حجت خدا کے پسر ہو۔ اپنی زبان ہونٹوں پر پھرا کر حجت تمام کر دو۔ آہ! بچے نے خشک زبان ہونٹوں سے باہر نکالی امام نے علی اصغرؑ کو ہاتھوں پر اُٹھا کر ادھر اُدھر رُخ کر کے ہر طرف کی فوج کو دکھانا شروع کیا، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ساری فوج میں ہل چل مچ گئی۔ لوگ منہ پھیر پھیر کر اور چیخیں مار کر رونے لگے۔ کچھ لوگوں نے ابن سعد کے گھوڑے کو آ کر گھیر لیا اور بگڑ کر کہا۔ "ہم سے یہ حال نہیں دیکھا جاتا۔"

ابن سعد گھبرا گیا۔ شمر نزدیک کھڑا تھا اس سے کہنے لگا۔ شمر! یزید کا ہمیں رحم کرنے کا حکم نہیں ہے۔ تم نے علی اکبرؑ کو قتل کروا دیا۔ اب یہ لوگ علی اصغرؑ کے قتل سے کیوں منہ پھیر رہے ہیں۔ کیا یہ علی اکبرؑ سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ شمر نے اس کے جواب میں ابن سعد کے کان میں کچھ کہا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ابن سعد ہٹ گیا اور حرملہ کے پاس جانے لگا۔

حرملہ سات ہزار تیر اندازوں کا افسر تھا۔ جو شخص اپنے تیر کو لوہے کی ایک

چادرے پار کردیتا تھا، وہ ایک ہزار تیر اندازوں پر افسر مقرر کیا جاتا تھا، جو دو چادریں توڑ دیتا تھا وہ دو ہزار پر سردار بنتا۔ حرملہ کا تیر لوہے کی سات چادروں سے پار ہو جاتا تھا، اس لئے اسے سات ہزار تیر اندازوں پر افسر بنایا گیا تھا۔ اس کے سینے کا پھیر ایک سو آٹھ انچ یعنی تین گز تھا۔

ابن سعد نے حرملہ کو حکم کے لہجے میں کہا۔ اُقْطَعْ کَلَامَ الْحُسَیْنِ۔ اے حرملہ! ساری فوج انکاری ہوگئی کیا تو بھی یہ کام نہ کر سکے گا۔ ارے جلدی کر اور امام حسینؑ کے کلام کو قطع کر دے۔ حرملہ نے فوراً اپنے ترکش سے ایک مضبوط تیر تین بھال کا چھانٹا اور اسے کمان کے چلّے میں جوڑ کر حضرت علی اصغرؑ کی طرف پھینکا۔ شست لگائی۔ ہاتھ کانپ گئے۔ اور تیر گر پڑا۔ پھر شست باندھی پھر ہاتھ کانپ کر تیر گر پڑا۔ تیسری مرتبہ بڑا سخت دل کر کے حضرت علی اصغرؑ کی طرف تیر پھینکا۔ ہائے: فَانْقَلَبَ الصَّبِیُّ عَلٰی یَدَیِ الْاِمَامِ ۔ بس بچہ امامؑ کے ہاتھوں پر پلٹ گیا۔ منقلب ہو گیا۔

خدا بخشے علامہ حافظ کفایت حسین قبلہ مرحوم کا بیان ہے کہ تیر حضرت علی اصغرؑ کو بھال پر اٹھا کر امام کے ہاتھوں سے لے چلا مگر بچہ پلٹنے ہی پایا تھا کہ آپ نے گرفت کر لی۔ جناب علی اصغرؑ کا گلا چھد گیا اور بچہ خون میں نہا گیا۔ تیر تین بھال کا تھا اور بھالیں اتنی بڑی تھیں کہ جناب علی اصغرؑ کے ایک سے دوسرے کان تک پار ہو گئیں۔ حضرت علی اصغرؑ شہید ہو گئے۔

اگر حضرت علی اصغرؑ شہید نہ ہوتے تو دشمن یہ کہہ سکتے تھے کہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے ہم سے جنگ کی۔ اگر وہ تلوار نہ اٹھاتے تو ہم بھی انھیں قتل نہ کرتے لیکن چھ مہینے کے بچے کا میدان سے زندہ واپس نہ آنا بتاتا ہے کہ ایک طرف مظلوم تھے اور دوسری طرف ظالموں کا گروہ تھا۔

اے ظالمو! امام نے تم سے صرف پانی ہی تو مانگا تھا۔ تم پانی نہ دیتے اور منع کر دیتے۔ بچے کے تیر تو نہ مارا ہوتا۔ ہائے! پانی کا جواب تیر سے دیا گیا۔ امام حسینؑ نے دیکھا کہ بچے کے گلے سے خون بہہ رہا ہے۔ گھبرا کر خون چلّو میں لینے لگے۔ جب چلّو بھر

گیا تو چاہا کہ یہ خون زمین و آسمان کی طرف پھینک دوں۔ مگر زمین و آسمان نے اپنے اوپر پھینکنے سے انکار کر دیا۔ امامؑ نے سوچا کہ یہ خون عبا میں جذب کر لوں مگر خیال آیا کہ یہ لباس تو لٹنے والا ہے۔ جسم پر مَل لوں۔ خیال آیا۔ ارے یہ جسم تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہونے والا ہے۔ آخر وہ خون اپنی ڈاڑھی اور چہرے پر مل لیا اور رو کر ارشاد فرمایا کہ اسی حال سے اپنے پروردگار کے حضور پیش ہوں گا۔ اسی حال سے کوفہ و شام میں سر کی تشہیر ہو گی تا کہ میری بے گناہی اور دشمنوں کا ظلم خود بخود ظاہر ہوتا رہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ امام حسینؑ بچے کی لاش لے کر خیموں میں گئے لیکن بعض روایات یہ ہیں کہ امام حسینؑ بچے کی لاش کو لے کر خیمے کی طرف چلے۔ سات قدم بڑھتے تھے پھر سات قدم پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اسی طرح سات مرتبہ آگے کو بڑھے اور سات مرتبہ پیچھے کو ہٹے۔ خیال آتا تھا کہ لاش کو خیمے میں لے جاؤں۔ پھر سوچتے کہ زمین و آسمان برداشت نہ کر سکے تو اس کی ماں کیسے برداشت کرے گی۔ اس لئے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ ہائے! امامؑ جیسا صابر اس وقت یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کروں۔

جب سات دفعہ اسی طرح ہو چکا تو امام نے میت کو جلتی ریت پر رکھ دیا۔ اور ذوالفقار سے ننھی سی قبر کھودنے لگے۔ اس موقع پر ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا اشقیا نے امام کو قبر کھودنے کی مہلت دے دی تھی اور جنگ بند کر دی تھی۔ نہیں معلوم امامؑ نے کس حال میں جناب علی اصغرؑ کی قبر کھودی ہو گی۔ تیر آرہے ہوں گے۔ خیموں کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ کوئی بی بی تو باہر نہیں نکل آئی ہے۔ کبھی بچے کی لاش کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ کہ کہیں اشقیا اسے اُٹھا کر نہ لے جائیں۔ ہائے! امام حسینؑ پر کیا گزر گئی اُس وقت ایک حسرت بھرا جملہ فرمایا:۔ اے میرے شیعو! کاش تم کربلا میں ہوتے اور مجھے دیکھتے کہ میں نے علی اصغرؑ کے لئے کس طرح پانی کا سوال کیا اور کس طرح اسے ننھی سی قبر میں دفن کیا۔ دفن کرنے کے بعد پانی تو تھا نہیں جو قبر پر چھڑکتے۔ امامؑ اتنا روئے کہ قبر آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ حضرات! قبر پر چھڑکتے۔ امامؑ اتنا روئے کہ قبر آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ حضرات! قبر کا نشان قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن امام حسینؑ جب چلنے لگے تو

حضرت علی اصغرؑ کے قبر کے نشان کو مٹا دیا۔ ہائے وجہ یہ تھی کہ جب لشکر یزید سیدانیوں کو قید کر کے لے جانے لگا تو شہیدوں کے سروں کو شمار کیا گیا۔ کہ پورے بھی ہیں یا نہیں۔ ۷۲ سروں میں سے ایک سر کم نکلا۔ سر کی تلاش کی گئی۔ لوگ میدان کربلا میں قبر ڈھونڈ رہے تھے۔ شمر ایک بڑا نیزہ لئے ہوئے میدان کربلا میں پھر رہا تھا۔ جہاں زمین نرم معلوم ہوتی تھی۔ اس میں نیزہ گاڑ کر دیکھتا۔ نیزہ گاڑتے گاڑتے حضرت علی اصغرؑ کی قبر تک پہنچ گیا۔ ہائے بچے کو قبر میں بھی آرام نہیں ملا۔ جب حضرت علی اصغرؑ کی قبر میں نیزہ گاڑا تو بچے کی لاش نیزے میں بندھی ہوئی برآمد ہوئی۔ ظالموں نے سر کاٹ لیا اور یہ ننھا سا سر بھی نیزے پر بلند کر دیا گیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ؕ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ؕ

☆☆☆

تیرھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کا اپنے اقربا کی محبت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا ہوں۔

خدا اور رسولؐ کی ذات اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ وہ کسی سے سوال کریں۔ سوال تو دُنیا خود ان سے کرتی ہے اور ان کے در کی محتاج ہے۔ پھر بھلا کہاں رسول کی شان اور کہاں سوال۔ بڑے ہمیشہ چھوٹوں کو حکم دیا کرتے ہیں۔ سوال نہیں کیا کرتے۔ لہٰذا اللہ اور رسول ہی کی طرف سے حکم آنا چاہیئے اور سوال نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر یہ یہاں سوال کیوں کیا گیا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ جب بزرگ اپنے سے چھوٹوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں تو وہ ان سے سوال کیا کرتے ہیں۔ اور اس طرح آزمائش کر کے چھوٹوں کی لیاقت کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ امتحان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اچھا طالب علم ہے یا سارا سال کھیلتا ہی رہا ہے۔ اسی طرح اللہ اور رسولؐ نے محبت کا سوال کیا ہے کہ تم جو ہم سے شفاعت کے طلبگار ہو لہٰذا ہم بھی تو دیکھیں کہ تم ہمارے ہو یا نہیں۔

جس طرح ایک محنتی طالب علم کو پاس ہونے پر سند ملتی ہے۔ اور کھلاڑی طالب علم فیل کر دیا جاتا ہے اسی طرح آلِ محمدؐ سے محبت رکھنے والوں کی شفاعت کی جائے گی لیکن جو اُن سے دشمنی رکھتے رہے ہیں وہ کس طرح شفاعت کرا سکیں گے؟

امتحان کا قاعدہ ہے کہ پرچے آؤٹ نہیں ہونے چاہئیں۔ اسی لئے ہر سال نئے پرچے تیار کئے جاتے ہیں۔ تا کہ ان سوالوں سے بچا جائے جو پچھلے سال آ چکے ہیں۔ اگر ہر سال وہی سوال آئیں یا پرچہ آؤٹ ہو جائے تو پھر امتحان کا کیا فائدہ ہو گا۔ لیکن خدا کے امتحان میں یہ بات نہیں ہے۔ یہاں پرچہ (ہنس کر) آؤٹ ہے اور سوال بھی ہر بار وہی ہے کہ اقربا سے محبت کرو۔

مزے کی بات یہ ہے کہ پرچہ تو آؤٹ تھا ہی مگر یہاں اس کا جواب بھی بتا دیا گیا ہے۔ نجران کے نصرانیوں کے مقابلے میں رسولؐ اللہ اپنے اقربا کو میدان میں لے گئے اور دنیا کو بتا دیا کہ دیکھو میرے بیٹے، حسنؑ و حسینؑ ہیں۔ میری عورتیں فاطمہؑ اور میرے نفس علیؑ ہیں۔ اگر رسالت کے اقربا میں کوئی اور ہوتا تو میدانِ مباہلہ میں اسے بھی لے جاتے اور اس طرح اگر ان پانچوں میں سے کوئی رسالت کا قرابت دار نہ ہوتا تو مباہلے کی فہرست میں اس کا نام نہیں آ سکتا تھا۔ رسولؐ اللہ نے اپنے سارے قرابت دار محصور کر دیے ہیں نہ ان میں سے کوئی کم کیا جا سکتا ہے اور نہ بڑھایا جا سکتا ہے۔

اب پرچہ بھی آؤٹ ہے یعنی سب کو معلوم ہے کہ محبت کے ذریعہ امتحان ہو رہا ہے اور جواب کا اعلان بھی برسرِ عام ہے کہ پنجتن پاک میرے اقربا ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی سوال ہے۔ قیامت تک لوگ آتے رہیں گے اور اسی سوال کے تحت امتحان دیتے رہیں گے۔

دنیا میں تو کورس کی کتابیں بھی بدل جاتی ہیں۔ ہر کلاس کی الگ الگ کتابیں ہوتی ہیں۔ امتحان لینے والے بھی ہر سال وہی نہیں ہوتے لیکن یہاں جو کتاب یعنی قرآن شروع میں تھا وہی قیامت تک رہے گا۔ یہاں ہر درجے کی الگ کتابیں نہیں ہیں بلکہ ہر کلاس کے لئے ایک ہی کتاب یعنی قرآن ہے۔ ممتحن بھی نہیں بدلتے ہر زمانے میں وہی اللہ اور رسولؐ امتحان لینے والے ہیں۔

دنیا کے امتحان کے بعد نتیجہ کا انتظار رہتا ہے کہ پاس ہوا یا فیل۔ یہاں بھی نتیجہ کا اعلان ہونا چاہیے کہ کون کون پاس ہوا ہے اور کون فیل ہو گیا ہے۔ لہٰذا ارشاد ہوا کہ "معاوضے میں محبت کرو" معاوضہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر ادا نہ کیا جائے تو حق تصرّف باطل ہو جاتا ہے یعنی جو کچھ کیا ہے، بیکار ہے۔۔۔ اور معاوضہ محبت ہے۔

اگر محبت رکھتے ہو تو پاس ہو ورنہ فیل۔ علامتیں خود بتا دیں گی کہ آپ ان کے دوست ہیں یا دشمن۔ اسی لئے ارشاد فرمایا: مَنْ بَكىٰ عَلَى الْحُسَيْنِ اَوْ اَبْكىٰ اَوْ تَبَاكىٰ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ ○ جو حسینؑ پر روئے یا رُلائے یا رونے کی صورت بنائے اس پر جنت واجب ہے۔

جنت کوئی رونے پیٹنے سے تھوڑا ہی واجب ہوتی ہے۔ یہ تو محبت معلوم کرنے کے لئے ایک علامت ہے جسے امام حسینؑ سے محبت ہوگی۔ وہ ان کے غم میں روئے گا اور اگر رو نہ سکے گا تو کم از کم رونے کی صورت ضرور بنائے گا۔ کیونکہ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس کے دل میں امام حسینؑ کے غم کا اثر ہے تو چہرے سے ضرور ظاہر ہوگا۔ لیکن جسے امام حسینؑ سے دشمنی ہے یا نہ دشمنی ہے اور نہ محبت ہے، وہ ان کے غم سے نہ روئے گا اور نہ اس کے چہرے پر ہی غم کی علامتیں ظاہر ہوں گی۔

معلوم ہوا رونے سے یہ مقصد نہیں کہ رونا اتنا اہم فعل یا بڑی عبادت ہے کہ جس سے جنت واجب ہو جائے بلکہ رونے سے مراد ان کی محبت کی آزمائش ہے یعنی جو ان کی محبت میں رو پڑا، وہ پاس ہے اور جو ان کے غم میں نہیں روتا وہ ان کی محبت میں فیل ہے۔

جو اُن کی محبت میں فیل ہے، اس نے معاوضہ ادا نہیں کیا۔ اور جس نے معاوضہ ادا

نہیں کیا، وہ اپنے اعمال کا ثواب کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے جنت میں جانے والوں کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ امام حسینؑ کے غم میں روتے ہیں۔ کیونکہ رونا محبت کی علامت ہے اور محبت رسالت کا اجر ہے۔ جب معاوضہ ادا کر دیا تو اعمال جو کچھ بھی تھوڑے بہت کئے ہیں، ان کا ثواب مل جائے گا اور جو کسر ہوگی اس کے لئے رسول مقبولؐ کی شفاعت ہو جائے گی۔ لہٰذا جنت میں داخلہ واجب ہو جاتا ہے۔ (صلوٰۃ)

دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے اور چار کتابیں نازل ہوئیں۔ بتایا جائے کہ قرآن سے پہلے جو لوگ نبیوں کو سچا اور ان کی کتاب کو اللہ کی کتاب مانتے تھے وہ مسلمان تھے یا نہیں؟ ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان بلکہ مومن تھے کیونکہ اس وقت جو بھی شریعت تھی اسی کو تو ماننا تھا۔

جناب موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل مسلمان تھے کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ کو نبی اور توریت کو اللہ کی کتاب مانتے تھے۔ جناب عیسیٰؑ کے زمانے میں ان کو اور انجیل کو ماننے والے مسلمان تھے، لیکن قرآن کے آنے کے بعد یہی لوگ غیر مسلم کہلاتے ہیں حالانکہ یہودی اسی طرح اب بھی جناب موسیٰؑ کو نبی مانتے ہیں۔ بیت المقدس کے خانہ خدا ہونے کے قائل ہیں اور توریت کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں اور خود بھی انھوں نے اپنی طرف سے کسی کو نبی نہیں بنایا نہ جناب موسیٰؑ کو چھوڑا ہے اور نہ توریت کے منکر ہوئے ہیں۔ اسی طرح عیسائی ابھی تک حضرت عیسیٰؑ اور انجیل کے قائل ہیں مگر ان کو غیر مسلم کہا جا رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے گذشتہ ایمان پر مستقل رہے اور انھوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ کے بعد آنے والے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلیم نہیں کیا۔ حضرت محمد تو بڑی چیز ہیں۔ اگر کوئی نبی دنیا سے اٹھا جائے اور جو اس کے بعد دوسرا نبی آئے، لوگ اسے نہ مانیں اور پہلے ہی نبی پر ایمان مستقل رکھیں تو دوسرا نبی اگرچہ کتنے ہی چھوٹے مرتبے کا نبی ہو مگر اسے نہ ماننے سے ایمان رخصت ہو جائے گا۔

حالانکہ وہ شریعت اور کتاب جس کے وہ نگران تھے دونوں منسوخ ہو چکی ہیں مگر

پھر بھی ان کی نبوت یعنی عہدہ کا اقرار اتنا سخت ضروری ہے کہ اس سے انکار مسلمان کو کافر بنا دیتا ہے۔ لہٰذا جو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شریعت اور کتاب کے نگران ہوں، ان کے عہدے سے انکار کرکے کوئی کس طرح اسلام پر باقی رہ سکتا ہے۔

انکار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے وجود سے انکار ہے۔ وجود تو فرعون نمرود اور شیطان کا بھی تسلیم ہے، سوال تو رسولؐ کی کتاب اور شریعت کے نگران ہونے کے عہدہ دار ماننے کا ہے۔ جس طرح پچھلے انبیاء میں اگر کسی نے آنے والے نبی کو تسلیم نہیں کیا تو اسی نبی نے انھیں کفر کی سند دے دی۔ اسی طرح رسولؐ اللہ کی شریعت اور کتاب کے نگہبانوں سے جو انکار کرے گا یعنی ان کے اقربا کا معاوضہ نہیں دے گا۔ اس کا ایمان غصبی ہو جائے گا۔

تمام انبیاء نے تو انکار کرنے والوں کا نتیجہ خود بتایا مگر رسولؐ اللہ کے معاوضہ کا لفظ کہہ کر نتیجہ کا اختیار اُمت کو دے دیا کہ اپنے آپ دیکھ لو اگر معاوضہ ادا کر رہے ہو تب تو پاس ہو، اور اگر معاوضہ ہی غصب کر لیا تو پھر عمل کا کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

معاوضہ دینا ہے تو انھیں رسولؐ کی کتاب اور شریعت کے نگران ہونے کا عہدہ دار سمجھے۔ پہلے رسولوں کی شریعت کے نگران نبی کہلاتے تھے لیکن اب نبوت ختم ہے لہٰذا انھیں امامت کا عہدہ دار سمجھے، رسولؐ کا جانشین سمجھے۔ خالی قرابت دار سمجھنے سے کیا فائدہ۔ یوں تو ابوجہل اور ابولہب بھی رسولؐ کے رشتہ دار تھے۔ امام حسینؑ بھی رسولؐ کے نواسے تھے۔ لیکن جب تک امام حسینؑ کو جانشینِ رسولؐ اور امام تسلیم نہ کیا جائے اس وقت تک ابوجہل اور امام حسینؑ کی رسولؐ سے رشتہ داری میں کیا فرق ہوگا۔

امام حسینؑ کی ذات ایسی ہے کہ جنھیں اسلام کے تمام فرقے مانتے ہیں مگر انھیں شریعت کا کوئی عہدہ نہیں دیا گیا۔ حالانکہ رسولؐ اللہ کے بعد جانشین بھی چنے گئے امامت کے بغیر بھی دنیا کا کام نہ چلا یہاں تک کہ کئی امام مانے گئے اور آج تک ان کی امامت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ کیا یہ لوگ رسولؐ کے رشتہ دار تھے یا امام حسینؑ سے زیادہ قرآن جانتے تھے مگر امام نہ مانا تو امام حسینؑ کو نہ مانا۔

تب ہی تو رسولؐ اللہ کے قرابت داروں پر یہ وقت آیا کہ یزید نے ملک شام سے امام حسینؑ کا سر لینے کے احکام بھیج دیئے۔ اگر ان کا بھی کوئی ماننے والا ہوتا اور انھیں بھی شریعت کا کوئی عہدہ دیا گیا ہوتا تو یزید کی اتنی جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ ادھر کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ یہ تو جب حال ہے جب کہ رسولؐ ان سے محبت کا حکم دے گئے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ دشمنی کا حکم دے جاتے تو نہ معلوم اُمت ان کے ساتھ کیا سلوک کرتی۔

رسولؐ اللہ جانتے تھے کہ اگر میں نے معاوضہ مال کا سوال کیا تو لوگ غربت کا عذر کرکے مال نہیں دیں گے، اگر جان کا سوال کروں تو اپنے آپ کو گھر کا کفیل بتا کر جان کے لئے معذرت کرلیں گے، اگر اولاد کا سوال کروں تو کتنے ہی بے اولاد معاوضہ ادا نہ کرسکیں گے۔ اس لئے محبت کا سوال کیا تاکہ ہر شخص ادا کرسکے اور کسی کو عذر کرنے کا بہانہ نہ مل سکے۔

محبت ایک طرف اتنی عام چیز ہے کہ ہر شخص اس کی استطاعت رکھتا ہے دوسری طرف اتنی قیمتی ہے کہ اگر لوگ اقربا کو مال جان اور اولاد دے دیتے تو ان کی اتنی عزت نہیں ہوسکتی تھی جتنی محبت کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب ہر شخص کو اقربا کا ہوکر رہنا پڑے گا اور ان کے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔

اگر تمام مسلمانوں کی محبت کا مرکز آلِ محمدؐ ہوتے تو پھر شریعت کا ہر عہدہ آلِ محمدؐ کے پاس ہوتا اور یزید کے خلیفہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ رسولؐ اللہ نے اپنی تبلیغ کے معاوضے کا ایسا سوال کیا جو سب سے اہم ہے اور سب سے زیادہ قیمتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقربا کی محبت جو اتنی بلند مرتبہ ہے کہ رسالت کا عوض بن گئی اور اقربا کو شریعت کے ہر عہدے پر فائز کردیا لہٰذا اقربا میں بھی اتنی قابلیت اور اہلیت ہونی چاہیئے کہ وہ شریعت کے عہدوں کو سنبھال سکیں۔ اگر قابلیت نہ ہو اور رشتے داروں کو عہدہ دے دیا جائے تو اس سے کام نہیں چل سکتا۔

اگر کوئی بادشاہ اپنے کسی عزیز کو فوج کا افسر بنا کر جنگ پر بھیج دے تو وہ اپنی نااہلیت کی وجہ سے فتح حاصل نہیں کرسکے گا۔ بلکہ اُلٹا اپنی ہی فوج کو کٹوا دے گا۔ اسی طرح

اگر کوئی صاحب اختیار افسر اپنے جاہل بھائی کو کسی کالج کا پرنسپل بنادے تو وہ دوسروں کو تعلیم نہیں دے سکے گا بلکہ خود ہی ذلیل ہو کر نکالا جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اگر خدا نے تبلیغ کا معاوضہ اقربا کو دلوایا ہے تو ان کو اتنی قابلیت بھی عطا کرے کہ وہ شریعت کے ہر عہدے کو سنبھال سکیں۔

ارشاد ہوتا ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؕ "قرآن کریم ایک پوشیدہ کتاب ہے جسے سوائے طاہر بندوں کے اور کوئی نہیں چھو سکتا۔" اگر یہاں چھونے سے مراد ہاتھ لگانا ہے تو چھپے ہوئے قرآن کو ہر شخص ہاتھ لگا سکتا ہے خواہ وہ طاہر ہو یا نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر مسلمان بھی نہ ہو تب بھی قرآن کے حروف چھو سکتا ہے۔ پھر کتاب مکنون یعنی پوشیدہ کتاب کیا رہی؟

یہاں کتاب مکنون سے مراد مفہوم قرآن ہے۔ یعنی قرآن کا مطلب سوائے طاہر بندوں کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ عام لوگوں کے امکان سے باہر ہے کہ وہ قرآن کے اصل مطالب تک پہنچ سکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پھر طاہر بندے کون ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ؕ اے اہلِ بیتؑ! اللہ کا بس ارادہ یہ ہے کہ وہ تم سے ہر قسم کی برائی کو دور رکھے اور ایسا پاک و پاکیزہ قرار دے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔ قرآن نے بڑے کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ یہ پاک بندے اہلِ بیتؑ ہیں اور قرآن کے پوشیدہ مطالب ان کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (صلوٰۃ)

معلوم ہوا کہ اگر خدا نے انھیں معاوضے کا عہدے دار بنایا ہے تو قابلیت اور اہلیت بھی انہی کو دی ہے اور دوسرے لوگوں کو نہیں دی ہے۔ یہ کتاب مکنون کو چھو سکتے ہیں، یہ قرآن کے پوشیدہ مطالب سمجھا سکتے ہیں۔ یہ شریعت کے منصبدار ہیں اور شریعت کا علم بھی مکمل رکھتے ہیں۔ دوسرے لوگ علم و فضل میں ان سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔

سب سے زیادہ پاک اہلِ بیتؑ ہیں، سب سے زیادہ قرآن کے حامل اہلِ بیتؑ ہیں، سب سے زیادہ شریعت کے نگران اہلِ بیتؑ ہیں، سب سے زیادہ رسولؐ کے رشتے

دار اہلِ بیتؑ ہیں اور سب سے زیادہ محبت کے مستحق اہلِ بیتؑ ہیں۔ پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ اہلِ بیتؑ کی موجودگی میں کوئی دوسرا حاکم دین بن جائے اور اہلِ بیتؑ اس کے محکوم ہو جائیں۔ اہلِ بیتؑ کا امام غیر اہلِ بیتؑ نہیں بن سکتا۔ اہلِ بیتؑ کا آقا غیر اہلِ بیتؑ نہیں ہوسکتا۔

ازواجِ رسولؐ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "وہ بھی اہلِ بیتؑ میں داخل ہیں۔" لیکن چونکہ ان میں کوئی امامت یا حکومت کے عہدے پر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ کسی نے بھی رسولؐ کی جانشینی کا دعویٰ نہیں کیا اس لئے شریعت کے عہدوں کے متعلق ازواجِ رسولؐ سے بحث آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہاں! البتہ ان کا احترام واجب ہے۔

شریعت کے عہدے غیر اہلِ بیتؑ نے چھین لئے یہاں تک کہ یزید جیسا فاسق و فاجر خلیفہ بن گیا۔ تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ رسولؐ اللہ ان لوگوں کو حکم عدولی کی سزا نہ سنا کر جاتے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا۔ اجرِ رسالت محبت اہلِ بیتؑ ہے۔ اگر محبت اہلِ بیتؑ نہیں تو چاہے خلیفہ ہو یا نماز گزار۔ متقی ہو یا پرہیز گار مگر سزا یہ ہے کہ کچھ نہ ملے گا۔

اہلِ بیتؑ نے ہمیشہ دین کی نگرانی کی ہے اور انہی کی وجہ سے آج دین قائم ہے ورنہ کونسا امام ہے جسے قید و بند کے مصائب درپیش نہ ہوئے ہوں۔ امام حسن عسکری علیہ السلام برسوں قید میں رہے اور آخر ۲۸ سال کی عمر میں زہر دیکر شہید کر دیئے گئے۔

ایک دفعہ کسی نے اُن سے پوچھا کہ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ "بلکہ آیات بنیات وہ ہیں جن کے سینوں میں علم عطا کیا گیا ہے۔" کی آیت میں وہ کون لوگ مراد ہیں جن کے سینوں میں علم عطا کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان اہلِ علم سے مراد ہم اہلِ بیتؑ ہیں۔

اُن[1] ہی امام کے زمانے میں اسحاق کندی عراق کا ایک بہت بڑا فلسفی تھا اُس کے دماغ میں یہ بات سمائی کہ ایک کتاب ایسی لکھے جس میں قرآن کی ایسی آیات مجتمع ہوں جو ایک دوسرے کے خلاف ہوں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ قرآن خدا کی

[1] لبیا

کتاب نہیں ہے۔ اتفاق سے اس کے کچھ شاگرد امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ تم اپنے اُستاد کو اس فضول کام سے کیوں نہیں روکتے۔ انھوں نے کہا۔ بحیثیت شاگرد ہماری کیا مجال ہے کہ اس کو روک سکیں۔ اور نہ ہمارا اتنا علم ہے کہ ہماری دلیلیں اسے خاموش کر سکیں۔ آپ نے فرمایا جو بات میں تمھیں بتاؤں وہ اس سے دریافت کر لو گے؟ اُنھوں نے کہا۔ ہاں! ہم ایسا ضرور کر سکتے ہیں۔ فرمایا۔ اب جب تم اس کے پاس جاؤ اور وہ تمھیں ایسی آیتیں سُنائے جن کا مفہوم بظاہر ایک دوسرے کے خلاف ہو تو تم اس سے کہنا کہ اگر اس کلام کا کہنے والا یعنی خدا تمہارے پاس آ کر کہے کہ جو کچھ مطلب تم نے نکالا ہے وہ میرا مقصد نہیں ہے۔ کلام کا کرنے والا میں ہوں۔ اُسے یا تو میں سمجھ سکتا ہوں یا وہ سمجھ سکتا ہے۔ جس سے میں نے کلام کیا ہے۔ تمھیں کیا پتہ کہ ہم نے ایک دوسرے سے کیا کہا ہے اور کس لفظ سے کیا معنی مراد لئے ہیں۔ پھر تم خواہ مخواہ اپنی طرف سے معنی کیوں پیدا کرتے ہو۔

حضرت سے یہ باتیں سُن کر وہ شاگرد اسحاق کندی کے پاس گئے اور یہی بیان کیا۔ وہ یہ کلام سُن کر حیران رہ گیا اور پوچھنے لگا کہ یہ باتیں تمھیں کس نے بتائی ہیں؟ ایک شاگرد نے کہا کہ میرے ہی دل میں یہ خیال آیا ہے۔ اس نے کہا ہرگز نہیں۔ یہ بات تمہارے دماغ میں آنے والی نہیں ہے۔ آخر ان شاگردوں نے ساری حقیقت بیان کر دی۔

اسحاق کندی نے کہا کہ اہلِ بیت کے سوا اور کوئی ایسی بات کہہ ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد اس نے آگ منگوائی اور وہ تمام کاغذات جلا دیے جن پر ایسی آیات جمع کی تھیں۔

اسحاق کندی نے واقعی عالم ہونے کا ثبوت دیا کیونکہ جو بات ماننے والی تھی وہ اس نے تسلیم کر لی ورنہ الٓـمٓ (الف، لام، میم) اور ایسی ہی دوسری آیات کا وہ کیا مطلب سمجھ سکتا تھا۔ ان لفظوں سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ نے پہلے ہی رسولؐ اللہ کو اشارے سکھا دیے تھے۔ ارشاد ہے! وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ اور سکھایا تجھ کو وہ کہ جو کچھ تو جانتا نہ تھا۔

جاننے کی تعداد تو محدود ہے لیکن نہ جاننے والی چیزیں لامحدود ہیں۔ خدا نے محمد کو وہ چیزیں سکھائیں جو وہ نہ جانتے تھے۔ لہٰذا اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ سکتی۔ جسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ جانتے ہوں۔ انھیں گزشتہ اور آئندہ کی ہر چیز کا علم ہے۔

معلوم ہوا قرآن کا علم رسولؐ اللہ کے پاس ہے۔ اور ان کے اقربا کے پاس ہے۔ جنہیں تبلیغ کے معاوضے کا مختار بنایا ہے۔ وہی دین کے نگران ہیں۔ اگر رسولؐ اللہ دین کے نگران نہ چھوڑ جاتے تو نبوت ختم نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اور انبیاء کی ضرورت ہوتی۔ اسی لئے رسول اللہؐ نے ایسے اقربا چھوڑے ہیں کہ آئندہ نبی کے آنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ ان سے محبت کرو اور جو کچھ بھی پوچھنا ہے انہی سے پوچھ لو۔

رہا عہدے کا سوال۔ تو شریعت کے نگران کے لئے برسر اقتدار ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ شریعت کے عہدے دار سلطنت سے ہمیشہ الگ رہے ہیں۔ تاکہ ان کا عہدہ سلطنت کے زور پر نہ رہے اور نہ ان کے اصل جوہر سامنے آئیں۔ سلطنت کے زور پر فرعون اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا مگر نبوت کا عہدہ حضرت موسیٰؑ کے پاس تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے پر نمرود بادشاہ تھا۔ مگر نبوت حضرت ابراہیم ہی کے پاس تھی۔ اسی طرح امام حسینؑ کے مقابلے پر یزید کے ہاتھ میں عنانِ سلطنت تھی۔ مگر دین کے پیشوا امام حسینؑ ہی تھے۔

سلطنت دُنیا علیحدہ چیز ہے۔ اور رسولؐ کی جانشینی و امامت علیحدہ چیز ہے۔ امام حسینؑ کے پاس دنیا کی سلطنت نہ تھی۔ یزید ان سے بیعت کا طلبگار رہا۔ دُنیا تو یزید کے پاس پہلے ہی سے تھی۔ اب بتایئے کہ وہ امام حسینؑ سے امامت نہیں تو اور کیا لینا چاہتا تھا؟

امام حسینؑ کی وہ ذات تھی جو شریعت کے نگران تھے۔ جو قرآن کے حامل تھے جو جوانانِ جنت کے سردار تھے، جو معاوضے کے مالک تھے اور جو اسلام کی بقا کے ذمہ دار تھے، وہ بھلا یزید کی بیعت کر کیسے سکتے تھے۔ یزید تو فاسق و فاجر تھا۔ اگر کوئی متقی بھی ہوتا تب بھی اہلِ بیتؑ غیر اہلِ بیت کی بیعت کیسے کر سکتے تھے؟

بیعت کے تو یہ معنی تھے کہ امام حسینؑ یزید کو رسولؐ اللہ کا سچا جانشین مان لیں اور اسی

لئے وہ امام حسینؑ سے بیعت کروانا بھی چاہتا تھا ورنہ ساری سلطنت میں اگر ایک شخص بیعت نہ بھی کرے تو اس سے کونسا فرق پڑتا تھا مگر اصل بات تو یہی تھی کہ یزید کو دنیا کی گدی تو مل گئی تھی۔ اب دین کی پیشوائی بھی حاصل کرنا چاہتا تھا کہ رسولؐ اللہ کا جانشین بن جاؤں۔ اسی لئے امام حسینؑ پر اتنا زور دے رہا تھا۔ اگر امام حسینؑ یزید کی بیعت کرلیں تو وہ ان کا پیشوا ہو جائے گا اور جب حسینؑ کا پیشوا ہو گا تو قیامت تک آنے والے ہر مومن کا پیشوا ہو جائے گا۔ اگر کہیں امام حسینؑ اسلام کے آڑے نہ آتے اور یزید کے مظالم اپنے اوپر نہ لیتے تو آج مسلمانوں کا وہی اسلام ہوتا جو یزید کا تھا اور تمام شیعہ سنّی وہی اعمال کرتے جو یزید کیا کرتا تھا۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے۔

آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے ڈوب کر پار اُتر گیا اسلام

وہ تو امام حسینؑ جیسا عالی ہمت اور اہلِ بیتؑ کی مایہ ناز ہستی موجود تھی جس نے ظلم کے پہاڑ اُٹھا لئے اور یزید کی بیعت کو ٹھکرا دیا۔ کہاں ایک حکومت کی طاقت اور کہاں ایک شریف گھرانا! مگر امام حسینؑ نے بیعت سے انکار کر کے تمام مسلمانوں پر احسان کیا ورنہ آج ہر فرقہ کا پیشوا یزید ہوتا اور وہی مسلمان ہوتے جو یزید کے تھے۔

یزید کے زمانے کے مسلمان اور آج کے مسلمان میں بڑا فرق ہے۔ یزید کے مسلمان وہ تھے جنہوں نے آلِ رسولؐ اور اولادِ فاطمہؑ کو تین دن بھوکا پیاسا رکھ کر ذبح کر ڈالا اور ان کی عورتوں کو (روکر) بے پردہ، سر برہنہ اور رسیوں سے باندھ کر بازاروں میں پھرایا لیکن آج کربلا کے بعد کا اسلام یہ ہے کہ جناب فاطمہؑ کی بیٹی جناب زینبؑ مکرمہ تو بڑی چیز ہیں، حکومت کسی غریب مسلمان کی لڑکی کو بھی تشہیر نہیں کر سکتی۔ سارے مسلمان بگڑ جائیں گے۔ یہ روح مسلمانوں میں امام حسینؑ ہی کی وجہ سے آئی ہے۔

کتاب ذاکرہ ماتم اور گنجینہ مصائب میں ہے کہ جب امام حسینؑ بیعت سے انکار کر کے مدینے سے روانہ ہوئے اور مکہ پہنچے تو یزید نے دیکھا کہ امام حسینؑ شام میں نہیں آئیں گے لہٰذا انہیں کوفے بلانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے شام سے کوفے آدمی بھیجے جنہوں نے امامؑ کو خود بھی بلانے کے خط بھیجے اور کوفیوں کو بھی ورغلا کر لکھوائے کیونکہ وہ

جانتا تھا کہ امام حسینؑ کے ساتھ بڑے بڑے بہادر ہیں ان کا قتل کرنا آسان نہیں اس لئے وہ چاہتا تھا کہ امام حسینؑ کو ایسے مقام پر بلا کر لڑائی کرے جہاں ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو۔

امام حسینؑ کوفیوں کو خوب جانتے تھے کیونکہ حضرت علیؑ کے زمانے میں یہ خاندان کوفے ہی میں رہتا تھا۔ جب حضرت علیؑ کو مسجد میں شہید کر دیا گیا اور ان کے بعد امام حسنؑ پر برچھی کا وار کیا جو اوچھا پڑا۔ اور مدائن میں جب امام حسنؑ اپنے خیمہ میں نماز پڑھ رہے تھے تو لوگ ان کے خیمے پر چڑھ آئے تھے اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے نیچے سے وہ جانماز بھی کھینچ لی تھی جس پر وہ نماز پڑھ رہے تھے تو یہ حالات دیکھ کر امام حسنؑ اور ان کا خاندان کوفہ چھوڑ کر مدینے میں آ کر دوبارہ آباد ہو گیا تھا۔

لہٰذا جب کوفے سے امام حسینؑ کو بلانے کے خطوط آئے تو آپ جانتے تھے کہ کوفی بڑے دغاباز ہیں لیکن امام تھے، ان کی فریاد پر جانا بھی ضروری تھا۔ اس لئے آپ نے حجت تمام کرنے کے لئے حضرت مسلمؑ کو وہاں بھیجا۔ شروع میں کوفے والوں نے حضرت مسلمؑ کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اُنھوں نے امام حسینؑ کو بلانے کے لئے لکھ بھیجا۔

امامؑ کوفے کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں حضرت مسلمؑ کے شہید ہونے کی خبر پہنچی، آپ نے واپس ہونا چاہا۔ لیکن حُر کا رسالہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا بلکہ روایتوں میں ہے کہ حُر نے حضرت امام حسینؑ کے گھوڑے کی لگام پر ہاتھ ڈال دیا اور مدینے واپس نہ جانے دیا۔ آخر تکرار اور بحث کے بعد یہ طے پایا کہ نہ تو مدینے واپس جائیں تاکہ حُر نہ مارے اور اس پر ابن زیاد کا عتاب نہ ہو اور نہ امام حسینؑ کوفے جائیں کیونکہ وہ لوگ دغا پیشہ ہیں۔ لہٰذا کوئی تیسری راہ اختیار کریں۔

امام حسینؑ تیسری راہ پر روانہ ہوئے اور ۲ محرم کو کربلا پہنچے۔ ابن زیاد نے تمام فوجیں کربلا بھیج دیں اور امام حسینؑ کو گھیر لیا۔ سات محرم کو پانی بند کر دیا گیا اور نویں تک خیموں میں ایک قطرہ پانی کا نہ رہا۔ امام حسینؑ کے جاں نثار ایک ایک کر کے میدان میں تشریف لائے اور بہادری کے جوہر دکھائے مگر یزید کی فوج نے مل کر حملے کئے اور ایک

کے مقابلے میں ایک کی لڑائی میں ناکام رہی۔

جب امام حسینؑ کے سب جاں نثار شہید ہو چکے اور آپ تنہا رہ گئے تو آخری رخصت کے لئے خیموں میں تشریف لائے۔ ہائے وہ بیبیاں جو امام حسینؑ پر اپنے بچے قربان کر چکی تھیں۔ اب مایوسی کی حالت میں دیکھ رہی تھیں کہ کس طرح امام کو بچائیں۔ امامؑ کے بعد عالمِ پردیس میں تمام بیبیاں خونخوار دشمنوں میں گھبرا رہی تھیں۔ خدا جانے اس وقت بیبیوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔

امام حسینؑ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جناب زینبؑ سے کہا بہن وہ ہمارے پُرانے کپڑوں کی گٹھری تو ہمیں لادو۔ جب گٹھری آگئی تو آپ نے اس میں سے ایک بہت پُرانا لباس نکالا۔ پھر اس کو بھی جگہ جگہ سے تار تار کرنے لگے۔ جناب زینبؑ نے رو کر کہا۔ بھیّا! یہ کیا کر رہے ہو۔ امامؑ نے فرمایا بہن میرے قتل کے بعد دشمن میرا لباس بھی اُتار کر لوٹ کر لے جائیں گے اس لئے نیچے پھٹا ہوا لباس پہن رہا ہوں تا کہ لاش کا پردہ تو رہ جائے۔ اتنے میں باپ کی چہیتی بیٹی، سینے پر سونے والی جناب سکینہؑ آگئیں۔ دامن پکڑ کر التجا کے لہجے میں کہنے لگیں۔ بابا! اب آپ بھی جا رہے ہیں۔ ہمیں کون پانی پلائے گا؟ یہ کہہ کر زارو قطار رونے لگیں۔

امام حسینؑ نے بیٹی کو تسلّی دینے کے لئے زمین میں ٹھوکر ماری۔ ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ محبت سے فرمایا۔ بیٹی! پانی ہمارے قبضہ میں ہے مگر دیکھو یا تو پانی پی لو یا اُمت کو بخشوا لو۔ جناب سکینہؑ نے اُمت کی بخشش کا جو سوال سنا جلدی سے کوزہ پھینک دیا اور کہا۔ بابا! پانی نہیں چاہیئے۔ پانی نہیں چاہیئے۔ اُمت زیادہ عزیز ہے۔

جب امام حسینؑ میدان کی طرف روانہ ہوئے تو بھی جناب فضہ کو سلام کیا کبھی جناب رباب سے رخصت لی۔ جناب زینبؑ بڑھیں، بھائی! مجھے امّاں نے ایک وصیت کی تھی۔ ذرا گردن تو جھکائیے۔ امامؑ نے گردن جھکائی۔ جناب زینبؑ نے بھائی کی گردن کے بوسے لئے۔ امام حسینؑ نے پوچھا۔ بہن! یہ کیا کر رہی ہو۔ رو کر کہا۔ بھیّا! امّاں نے وصیت کی تھی۔ جب حسینؑ آخری رخصت کے لئے جانے لگیں تو میری طرف سے گردن

کے بوسے لینا۔ امام حسینؑ نے فرمایا تو بہن زینبؑ! ذرا اپنے بازو بھی کھولنا کہ مجھے بھی بابا امیر المومنینؑ نے وصیت کی تھی کہ جب کربلا میں رخصت ہونے لگو تو میری طرف سے زینبؑ کے بازوؤں کے بوسے لینا۔ جناب زینبؑ نے رو کر پوچھا۔ کیوں؟ فرمایا۔ بہن! میرے بعد یہ بازو رسیوں سے باندھے جائیں گے۔

ہائے جس وقت امام حسینؑ خیمے سے برآمد ہوئے تو کہرام مچا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی گھر سے جنازہ نکل رہا ہے۔ امام گھوڑے پر سوار ہوئے۔ چند قدم چل کر گھوڑا رک گیا۔ امامؑ نے حسرت سے فرمایا۔ اے اسپ وفادار! ارے یہ میری آخری خدمت ہے۔ قسم لے لے اس کے بعد تجھے زحمت نہیں دوں گا۔ گھوڑا زبان سے تو کچھ کہہ نہ سکتا تھا مجبوری کے عالم میں اپنی گردن جھکا دی۔ امامؑ نے جو زمین کی طرف دیکھا تو جناب سکینہ گھوڑے کے پیروں سے لپٹی ہوئی رو رو کر خوشامد سے کہہ رہی تھیں۔ اے گھوڑے! اے گھوڑے! میرے بابا کو میدان کی طرف نہ لے جا۔ جو کوئی بھی جاتا ہے واپس نہیں آتا۔

امام حسینؑ بہت دشواری سے اہلِ حرم سے رخصت ہو کر میدان میں تشریف لائے۔ عزیزوں کے غم سے دل چھلنی ہو چکا تھا۔ پھر بھی ایک مقام پر کھڑے ہو کر دشمنوں سے خطاب کیا۔ اے قومِ جفا کار! میرے تمام عزیز و انصار مارے جا چکے ہیں۔ اب ان کے بعد دنیا میں رہ کر کیا کروں گا۔ لیکن تمہاری بھلائی کے لئے کہتا ہوں کہ میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرو۔ میں تمہیں موقع دیتا ہوں۔ کہ اپنا دین و دنیا برباد نہ کرو۔ اگر تم مجھے اپنی حکومت میں رہنے نہیں دیتے تو لو سنو، مجھے اجازت ہی دے دو کہ میں تمہاری سرحد سے پرے کسی دوسرے ملک میں چلا جاؤں۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ اس کے جواب میں دشمنوں نے امام حسینؑ کی طرف تیر پھینکے۔ اور چاروں طرف سے دوڑ کر آپ کو گھیر لیا۔ ہائے ابانی نے ایک ایسا تیر مارا جو امام کی ٹھوڑی کے نیچے پیوست ہو کر لٹک گیا۔ آپ نے وہ تیر کھینچا اور آسمان کی طرف منہ کر کے خدا سے فریاد کی کہ دیکھ لے بار الہا۔ تیرے بندے کے ساتھ یہ لوگ کیا سلوک کر

رہے ہیں۔ لکھا ہے کہ کربلا کے واقعے کے بعد بہت کم زمانہ گزرا تھا کہ وہ شخص پیاس کے مرض میں مبتلا ہوا۔ اس کے پاس ٹھنڈا شربت، دودھ کے قدحے اور پانی کے مٹکے رکھے رہتے تھے وہ ڈگڈگا کر پانی پیتا تھا مگر یہی کہتا تھا کہ مجھے پیاس مارے ڈالتی ہے۔ قاسم بن اصبغ نے اس کا یہ حال دیکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر اس کا پیٹ ایک تیز آواز کے ساتھ پھٹ گیا۔ اور وہ مر گیا۔ اسی طرح ایک شخص بحر بن کعب نے امام حسینؑ کا لباس لوٹا تھا۔ اس کے ہاتھ ایسے ہو گئے تھے کہ سردیوں میں دونوں ہاتھوں سے پانی ٹپکا کرتا تھا اور گرمیوں میں لکڑی کی طرح خشک ہو جاتے تھے۔

عبداللہ بن عمار جو کہ یزید کی فوج میں سے تھا، کا بیان ہے کہ میں نے حسینؑ جیسے کسی بے کس و بے بس کو نہیں دیکھا کہ جس کی اولاد، اہلِ بیتؑ اور انصار سب قتل ہو چکے ہوں اور وہ اس دل، اس حواس اور اس جرأت سے لڑا ہو۔ لوگ داہنی اور بائیں جانب سے دوڑ کر آپ کو نرغے میں لے لیتے تھے مگر جس وقت آپ ان پر حملہ کرتے تھے تو وہ اِدھر اُدھر اس طرح بھاگتے تھے جیسے بھیڑیے کے حملہ کرنے سے بکریاں بھاگتی ہیں۔

شمر کے ماتحت ایک رسالہ تھا جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا اور جنگی ہتھیاروں سے لیس تھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ حسینؑ کی طرف بڑھیں۔ جب وہ بڑھے تو امامؑ نے ان پر حملہ کر دیا۔ اور اس قدر شدید ضربیں لگائیں کہ وہ اِدھر اُدھر بھاگے۔۔۔ ! یہ دیکھ کر دشمنوں نے سب طرف سے آپ کو گھیر لیا۔ حمید ابنِ مسلم کہتا ہے کہ اس پر بھی آپ نے ان سے مقابلہ کیا اور سب کو پسپا کر دیا۔

لکھا ہے کہ امام حسینؑ نے بہت دیر تک دشمنوں سے قتال کیا۔ جب داہنی جانب حملہ کرتے تھے تو پرے کے پرے صاف کر دیتے تھے اور لوگ بے تحاشا بھاگتے تھے، مگر بائیں جانب سے فوجیں بڑھ آتی تھیں۔ پھر ان پر حملہ کرتے تھے اور کشتوں کے پشتے لگ جاتے تھے۔ جنگ کی حالت یہ تھی کہ ہر طرف سے تیر آ رہے تھے اور لوگ پتھر مار رہے تھے۔ ایک پتھر امام حسینؑ کے ماتھے پر آ کر لگا۔ حضرتؑ کا ہاتھ ماتھے پر گیا تو ایک تیر گلے میں آ کر لگا اور پار ہو گیا۔ زخمی امامؑ نے وہ تیر پس گردن سے کھینچا۔ جنگ کے ہنگامے میں

مالک بن نُسیر کندی نے آپ کے سر پر تلوار ماری۔ ہائے امام حسینؑ کا سر شگافتہ ہو گیا اور اتنا خون بہا کہ عمامہ خون سے تر ہو گیا۔ پھر ایک شخص نے آپ کے شانے پر ضرب لگائی۔ امام کا کندھا زخمی ہو گیا۔ اسی اثنا میں سنان ابنِ انس نے آپ کو برچھی ماری۔ برچھی کا وار ایسا کاری تھا کہ امام حسینؑ سے گھوڑے پر سنبھلا نہ گیا اور زمین پر تشریف لائے۔ جسم پر اس کثرت سے تیر لگے ہوئے تھے کہ بدن تیروں پر ٹھہر گیا۔ ہائے اس وقت امام اُٹھتے تھے اور گر گر پڑتے تھے۔ اس وقت کربلا کا عالم یہ تھا کہ ذوالجناح امام حسینؑ کے گرد بھاگ بھاگ کر دشمنوں کے دولتیاں مار رہا تھا۔ زلزلہ آیا ہوا تھا۔ سورج کو گہن لگ رہا تھا۔ ادھر فوج کے لوگ آپ کو قتل کرنے کے لئے آگے کی طرف بڑھتے تھے مگر اس گناہِ عظیم کو اپنے سر لینے کے ڈر سے پیچھے ہٹ ہٹ جاتے تھے۔

اس حالت کو عبداللہ بن عمار کربلا کا ایک فوجی یوں بیان کرتا ہے کہ اسی حالت میں امام حسینؑ کی بہن جناب زینبؑ بنتِ فاطمہؑ بے قراری کے عالم میں خیمے سے باہر نکل آئیں۔ ان کے کان کے بُندے ہلتے ہوئے اب تک میری نگاہ میں ہیں۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھیں۔ ہائے! آسمان کیوں نہیں زمین پر پھٹ پڑتا۔ ابنِ سعد اس وقت امام حسینؑ کے قریب ہی گھوڑے پر سوار تھا۔ جنابِ زینبؑ بیتاب ہو کر عمر سعد کے گھوڑے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں اور بڑی بے قراری سے کہا۔ اے ابنِ سعد! میرے بھائی حسینؑ قتل ہو رہے ہیں اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔ مگر اس سنگدل نے کیا کیا؟

راوی آگے بیان کرتا ہے کہ امام حسینؑ کے قتل کے وقت وہ منظر تھا کہ ابنِ سعد جیسا ظالم شخص بھی جنابِ زینبؑ کی طرف سے منہ پھیر کر رونے لگا اور اس کے آنسو داڑھی تک بہہ گئے۔ مگر امام حسینؑ کو قتل سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ آخر ایک ظالم ترین شخص شمر ملعون نے وہ کام کیا کہ زمین و آسمان لرزنے لگے۔ زمین کربلا میں زلزلہ آگیا۔ سُرخ و سیاہ آندھیاں چلنے لگیں۔ جنابِ زینبؑ دیکھتی رہیں اور بہن کی نظروں کے سامنے بھائی کے گلے پر خنجر چلتا رہا۔ ایک دم یزید کی فوج میں فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ آواز آئی۔ اَلا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا ۔ ہائے حسینؑ

کربلا میں ذبح کر دیے گئے۔ ہائے حسینؑ کربلا میں شہید کر دیے گئے۔

جب ذوالجناح نے دیکھا کہ میرے آقا کو شہید کر دیا گیا ہے تو گھوڑا امامؑ کے خون کی طرف چلا۔ اپنی پیشانی سے لے کر ہونٹوں تک اپنے منہ کو امامؑ کے خون سے تر کیا پھر عالم بے کسی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاروں طرف فوج اشقیا میں گھرا ہوا تھا۔ ہمت سے کام لیا۔ خیموں کی طرف دوڑا۔ لوگوں نے تلواروں پر لے لیا۔ نیزے مارنے لگے، تیر برسانے لگے۔ گھوڑا زخم پر زخم کھاتا جاتا تھا اور دولتیاں مار مار کر لوگوں کو ہٹاتا جاتا تھا۔

لکھا ہے کہ جب گھوڑا خیموں کے قریب پہنچا تو حالت یہ تھی کہ باگیں کٹی ہوئی تھیں، زین ڈھلکی ہوئی تھی اور جسم پر اتنے تیر پیوست تھے کہ جیسے کوئی پرندہ بازو کھولے ہوئے آ رہا ہو۔ عربی میں جناح پرندے کے ایک بازو کو کہتے ہیں۔ اور ذوالجناح کا مطلب دو بازوؤں والا پرندہ ہے۔ امام حسینؑ کے گھوڑے کا نام مُرتجز تھا۔ لیکن جب تیروں کی وجہ سے دو بازوؤں والا نظر آیا۔۔ ہائے! تو اس وقت سے ذوالجناح نام ہو گیا۔

ذوالجناح گردن جھکائے ہوئے روتا ہوا خیموں کے پاس آیا۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔ خیمے کے باہر، بیبیوں کو اطلاع دینے کے لئے۔۔۔ زور سے ہنہنایا۔ گھوڑے کی اس قدر دردناک آواز تھی کہ خیمے میں بیبیوں کے دل دہل گئے۔ گھبرا کر باہر نکل آئیں۔ دیکھا کہ گھوڑا امام حسینؑ کی نشانی لایا ہے۔ بیبیاں دوڑ کر گھوڑے سے لپٹ گئیں۔ ہائے۔ گھوڑے! سوار کو کہاں چھوڑ آیا۔ ہائے ہم بے سہارا ہو گئے۔ ہائے ہمارا وارث کہاں گیا۔ اتنے میں جناب سکینہؑ کی آواز آئی۔ امی۔ امی! گھوڑے میں سے تو بابا کے خون کی بو آتی ہے۔ ارے! میرے بابا شہید ہو گئے۔ ہائے میں یتیم ہو گئی۔ ہائے، ہائے! رات کو کس کے سینے پر سوؤں گی۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ٭
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ٭

☆☆☆

چودھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ○ (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کا اپنے اقربا کی محبت کے سوا اور کوئی صلہ نہیں مانگتا ہوں۔

قرآن کی اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم نے رسول اللہ سے کہا تھا کہ اپنی اُمت سے کہہ دیجئے کہ میں اپنی تبلیغ رسالت کے صلے میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔۔ مگر ٹھہرو۔۔ مانگتا ہوں۔۔ اور وہ ہے میرے اقربا کی محبت۔

فضائل بیان کرنا مقصود نہیں۔ آج کی رات کے کچھ حالات بیان کرنا چاہتا ہوں۔۔ (رو کر) مجھے تو اس آیت کے لفظوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے سامنے کربلا کا واقعہ تھا کہ اُمت، رسول کے نواسے اور رسولؐ کے اقربا کے ساتھ ایسا سلوک کرے گی۔ لہٰذا اپنے رسول کے پاس آیت بھیج دی کہ ایسا نہ کرنا، رسولؐ کے اقربا کے ساتھ ظلم نہ کرنا۔ ان سے محبت کرنا۔

ابھی ابھی آپ عشرے کے جلوس میں شرکت کرنے کے بعد یہاں آکر بیٹھے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اُمت نے رسول اللہ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نواسے کے ساتھ آج کربلا میں وہ ظلم کئے کہ آج تک دُنیا بے قرار ہے۔ لوگ گھروں سے نکلے پھر رہے ہیں۔ عورتیں کہیں۔ بچے کہیں ہیں۔ جگہ جگہ جلوس برآمد ہو رہے ہیں۔ علم نکل رہے ہیں۔ ذوالجناح برآمد کئے جا رہے ہیں۔ قریہ قریہ، گلی گلی، شہر شہر میں امام حسینؑ کا نام لے کر لوگ گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ ماتم کر رہے ہیں، زنجیریں مار رہے ہیں، نوحے پڑھ پڑھ کر رو رہے ہیں۔ در و دیوار تک غمگین نظر آ رہے ہیں۔ ہائے فاطمہؑ کے لال کی بے کسی، ہائے رسولؐ کے نواسے کی بے بسی۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت کربلا کا کیا عالم ہے۔ جب امام حسینؑ شہید

ہو چکے اور فوج یزید میں خوشی کے نقارے بج چکے تو فوج کو حکم ہوا۔۔ حسینؑ کے خیموں کو لوٹ لو۔ حسینؑ کے خیموں کو آگ لگا دو۔۔ لوگ دوڑے۔۔ خیمے لوٹنے لگے۔ تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ خیمے لوٹنے کی حالت یہ تھی کہ لوگ بڑھ بڑھ کر بیبیوں کے سروں سے چادریں کھینچ رہے تھے۔ اور دوسرے لوگ ان سے چھین کر بھاگ جاتے تھے۔ لوٹ مار کا ہنگامہ برپا تھا۔ شمر ان میں بہت پیش پیش تھا۔ اس نے بیمار کربلا کے نیچے سے بڑی بے دردی سے بستر کھینچ لیا۔ ہائے جناب سکینہؑ سہمی ہوئی تھیں۔ شمر ان کی طرف بڑھا اور بچی کو پکڑ لیا۔ جناب سکینہ نے اپنے گوشوارے بچانے کے لئے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ ہائے شمر ان کے طمانچے مارنے لگا۔ بچی نے گھبرا کر کانوں سے ہاتھ ہٹا لئے۔ شمر نے بُندے اُتارے نہیں بلکہ پکڑ کر اس زور سے کھینچے کہ کانوں کا گوشت کٹ گیا۔ بندے نکل آئے۔ بچی کے کانوں سے خون بہنے لگا۔ جب دشمن خیموں کو لوٹ چکے تو ان میں آگ لگا دی۔ بیبیاں اور بچے نکل نکل کر خیموں سے باہر بھاگے۔

حمید ابن مسلم کہتا ہے کہ میں نے خیموں سے ایک بچی کو نکل کر بھاگتا ہوا دیکھا۔ اس کے دامن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں اس کی آگ بجھانے کے لئے اس کے پیچھے دوڑا بچی تیز بھاگنے لگی۔ اچانک ٹھوکر کھا کر گری تو ہاتھ جوڑ کر خوشامد سے کہنے لگی۔ اے شیخ! مجھے ہاتھ نہ لگا۔ جو کچھ چھیننا ہے، منہ سے مانگ لے۔ میں نے کہا میں تو تمہاری آگ بجھانے آیا ہوں۔۔ اس بچی نے جو مجھے رحم دل پایا۔ رو کر کہنے لگی۔ تو پھر مجھے نجف کا راستہ بتا دو۔ میں نے کہا وہاں جا کر کیا کرو گی۔۔ کہنے لگی۔ وہاں میرے دادا علی مرتضےٰ ہیں۔ ان سے فریاد کروں گی۔۔ دادا!۔۔ شمر نے میرے طمانچے مارے۔۔ میرے کانوں سے بالیاں چھین لیں۔ خون بہہ رہا ہے۔

اسی راوی کا بیان ہے کہ ایک بی بی گھبرا کر کبھی خیموں میں جاتی تھی۔ کبھی جلدی سے باہر آ جاتی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔۔ بی بی! کیا تمہاری کوئی قیمتی چیز خیموں میں رہ گئی ہے۔ اس بی بی نے کچھ نہ کہا۔۔ پھر جو وہ ایک خیمے میں گئیں تو دیکھا کہ ایک بیمار کو سینے سے لگائے کھینچتی ہوئی آ رہی ہیں۔ ہائے امام زین العابدینؑ غش میں پڑے تھے

اور خیموں میں آگ لگی ہوئی تھی۔
جب خیمے جل چکے اور ظالم اہلِ حرم کو لوٹ کر چلے گئے تو جناب زینبؑ نے سب بیبیوں اور بچوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ بچے ڈر کے مارے ادھر ادھر بھاگ کر چھپ گئے تھے۔ ڈھونڈنے سے سب بچے تو مل گئے۔ لیکن دو چھوٹے بچے نہ ملے۔ جناب اُمّ کلثومؑ نے کہا کہ آؤ بہن زینبؑ ہم دونوں چلیں اور بچوں کو ڈھونڈ کر لائیں۔ دونوں چلیں۔ لاشوں اور گڑھوں میں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں کہ جناب اُمّ کلثوم نے دیکھا، دو بچے ایک جھاڑی کے نیچے لیٹے ہوئے سو رہے ہیں۔ جناب زینبؑ کو پکارا۔ بہن، بہن! آؤ۔۔ بچے مل گئے ہیں۔ یہ دیکھو جھاڑی کے نیچے سو رہے ہیں۔ دونوں بیٹھ گئیں۔ پیار سے دونوں بچوں کو جگانے کے لئے آواز دی۔ مگر بچے زندہ ہوتے تو بولتے۔ دیکھا کہ بچوں کے سینوں پر گھوڑوں کی ٹاپوں کے زخم ہیں اور دونوں بچے اللہ کے گھر کو سدھار گئے ہیں۔ کفن تو تھا نہیں جو دفن کرتیں، مجبور ہو کر روتی ہوئی، واپس آگئیں۔
جب شام ہو گئی اور سورج کی زرد زرد کرنیں میدان کربلا پر پڑنے لگیں تو دیکھا کہ پرندے اُڑتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔ جانور اپنے اپنے مسکنوں کی طرف رُخ کر رہے ہیں۔ فوج یزید کے سپاہی کمر کھول رہے ہیں۔ اور آرام کرنے کے لئے اپنے اپنے ہتھیار اُتار رہے ہیں۔ کربلا کی جلتی ہوئی ریت بھی ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔ تو یہ دونوں بیبیاں بچوں اور عورتوں کو لے کر جلے ہوئے خیموں کے پاس بیٹھ گئیں۔
ادھر فوج یزید کو حکم آیا کہ ابھی کمریں مت کھولو۔۔ حسینؑ اور اُن کے جاں نثاروں کی لاشوں کو پامال کیا جائے گا۔ یہ سُن کر اصحاب حسینؑ کے قبیلے والے بگڑ گئے۔ تلواریں کھینچ لیں اور کہا۔ اگر ہمارے عزیزوں کی لاشیں پامال کی گئیں تو ابھی خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ یزید کی حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔ یہ خبر ابن سعد کو پہنچی تو ڈر گیا۔ کہنے لگا۔ اچھا! اپنے اپنے قبیلے والوں کی لاشیں اُٹھا کر لے جاؤ۔ ایک ایک قبیلہ آتا تھا، اپنے اپنے عزیز کی لاش اُٹھا کر لے جاتا تھا۔ یہ خبر جناب زینبؑ کو بھی ہوئی بنت علیؑ بھاگی ہوئی آئیں۔ رو کر ابن سعد سے کہا۔ للہ! میرے بھائی کا لاشہ بھی اُٹھانے کی اجازت دے

دے۔ مگر اس ظالم نے اجازت نہ دی۔ جناب زینبؑ کھڑی دیکھتی رہیں۔ ہائے بھائی کا لاشہ پامال ہو گیا۔ اِدھر کے گھوڑے اُدھر بھاگ گئے۔ اُدھر کے گھوڑے ادھر بھاگ گئے۔

جب جناب زینبؑ گھوڑوں سے لاشوں کی پامالی کے بعد پھر چلتے ہوئے خیموں کے پاس واپس آئیں تو ایک نئی مصیبت پیش آئی۔ بچوں میں سے جناب سکینہؑ غائب تھیں۔ گھبرا گئیں۔ ہائے بچی کہاں چلی گئی۔ ہائے کہیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے تو پامال نہیں ہو گئی۔ پریشان ہو کر ڈھونڈنے نکلیں۔ میدان میں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں کہ ایک طرف لاشوں میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اُدھر کو گئیں دیکھا تو سکینہؑ باپ کے لاشے سے لپٹی ہوئی اندھیرے میں رو رہی ہے۔ پھوپی نے سمجھایا بچی کو دلاسا دیا۔ باپ کی لاش سے جدا کر کے خیمے میں لانے لگیں۔ پوچھا۔ سکینہؑ! بابا کا لاشہ کس طرح پہچانا۔ بغیر سر کے لاش کو کیسے جان لیا کہ یہ بابا کی لاش ہے۔۔! جناب سکینہؑ نے روتے ہوئے عرض کیا۔ پھوپی اماں! جب رات ہونے لگی تو بابا کا سینہ یاد آنے لگا۔ میں خیموں سے اُٹھ کر میدان کربلا میں آ گئی۔ بابا۔۔ بابا کہہ کر پکارتی جاتی تھی اور دوڑتی جاتی تھی۔ لاشوں سے ٹکرا کر گر پڑ رہی تھی۔ جب کئی دفعہ گری تو میں نے چلا کر کہا۔۔ بابا، ہائے بابا! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں اور آپ جواب نہیں دیتے۔ پھوپی اماں! ایک طرف سے لاشوں میں سے آواز آئی: اِلَیَّا، اِلَیَّا۔۔ بیٹی! میرے پاس آجا، میرے پاس آجا۔ میں اُدھر کو دوڑی۔ دیکھا تو ایک لاش کے ہاتھ اُٹھے ہوئے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں۔ میں نے سمجھ لیا۔ یہی میرے بابا کی لاش ہے۔ میں ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ کٹے ہوئے گلے پر منہ رکھ دیا۔ رو رہی تھی کہ بابا! شمر نے طمانچے مارے، کانوں سے بُندے نوچ لئے۔ جناب زینبؑ بچی کو سمجھا بجھا کر خیموں کے پاس لے آئیں۔

پھر جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو فوج یزید میں باتیں ہونے لگیں کہ حسینؑ کے بچوں کو کھانا بھجوانا چاہیئے۔ جسے بھی کھانا بھیجنے کے لئے کہا جاتا تھا، منع کر دیتا تھا کہ کس منہ سے کھانا لے کر جائیں۔ آخر جناب حُر کی بیوہ کو کھانا دے کر بھیجا گیا۔ آہ! جناب حُر کی بیوہ کھانا لے کر آئیں۔ بیبیوں کو سمجھا بجھا کر کھانا دینے لگیں۔ جناب زینبؑ نے کہا بہن ہم تو

تم سے شرمندہ ہیں تم اپنے شوہر کی سوگوار ہو۔ ہم تو تمہیں پُرسہ بھی نہ دے سکے۔

غرض جنابِ زینبؑ نے کھانے کے لئے سوئے ہوئے بچوں کو اُٹھایا۔ جناب سکینہؑ سے کہا۔ اُٹھو کھانا آگیا ہے، سکینہ اُٹھو! پانی آگیا ہے۔ جناب سکینہؑ اُٹھ بیٹھیں۔

جناب زینبؑ نے بچی کو پانی کا پیالہ دیا۔ پوچھا۔ پھوپی! سب سے پہلے مجھے کیوں دے رہی ہو۔ فرمایا۔ اس لئے کہ تم سب سے چھوٹی ہو۔ جناب سکینہؑ نے پیالہ لیا۔ میدانِ کربلا کی طرف چلیں۔ پھوپی نے کہا۔ بیٹی! کہاں جا رہی ہو۔ رو کر کہا۔ میرا بھائی علی اصغرؑ، ہائے میرا بھائی علی اصغرؑ مجھ سے بھی چھوٹا ہے۔ اُنھیں پانی دینے کے لئے جا رہی ہوں۔

کربلا کا ایک فوجی جمال بیان کرتا ہے کہ جب امام حسینؑ میدانِ کربلا میں جنگ کر رہے تھے تو ان کا ازار بند لٹک گیا۔ میں نے دیکھا، وہ ازار بند بہت چمکدار تھا۔ مجھے وہ پسند آیا۔ اسی طرح ان کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی، وہ بھی مجھے بہت پسند تھی۔ جب اُن کی شہادت ہوگئی تو رات کو میں ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے میدان میں ان کی لاش کے پاس آیا۔ دیکھا تو ازار بند اور انگوٹھی موجود تھے۔ میں نے ان کا ازار بند کھینچا ان کے دونوں ہاتھ اُٹھے اور انھوں نے ازار بند کو پکڑ لیا۔ میں نے کوشش کر کے ازار بند کھینچ لیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کپڑے کو پکڑے رہے۔ پھر میں ان کی انگلی سے انگوٹھی اُتارنے لگا۔ کسی صورت انگوٹھی نہ اُترتی تھی۔ میں اُٹھا اور میدان میں کوئی لوہے کی کاٹنے کی چیز ڈھونڈنے لگا۔ مجھے ایک تلوار کا ٹکڑا مل گیا۔ میں نے اسے اُٹھایا اور پھر امام کی لاش کے پاس گیا۔ اب میں نے وہ اُنگلی ہی کاٹ لی جس میں امام انگوٹھی پہنے ہوئے تھے۔

ازار بند اور انگوٹھی لے کر میں واپس چلا۔ تھوڑی ہی دُور چلا تھا کہ مجھے پیچھے سے روشنی آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے جو مڑ کر دیکھا تو آسمان سے ایک نور کی شعاعیں امام حسینؑ کی لاش پر پڑ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں، میں نے دیکھا کہ اس نور سے ایک عماری گزرتی ہوئی آسمان سے زمین پر اُتر رہی ہے۔ میں ڈرا اور وہاں پڑے ہوئے لاشوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب وہ عماری زمین پر اُتری تو اُس میں سے نورانی شکل کے ایک بزرگ باہر نکلے۔ ان کے پیچھے ایک اور شخص نورانی شکل کے اُترے۔ پھر ایک جوان

اُترا۔ آخر میں ایک معظّمہ عماری سے باہر آئیں۔ انھوں نے جو امام حسینؑ کو اس حال میں دیکھا تو رو رو کر بین کرنے لگیں۔ ہائے ہائے حسینؑ! وہ کون ظالم تھا جس نے قتل کے بعد تیری لاش سے سر اُتار لیا۔ ہائے حسینؑ! وہ کون شقی تھا جس نے لاش کا ازار بند کھینچ لیا۔ ہائے میرے بیٹے، ہائے میرے لعل!۔۔ میں نے تجھے چکیاں پیس پیس کر پالا تھا۔ ہائے وہ کون ظالم تھا جو میرے بیٹے کی انگلی کاٹ کرلے گیا۔ جب میں نے یہ سُنا تو میں سہم گیا۔ تھکا تھکا لاشوں میں کو بھاگا اور اپنی فوج میں واپس آ گیا۔

فوج اشقیا نے بیبیوں کو رات بسر کرنے کے لئے ایک جلا ہوا خیمہ دے دیا تھا۔ سب اس میں بیٹھ گئیں۔ بچوں کو سُلا دیا۔ اور خود جناب زینبؑ ایک نیزہ ہاتھ میں لے کر پہرہ دینے لگیں۔ پہرہ دیتے دیتے جب آدھی رات کا وقت ہوا تو میدان کی طرف سے ایک شخص گھوڑے پر سوار خیموں کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ جناب زینبؑ ہوشیار ہو گئیں۔ جب وہ شخص خیموں کے قریب ہی آنے لگا تو جناب زینب نے آواز دے کر اسے روکا اور کہا۔ بھائی! اگر لوٹنا ہی ہے تو دن کو آ کر لوٹ لینا۔ بچے روتے روتے سو گئے ہیں۔ مگر سوار نہ رُکا۔ خیموں کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ جناب زینبؑ اسے رُکنے کے لئے کہے جا رہی تھیں اور وہ بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا۔ آخر جناب زینبؑ کو جلال آ گیا بڑھ کر گھوڑے کی لگام پر ہاتھ ڈال دیا اور غصے سے کہا۔ ظالمو! اب بھی لوٹنے سے پیٹ نہیں بھرا۔ حسینؑ کے بچے روتے روتے سو گئے ہیں۔ اگر واپس نہ گیا تو یاد رکھ حیدر کرارؑ کی بیٹی ہوں۔ نیزے سے ایسی جنگ کروں گی کہ صبح تک خیمے میں گھسنے نہ دوں گی۔ ہائے گھوڑے سوار نے نقاب اُلٹ دی۔ دیکھا تو بابا علیؑ ہیں۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں۔ کہا۔ بیٹی! تم آرام کرو۔ ہم پہرہ دینے آئے ہیں۔ جناب زینبؑ نے جو دیکھا۔ رکابوں میں پیروں سے لپٹ گئیں۔ چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ بابا! عباسؑ مارے گئے۔ بابا! حسینؑ بھی شہید ہو گئے۔ ۔۔ بابا! ہماری چادریں لُٹ گئیں۔۔ بابا! ظالموں نے ہمارے بچوں کو طمانچے مارے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ٥

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ٥

پندرھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۝ (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کا اپنے اقربا کی محبت کے سوا اور کوئی صلہ نہیں مانگتا ہوں۔

آیت میں معاوضہ طلب کیا گیا ہے۔ معاوضہ کے لئے چار چیزوں کا وجود ہونا ضروری ہے۔ ایک معاوضہ لینے والے، دوسرے معاوضہ دینے والے، تیسرے وہ چیز جس کا معاوضہ دیا جارہا ہے۔ یعنی تبلیغ وقرآن اور چوتھے وہ چیز جو معاوضے میں دی جارہی ہے یعنی محبت۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کا معاوضہ ادا کردیا جاتا ہے تو وہ شے اپنی ہوجاتی ہے ورنہ اس پر تصرف غصبی کہلاتا ہے۔ قرآن کا معاوضہ محبت اہلبیتؑ ہے۔ محبت ایک ایسی حالت ہے جو دل پر وارد ہوتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ محبت کرنے والا اپنی محبوب چیز کی بقا اور بھلائی کا خواہاں ہوتا ہے اور محبوب کو ہر تکلیف اور آزار سے بچاتا ہے۔ دنیا میں اتنی محبت کسی کو کسی سے نہیں ہوتی۔ جتنی محبت ماں کو بچے سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر ماں کا مقابلہ اہلبیتؑ کی محبت سے کرایا جائے تو ماں اہلِ بیت کے مقابلے میں بچے کو چھوڑ دے گی۔ اور وہ مائیں جو اپنے بچوں کو اہلِ بیتؑ کے مقابلے میں نہ چھوڑیں، سمجھ لیجئے کہ وہ اس نام سے تعلق نہیں رکھتیں۔

جب اہلِ بیتؑ کا اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ ہمارا سب کچھ ان کے لئے قربان ہے اور ہم ان کے حکم پر ہر فعل بجالانے کو تیار ہیں تو یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ اہلِ بیتؑ کو ہر خطا سے مبرا ہونا چاہیئے۔ اگر وہ معصوم نہ ہوں گے تو ہمیں بھی ایسے کاموں کا حکم دے دیں گے جو قرآن کے خلاف ہوں گے۔ لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قرآن ہی کا ہم انھیں معاوضہ دے رہے ہیں اور وہ قرآن ہی کے خلاف ہم سے عمل کرالیں۔ معاوضہ دینے پر چیز اپنی ہوجاتی ہے اور یہاں

معاوضہ دینے پر قرآن چھن جائے گا لہٰذا اہلِ بیت غیر معصوم نہیں ہو سکتے۔ (صلوٰۃ)

دوسرے ان کے پاس قرآن کا پورا پورا علم ہونا چاہیئے۔ ورنہ نادانی میں ہم کو ایسا حکم دیا جا سکتا ہے جو قرآن کے مطابق نہ ہو۔ اقربا کی یہ شان ہو کہ ان کا ہر حکم قرآن بنتا چلا جائے۔ قرآن کتاب ہو اور وہ اس کا عمل بتانے والے ہوں۔ قرآن خاموش ہو اور وہ بولنے والے قرآن ہوں۔ قرآن مجمل ہو اور وہ اس کی تفسیر بتانے والے ہوں۔

جنابِ رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ کی شان میں ارشاد فرمایا اَللّٰهُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ حَيْثُ مَادَارَ۔ اے پروردگار! حق کو اس طرف گھما دے جس طرف علیؑ مڑیں یہ نہیں فرمایا جس طرف کو حق مڑے اسی طرف علیؑ کو گھما دے۔ اگر ایسا کہتے تو علیؑ حق کے تابع ہو جاتے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ حق علیؑ کا تابع ہے۔ جس طرف علیؑ کا رُخ ہو جائے گا۔ پیچھے پیچھے حق بھی اُدھر ہی کو چلا آئے گا۔

حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں۔ لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ لَمَا ازْدَدْتُ يَقِيْنًا اگر میرے سامنے سے پردے ہٹا دیئے جائیں تب بھی میرے یقین میں کچھ زیادتی نہ ہوگی۔ یعنی ہر چیز کا مکمل علم موجود ہے۔

ایک دفعہ کچھ لوگوں نے حضرت علیؑ کا مذاق اُڑانے کے لئے ایک زندہ شخص کو مردہ بنا کر پلنگ پر لٹا دیا اور میت کی نماز پڑھانے کے لئے جنازہ مسجد میں لے آئے۔ حضرت علیؑ سے کہا کہ میت کی نماز پڑھا دیجئے۔

مولا نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ سب لوگ صفیں باندھ کر پیچھے کھڑے ہوئے۔ ادھر حضرت علیؑ نے نمازِ میت کی نیت کی ادھر عزرائیل کو حکم ہوا کہ فوراً روح قبض کر دو۔ جسے علیؑ نے مردہ کہہ دیا، وہ اب زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟

جب نماز پڑھا چکے تو فرمایا: اپنا مردہ لے جاؤ۔ لوگوں نے ہنس کر کہا جناب! یہ مردہ نہیں، زندہ ہے۔ آپ تو کہتے ہیں کہ اگر میرے سامنے سے پردے بھی ہٹ جائیں تب بھی میرے یقین میں زیادتی نہ ہوگی مگر یہاں آپ کو چادر کے نیچے کا بھی آدمی نظر نہیں آ رہا ہے کہ زندہ ہے یا مردہ ہے؟

آپ نے فرمایا۔ بھائی! پردہ اُٹھا کر دیکھ لو۔ سب نے پردہ اُٹھایا۔ اسے بہتیری آوازیں دیں مگر وہ زندہ ہوتا تو اُٹھتا۔ آئے تو تھے مذاق اُڑانے مگر اب خود ہی پھنس گئے۔ اُدھر اس جوان کی بوڑھی ماں سب کے پیچھے پڑ گئی کہ میرا لڑکا زندہ کر کے دو۔

معلوم ہوا قرآن اور اقربا کا ایک ذات ہونا ضروری ہے۔ اسی کو قدرت نے قرآن سے سمجھا دیا اور ایسا سمجھایا کہ کوئی دوسرا اس طرح سمجھا نہیں سکتا۔ ارشاد ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ اللہ کی رسیوں کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ مت ڈالو۔ ظاہر ہے اللہ کی رسیاں تو لٹک نہیں رہی ہیں۔ جو ہم پکڑ لیں۔ یہاں ضرور کوئی اور مطلب ہے۔ اہلِ تفاسیر نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ رسولؐ اللہ نے اس کی تفسیر میں یہ حدیث ارشاد فرمائی: اِنِّىْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابُ اللّٰهِ عِتْرَتِىْ وَاَهْلُ بَيْتِىْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِىْ وَلَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَىَّ الْحَوْضَ ۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب، دوسرے میری عترت اور اہلِ بیتؑ۔ اگر تم ان سے تمسک رکھو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور ان دونوں میں جدائی نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ یہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچ جائیں گے۔ اگر آپ آیت اور حدیث دونوں پر غور فرمائیں تو سب کچھ نظر آ جائے گا۔

آیت میں رسّی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور رسی میں کم از کم دو لڑیں ہونا ضروری ہیں۔ زنجیر وغیرہ کا لفظ نہیں کہا گیا۔ اگر ایک لڑ ہو تو وہ رسّی نہیں کہلائی جا سکتی۔ حدیث میں بھی دو ہی چیزیں چھوڑنے کا ذکر ہے کہ ایک قرآن چھوڑتا ہوں اور دوسرے اہلِ بیتؑ۔

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک لڑ میں کئی کئی تاریں ہوں، لہٰذا قرآن بھی سورتوں کا مجموعہ ہے اور اسی طرح اہلِ بیتؑ اور عترت بھی اماموں اور معصومین کا مجموعہ ہیں۔

رسّی کی ایک لڑ جہاں سے شروع ہوتی ہے دوسری بھی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا ارشاد ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ ۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور اور کتاب مبین آئی۔ یعنی جہاں سے قرآن چلا وہیں سے اہلِ بیتؑ بھی چلے۔

رسّی کی دوسری لڑ جہاں ختم ہوتی ہے وہیں پہلی لڑ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ ۔ دونوں کے دونوں رسولؐ کے پاس حوضِ کوثر تک پہنچیں گے۔

جو کام ایک لڑ کرتی ہے وہی کام دوسری لڑ کرتی ہے یعنی اگر ایک لڑ بالٹی میں باندھ کر پانی بھرنے کا کام دے رہی ہے تو دوسری لڑ کو بھی ساتھ رکھنا پڑے گا ورنہ ایک لڑ ٹوٹ جائے گی۔ اور بالٹی ڈوب جائے گی۔ اسی طرح ایمان کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے قرآن اور اہلِ بیتؑ دونوں سے تمسک رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایک کو بھی چھوڑ دیا تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

جب آپ رسّی کو دیکھتے ہیں تو ایک لڑ نظر آتی ہے اور دوسری لڑ اس کے پیچھے ہوتی ہے۔ پھر پیچھے والی لڑ سامنے آجاتی ہے اور سامنے والی لڑ پیچھے چلی جاتی ہے۔ قرآن اور اہلِ بیتؑ کو بھی آپ اسی طرح دیکھیں گے۔ جب علیؑ پیدا ہوئے تو قرآن نظر نہیں آرہا تھا مگر حضرت علیؑ نے رسولؐ کی گود میں قرآن سنایا۔ اسی طرح آج قرآن نظر آرہا ہے تو بارہویں امام غائب ہیں۔ (صلواۃ)

اگر قرآن کا دعویٰ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔ ہے تو اہلِ بیتؑ کے لئے بھی كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۔ آیت ہے۔ یعنی اگر قرآن میں ہر خشک و تر ہے تو امامِ مبین میں بھی ہر چیز محصور کر دی گئی ہے۔ اسی لئے حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا: سَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ۔ جو کچھ پوچھنا ہے وہ مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ میں تم میں نہ رہوں۔

اگر قرآن قلبِ رسولؐ پر اُترے گا اور زبانِ رسولؐ سے ظاہر ہوگا تو علیؑ کعبے میں پیدا ہوں گے اور آغوشِ رسولؐ میں ظاہر ہوں گے۔ اگر کوئی قرآن کی تلاوت کرے گا تو اہلِ بیتؑ کا ذکر قرآن میں آئے گا۔ اسی طرح اگر کوئی اہلِ بیتؑ کا ذکر کرے گا تو قرآن کی تفسیر اور ذکر ہونے لگے گا۔

رسّی کی دونوں لڑیں ہر زمانے اور ہر محل پر ساتھ رہتی ہیں اور جدا نہیں ہوتیں

یہاں تک کہ جل کر بھی دونوں کے بل غائب نہیں ہوتے۔ اسی طرح قرآن اور اہلِ بیتؑ مرنے کے بعد بھی جُدا نہیں ہوتے۔ امام حسینؑ کے سر نے نیزے پر قرآن کی تلاوت کر کے کوفے اور شام کے بھرے بازاروں میں علی الاعلان بتایا کہ دیکھو قرآن اور اہلِ بیتؑ میں جدائی ناممکن ہے۔

رسّی کی دونوں لڑیں ایک ہی جگہ تیار ہوتی ہیں۔ جس شخص نے ایک لڑ کو بنایا ہے وہی دوسری لڑ تیار کر کے رسّی بناتا ہے۔ قرآن خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے لہٰذا اہلِ بیتؑ بھی خدائی کارخانے میں تیار ہونے چاہئیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ؕ اے اہلِ بیتؑ! خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ہر طرح کی بُرائی سے دُور رکھے۔ اور ایسا پاک و پاکیزہ قرار دے جیسا کہ پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

معلوم ہوا جس طرح قرآن کا اہتمام خدا کے یہاں ایسا ہوا ہے کہ اس کی ایک سورت بھی کوئی بنا کر نہیں لاسکتا اسی طرح اہلِ بیتؑ کی پاکیزگی بھی ایسی ہوگی کہ کوئی ان کے برابر طاہر نہیں ہوسکتا۔ طاہر کرنے والی چیزوں میں یوں تو آگ، مٹی، دھوپ وغیرہ بھی چیزوں کو پاک کر دیتی ہیں لیکن ان سب سے زیادہ افضل پانی ہے کہ وہ سوائے نجس العین چیزوں کے ہر چیز کو پاک کرسکتا ہے۔ مگر پانی ان چیزوں کو اسی وقت پاک کرتا ہے جب وہ پانی سے چھو جائیں۔ اگر کوئی سمندر کے کنارے بھی نجس کپڑا رکھ دے تو وہ پانی سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے پاک نہیں ہوگا۔

سمندر کی لہریں اسے اُچھل اُچھل کر دیکھتی رہیں گی، پانی کا شور اسے پکار پکار کر اپنے سے غیر بتائے گا، موجیں اسے اپنی طرف بلانے کے لئے اشارے کریں گی مگر جب تک وہ پانی سے دُور رہے گا، پاک نہیں ہوسکتا۔ اور جیسے ہی اسے پانی میں غوطہ دیا جائے گا، وہ پاک ہو جائے گا۔ لیکن اہلِ بیتؑ کی یہ شان ہے کہ اگر ایک کافر جو نجس العین ہے، یہاں بیٹھا ہوا بھی کلمۂ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھ لے تو وہ پاک ہو جائے گا۔ اسے اہلِ بیتؑ سے مس ہونے کی ضرورت نہیں۔ صرف زبان پر نام آنا کافی ہے۔

اس موقع پر ایک سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو طالب اور رسولؐ اللہ کے باپ دادا کافر تھے کیونکہ اسلام تو رسولؐ اللہ کے بعد آیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ جب کلمے میں ان کا نام لینے سے کافر مسلمان ہو جاتا ہے اور اس کا جسم، پسینہ، کپڑے وغیرہ سب پاک ہو جاتے ہیں تو جن بزرگوں کے صلبوں میں رسولؐ اللہ کا وجود تھا انھیں کیسے کافر کہہ سکتے ہو۔ نام لینے سے کفر کے دور ہونے کے تو قائل ہو مگر باپ کے جسم میں وجود ہونے سے اسلام داخل ہونے کے قائل نہیں ہو؟ معلوم ہونا چاہیے کہ نبی اور امام کا نور جن صلبوں میں ہو گا وہ کافر ہو ہی نہیں سکتے۔ (نعرۂ حیدری)

اس پر تمام فرقوں کے علماء کا اتفاق ہے کہ اہلِ بیتؑ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت علیؑ جناب فاطمہؑ اور امام حسنؑ و امام حسینؑ ہیں لیکن پھر بھی کچھ لوگ اس میں ازواجِ رسول کو شامل کرتے ہیں۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ مذکر کے لئے علیحدہ ضمیر آتی ہے اور مؤنث کے لئے دوسری ضمیر آتی ہے لیکن اگر مذکر اور مؤنث ملے جلے ہوں تو جن کی تعداد زیادہ ہو گی، اس کی ضمیر لائی جائے گی۔ اب اگر اس آیت میں ازواجِ رسول کو شامل کر لیا جائے تو رسولؐ اللہ کے نو بیویاں تھیں۔ نو عورتیں تو یہ ہوئیں اور دسویں عورت جناب فاطمہؑ ہیں، ان کے شاملات میں حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ یعنی تین مرد ہیں۔ لہٰذا عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے مؤنث کی ضمیر لانی ضروری تھی مگر آیت میں لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ہے اور عَنكُنَّ نہیں ہے یعنی وہ مردوں کی ضمیر ہے اور عورتوں کی ضمیر نہیں ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اس گروہ میں عورتیں زیادہ نہیں بلکہ مرد زیادہ ہیں اور وہ بھی چار ہستیاں ہیں یعنی جناب فاطمہؑ، علیؑ اور حسنؑ و حسینؑ علیہم السلام۔

غرض جو شان رتی کی ایک لڑی کی ہوتی ہے وہی شان دوسری لڑی کی ہوتی ہے لہٰذا جو شان قرآن کی ہو گی وہی شان اہلِ بیتؑ کی ہو گی۔ جہاں اہلِ بیتؑ ہوں گے وہاں قرآن ہو گا اور جہاں قرآن ہو گا وہاں اہلِ بیتؑ ہوں گے۔ جب کوئی قرآن کو پڑھے گا تو اہلِ بیتؑ کا ذکر اس میں آئے گا۔ اِسی طرح جب کوئی اہلِ بیتؑ کا ذکر کرے گا تو

ناممکن ہے کہ اس میں قرآن کا ذکر نہ آئے۔

اگر ایک جاہل شخص جو قرآن نہ پڑھ سکتا ہو، اہلِ بیتؑ کے افعال و اعمال کو دیکھ کر ان پر عمل کرے تو ایسا ہی ہے گویا اس نے قرآن پڑھ کر اس پر عمل کیا ہے کیونکہ اہلِ بیتؑ قرآنِ ناطق ہیں۔ قرآن پڑھنے سے جو مفہوم ذہن میں آتا ہے، وہی اہلِ بیتؑ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ اب چاہے قرآن سے سمجھ کر وہ فعل کر لو یا اہلِ بیتؑ کا عمل دیکھ کر ویسا ہی کرنے لگو، بات ایک ہی ہوگی۔ البتہ قرآن سے تو خود سمجھ کر کام کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے مگر اہلِ بیتؑ کے کیے ہوئے کو دیکھ کر غلطی نہیں ہو سکتی۔

قرآن ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اہلِ بیتؑ حاکموں کی طرح ہیں۔ جس طرح اگر حاکم نہ ہوں تو قانون کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ قرآن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مُردے جلائے جا سکتے ہیں اور پہاڑ کو حکم دیں تو پہاڑ ہٹائے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ اہلِ بیتؑ کے بغیر ایسا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن بے اثر ہے۔ اہلِ بیتؑ کو چھوڑنے سے صرف قرآن کے ظاہر الفاظ آپ کے پاس ہیں۔ اس لئے آپ کے قرآن سے نہ مردے زندہ ہوتے ہیں اور نہ پہاڑ ہٹائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر اہلِ بیتؑ ہوں تو کیا مجال کہ ان کے کہنے سے پہاڑ نہ ہٹیں یا مُردے زندہ نہ ہوں۔ (صلوٰۃ)

سرکاری حاکم ہمیشہ اسی قانون پر عمل کراتے ہیں جو سرکار کی طرف سے باقاعدہ جاری کیا گیا ہو۔ دفاتر میں اس کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا حاکم زبانی حکم دے گا تو اس پر کوئی عمل نہیں کرے گا۔ اسی طرح وہ قانون جو کوئی شخص جاری کر دے اور وہ دفاتر کی فائلوں میں نہ ہو تو وہ قانون جعلی شمار ہوگا اور اس پر کوئی سرکاری افسر عمل کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص کسی کی جائیداد نیلام کرنے کا حکم زبانی بھیج دے تو کوئی افسر اس پر عمل نہیں کرے گا بلکہ حکم دینے والے ہی کو گرفتار کر لیا جائے گا کیونکہ یہ حکم سرکاری فائلوں میں ریکارڈ نہیں ہے۔

لہٰذا قرآن اگر کوئی حکم یا قانون ہے تو اس کا بھی ریکارڈ کہیں محافظ خانے میں

ہونے چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ۝ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۔ اسے کوئی نہیں قرآن کریم پوشیدہ کتاب میں ہے۔ چھو سکتا سوائے پاک بندوں کے ۔ حکومت کی بعض ہدایتیں خفیہ (کونفیڈنشل) ہوتی ہیں۔ جسے وہ عام لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ قرآن میں بھی اس طرح کی خفیہ ہدایتیں اور پوشیدہ راز ہیں۔ مثلاً الٓمٓ (الف، لام، میم) اور الٓرٰ (الف، لام، را) وغیرہ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خدا نے یہ الفاظ بیکار کہے ہوں۔ لہٰذا ضرور اہلِ بیت کو خفیہ ہدایتیں کی گئی ہیں۔

اب اگر اہلِ بیت کو چھوڑ کر قرآن لے لیا جائے تو کون ان خفیہ اشاروں کو سمجھائے گا۔ اس لئے چارہ ہی نہیں کہ اہلِ بیت کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کو حاکم شریعت مان لیا جائے۔ امام حسینؑ نے اسی وجہ سے تو یزید کی بیعت سے انکار کیا تھا کیونکہ وہ شریعت کا اصلی حاکم نہ تھا۔ بھلا امام حسینؑ شریعت کے نگران ہو کر یزید کی کیسے بیعت کر سکتے تھے۔ ان کی بیعت پر تو اسلام ہی ختم ہو جاتا اور اُمت تباہ ہو جاتی۔

امام حسینؑ کے مرتبے کو انسان تو انسان پرندو چرند تک جانتے تھے۔ رسولؐ اللہ نے بارہا آپ کی عظمت کا تعارف کرایا تھا۔ بڑے بڑے مجمعوں میں ایسے واقعات ہوئے تھے کہ رسولؐ اللہ نے امام حسینؑ کی تعظیم کی تھی۔ کیا نماز میں رسولؐ خدا کی پشت پر سوار ہونے کا واقعہ بھولنے والی بات تھی۔ کیا عید گاہ میں نانا کا نچّے اس کے لئے ناقہ بننا مسلمان فراموش کر سکتے تھے۔ کیا امام حسینؑ کا راہب کو سات بیٹے عطا کرنا مسلمانوں کے علم میں نہ تھا۔ کیا ہرنی کا اپنے بچے کو امام حسینؑ کے لئے لانا لوگ نہ جانتے تھے۔ کیا رسولؐ اللہ کی حدیث اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ لوگ بھول گئے تھے۔ کیا یہ بات ذہن سے نکل گئی تھی کہ امام حسینؑ رسولؐ اللہ کے نواسے ہیں۔ کیا لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ جناب فاطمہؑ سلام اللہ علیہا نے آپ کو چکی پیس پیس کر پالا تھا۔

ہائے! دُنیا سب کچھ جانتی تھی بلکہ قتل کرنے والے تو اتنے واقف تھے کہ منہ پھیر پھیر کر روتے تھے۔ مگر نہ کوئی ایک قطرہ پانی کا دینے کو تیار تھا اور نہ کوئی امام حسینؑ کو

زندہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایسے مایوس وقت میں بھی ذرا امام کی انتہائی حجت ملاحظہ کیجئے کہ آپ نے دشمنوں سے فرمایا۔ مجھے کسی دوسرے ملک ہی میں جانے کی اجازت دے دو۔ مگر قاتلوں نے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ امام مظلوم کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔

کتاب توضیح عزا میں عبداللہ ابن مسعود سے منقول ہے کہ جس سال کربلا کا واقعہ ہوا، اس سال بہت سے تاجر عراق کی طرف گئے ہوئے تھے۔ واپس ہوئے تو بارہ محرم کو زمین کربلا پر اُترے۔ اس قافلے میں ایک زنِ عرب مع اپنی کنیزوں کے ہمراہ تھی۔ وہ عورت کہتی ہے کہ جب میں وہاں پہنچی تو میرے دل پر خود بخود ایک غم کی گھٹا چھانے لگی۔ جوں جوں دل کو سمجھا رہی تھی، غم بڑھتا جا رہا تھا۔

آخر میں نے دل بہلانے کے لئے ایک کنیز سے کہا کہ آؤ ذرا اس صحرا کی سیر کریں۔ میں اور وہ کنیز صحرا میں چلے گئے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک طرف سے کثرت سے پرندے اُڑتے ہوئے دیکھے۔ ہم اُسی طرف کو چل دیئے۔ جب ایک بلندی پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک صحرا لق و دق ہے اور وہاں کی زمین خون سے بھری ہوئی ہے۔ دل میں سوچا شاید یہاں کوئی بہت بڑا قافلہ اُترا ہے اور بہت سی بھیڑ بکریاں ذبح کی ہیں۔

مگر پرندوں کو دیکھا تو وہ بے قرار تھے اور زمین پر گر کر خاک میں لوٹ رہے تھے اور مٹی میں بھرے ہوئے تھے۔ ان میں ایسا شور برپا تھا جیسے نوحہ و بکا کر رہے ہوں۔ ایک طرف کچھ سفید پرندے پَر کھولے ہوئے کھڑے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید ان کا بادشاہ مر گیا ہے اور یہ اس پر اپنے پروں کا سایہ کئے ہوئے کھڑے ہیں۔

میں نے کنیز سے کہا کہ آگے چل کر ان کے بادشاہ کو دیکھیں کیسا ہے؟ جب ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ وہاں بہت سے آدمی کٹے پڑے ہیں اور کسی کے بدن پر سر نہیں ہے۔ سب کے جسموں پر بے شمار زخم ہیں۔ میں نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قاتل ان سے کمال عداوت رکھتے تھے کیونکہ انھوں نے ہر تیر کے زخم پر سو ۱۰۰ تیر کے زخم۔۔۔ ہر تلوار کے زخم پر سو ۱۰۰ تلوار کے زخم لگائے ہیں اور قتل کے بعد سر بھی تن

سے اُتار لئے ہیں۔

جب میں ان میں داخل ہوئی تو میں نے ایک لاش کو دیکھا کہ رُو بقبلہ خاک و خون میں غلطاں پڑی ہے۔ اور اس سے مشک و عنبر کی خوشبو آ رہی ہے۔ میں نے کہا قسم بخدا یہ شخص عبادتِ خدا میں قتل ہوا ہے۔ اِس لاش کے پہلو میں ایک چھوٹا سا بچہ پڑا تھا جس کا سر بھی دشمنوں نے اُتار لیا تھا۔ اس کے گلے میں تیر کا زخم تھا اور اِس زخم پر اس کا ننھا سا ہاتھ دھر رکھا تھا۔

میں اس چاند سے بچے کو دیکھ کر بیتاب ہو گئی اور میں نے کہا کہ ان کو قتل کرنے والے کتنے ظالم تھے کہ انھیں اس بچے پر بھی رحم نہ آیا۔ اس بچے کو دیکھ کر بے ساختہ رونا آ گیا، میں آنسوؤں سے رونے لگی اور کافی دیر تک وہاں کھڑی روتی رہی۔ میں رو رہی تھی کہ میرے دل میں ایک خیال اُبھرا کہ جب اس بچے کو دیکھ کر میری یہ حالت ہے تو اگر اس کے ماں باپ نے دیکھا ہوگا تو کیا حال ہوگا۔ ہائے! اس بے چاری کو کیا خبر تھی کہ یہ بچہ باپ ہی کے ہاتھوں پر پانی طلب کرتے ہوئے شہید کیا گیا ہے۔ وہ فرنگن کہتی ہے کہ میں اپنا سر کھول کر سجدہ میں گر گئی اور رو رو کر کہا۔ خداوندا! بحق عیسیٰؑ ابن مریم اس بچے کے قاتل کو نہ بخشنا۔

جو لاش رو بقبلہ پڑی تھی اس پر سفید پرندے اپنے پروں کا سایہ کر رہے تھے اور کمال محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے کہا ضرور یہ ان کشتوں کا سردار ہے اور مقربانِ خدا سے ہے اور مثل حضرت سلیمان ہے۔

کنیز کہنے لگی۔ حضرت سلیمان پیغمبر تھے۔ ان کشتوں کو ان سے نسبت نہ دیجئے۔ مجھے غصہ آ گیا اور بے ساختہ روتے ہوئے میرے مُنہ سے نکلا۔ تیرے سر پر خاک ہو۔ کیا دیکھتی نہیں کہ سلیمان پیغمبر کی صرف حالتِ حیات میں جانور تابع تھے لیکن ان کی تابعداری مرنے کے بعد بھی کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم یہ مقتول حضرت سلیمان سے افضل معلوم ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر اس کنیز کے ساتھ قافلے میں واپس آئی اور سارا واقعہ بیان کیا۔ پھر

بہت سے قافلے والوں کو ساتھ لے کر لاشوں کے پاس پہنچی۔ سب نے پرندوں کی حالت اور لاشوں سے خوشبو آتے ہوئے دیکھی۔ انھیں خواہش ہوئی کہ لاشوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیئے۔

مشورہ ہوا کہ یہاں کے قریہ سے زمینداروں کو بلا کر ان کا حال معلوم کرنا چاہیئے۔ جب زمیندار بلائے گئے تو ان کے بوڑھے سردار نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا۔ محرم کی دو تاریخ کو یہ لوگ یہاں آئے تھے۔ ان کی تعداد تو قلیل تھی مگر وجاہت اور شان و شوکت چہروں پر بہت تھی۔ ان کے سردار نے چار محرم کو ہمیں بلایا تھا۔ اس کی جبین مبارک سے آثار عزت و جلال آشکار تھے۔ اس کے خویش و برادر، مصاحب سب کے سب پرنور تھے۔

جب ہم آئے تو سب نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ سردار ہماری طرف متوجہ ہوا اور بڑی نرمی سے ہم سے فرمایا کہ ہم لوگ غریب الوطن ہیں۔ اگر تم لوگ یہ زمین ہمارے ہاتھ فروخت کر دو تو مہربانی ہوگی۔ ہم اس زمین پر ایک شہر بسائیں گے۔ ان کے ساتھی پاس کھڑے تھے۔ جب یہ لفظ سُنے تو بیساختہ سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے رونے کی آواز جو خیموں میں گئی تو خیموں سے بیبیوں کے رونے کی بلند آوازیں آنے لگیں۔ ان کی ایسی بے کسی دیکھ کر ہمارا بھی دل بھر آیا اور ہم بھی رونے لگے۔

ہم نے جواب میں عرض کی کہ زمین تو کیا شے ہے، ہماری جانیں بھی آپ کے لئے حاضر ہیں۔ آخر اس سردار نے ہمیں ساٹھ ہزار درہم قیمت کے دیئے اور خود اُٹھ کر چار حدیں قائم کیں۔ جب وہ حدیں قائم کر چکے تو فرمایا۔ خدا نے جب سے زمین کو پیدا کیا ہے تب ہی سے یہ سرزمین زیارت گاہ ہے اور اس کے زائرین کے لئے دنیا و آخرت میں خدا کی طرف سے امان ہے۔

غرض ہم نے ان سے وہ قیمت لے لی اور زمین ان کے ہاتھ فروخت کر دی اس کے بعد اس امیر نے ہم سے فرمایا کہ اب میں یہ زمین تمھیں دو شرطوں پر بخشتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اس پر جہاں ہماری قبریں بنیں گی ان پر زراعت نہ کرنا اور

دوسرے یہ کہ ہمارے زائروں کو تین دن مہمان رکھنا اور ان سے اچھا سلوک کرنا۔ ہم نے ان کی یہ دونوں شرطیں منظور کرلیں اور اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

اس سردار نے بچوں اور عورتوں کی سہولت کے لئے اپنے خیمے ترائی میں نصب کئے تھے۔ اس کے بعد یہاں کوفے سے فوجوں پر فوجیں آنا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ سارا میدان فوجوں سے بھر گیا۔ فوجوں نے وہ خیمے ترائی سے ہٹوا دیئے پھر ے محرم کا دن گزار کر شام کے وقت سے اس پر پانی بالکل بند کر دیا۔ ہر چند وہ سردار صلح کا طالب ہوا مگر اس کے جواب میں وہ فوجیں اس سے یزید کی بیعت ہی طلب کرتی تھیں۔

آخر ۱۰ محرم کو جنگ ٹھہر گئی اور اس کے اقربا، عزیز اور مصاحب بڑی بہادری کے ساتھ لڑ کر بھوکے پیاسے شہید ہو گئے۔ ان کا ہر ایک اکیلا لڑتا تھا لیکن یزید کی طرف سے فوجیں اس پر حملہ کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی ایک ایک شخص سینکڑوں کو قتل کر کے شہید ہوتا تھا۔ وہ سردار آتا تھا اور روتا ہوا لاش کو اُٹھا کر لے جاتا تھا۔

جب سب عزیز و رفقا شہید ہو چکے تو وہ سردار نحیف و نزار زمین گیر ہو گیا تھا۔ اس کے خیمے سے نکلتے وقت ایسا کہرام بچ رہا تھا۔ جیسے کسی گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔ وہ سردار ہاتھوں کو اُٹھا اُٹھا کر دعا کرتا تھا کہ اے خُدا! میرے بچوں اور عورتوں کو صبر عطا فرما۔

آخر وہ سردار بھی میدان میں آیا اور اس قدر شدید جنگ کی کہ آج تک دُنیا کے تختے پر کوئی ایسی بہادری سے نہ لڑا ہوگا۔ وہ خود بھی اتنا زخمی ہوا کہ تمام بدن چھلنی ہو گیا تھا۔ جب وہ سردار گھوڑے سے گرا تو دشمن اس پر ٹوٹ پڑے اور شہید کر دیا۔ اس وقت زمین کربلا میں زلزلہ آیا اور سُرخ و سیاہ آندھیاں چلنے لگیں۔ ہر طرف شور مچا **اَلاَ قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا۔ اَلاَ ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا** ۔ یہ کہہ کر اُس قریے کا سردار خاموش ہو گیا اور چیخیں مار مار کر رونے لگا۔

جب اس فرنگن اور اس کے قافلے والوں نے حسینؑ کا نام سُنا تو کہنے لگے کہ حسینؑ تو یثرب کے رہنے والے اور فرزندِ رسولُ الثقلین ہیں۔ وہ گھبرا کر کہنے لگے۔ ارے کیا غضب ہوا کہ ظالموں نے ان کو شہید کر دیا۔ وہ سب لاش کے گرداگرد آ کر جمع

ہو گئے اور بہت روئے۔ اس فرنگن کا یہ حال تھا کہ وہ دوڑ کر لاشِ اقدس پر گر پڑی اور رو کر کہا۔ اے میرے آقا! گواہ رہنا اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ میں ایمان لاتی ہوں۔ آپ روزِ محشر میرے اسلام لانے کے گواہ رہنا۔۔ وہ روتی جاتی تھی اور لاش کا خون اپنے منہ اور چہرہ پر ملتی جاتی تھی کہ میں آپ کی مادرِ گرامی جناب فاطمۃ الزہرا کو محشر میں یہ خون بھرا چہرہ اپنے ایمان اور محبت کی گواہی کے لئے دکھاؤں گی۔

اس کے بعد قافلے والوں نے اُن زمینداروں سے کہا کہ اب لاشوں کو دفن کر دو۔ اُنھوں نے کہا کہ لشکر کے خوف سے ابھی ہم اُنھیں دفن نہیں کر سکتے ہیں۔ ذرا لشکر دُور نکل جائے تو دفن کریں گے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب یہ لوگ دفن کے لئے آمادہ ہوئے تو اُنھوں نے کوفے کی جانب سے کسی شخص کو آتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو وہ ڈرے لیکن جب وہ شخص قریب آیا تو دیکھا کہ جناب سید سجاد علیہ السلام تھے جو معجزے سے تشریف لائے تھے۔

وہ لوگ ایک ایک لاش کو لاتے تھے اور سید سجادؑ اس کا نام بتاتے جاتے تھے۔ کسی نے آ کر بیان کیا کہ ایک جوان قوی دریا کے قریب کٹا پڑا ہے۔ اور اس کے ہاتھ شانوں سے جدا ہیں۔ امام اُٹھے روتے ہوئے وہاں تشریف لے گئے اور جب قریب پہنچے تو چا کہہ کر سلام کیا اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا عَمَّاهُ ۔ پھر ان کو وہیں دفن کر دیا۔

چونکہ جلدی تھی اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں فوج واپس نہ آ جائے، اس لئے سب لاشوں کے لئے ایک بڑا گڑھا کھودا گیا اور اس میں سب شہیدوں کی لاشیں دفن کیں۔ حضرت علی اکبرؑ کو امام حسینؑ کے پائیں پا دفن کیا۔ حبیب ابن مظاہر اُن کی قوم سے تھے۔ اس لئے اُن کی قبر علیحدہ بنائی۔ امام حسینؑ کا لاشہ چونکہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا گیا تھا اِس لئے اُن کا گوشت جگہ جگہ منتشر تھا اور کتنا ہی گوشت گھوڑوں کی ٹاپوں سے چمٹ کر چلا گیا تھا۔ جو گوشت منتشر تھا وہ ان لوگوں نے جمع کیا اور لاش کو ایک گٹھری میں باندھا۔ صاحبِ "توضیح عزا" لکھتے ہیں کہ ان سعادتمندوں نے متفرق اعضاء کو جمع کیا اور اُن پر نماز پڑھی۔ جب ان کو دفن کرنے کے لئے قبر کھود

نے لگے تو تھوڑی سی مٹی ہٹائی تھی کہ ایک بنی بنائی قبر نمودار ہوئی اور اس میں سے ایک تختی نکلی جس پر لکھا تھا۔ هٰذَا قَبْرُ الْحُسَيْنِ الذَّبِيحِ الْعَطْشَانِ -- یہ قبر اس حسینؑ کی ہے جو پیاسا ذبح کیا گیا۔ قبر خوشبو سے معطر تھی۔

بعض روایات یہ ہیں کہ جب امام حسینؑ کے اعضاء جو کسی چیز میں لپیٹے گئے تھے، دفن کرنے لگے تو قبر کے اندر سے دو ہاتھ ظاہر ہوئے اور جناب فاطمہؑ کی آواز آئی۔ لاؤ میرے بچے کو مجھے دے دو۔

آہ! امام حسینؑ کا جسم تو اس طرح دفن ہوا اور سر کا حال اس سے بھی زیادہ دردانگیز ہے۔ کبھی خولی کے تنور میں رہا۔ کبھی ابن زیاد کے تخت کے نیچے رکھا گیا۔ کبھی یزید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ کبھی دروازے پر لٹکایا گیا۔ کبھی کرے کے درخت میں لٹکا رہا۔

صاحب توضیح عزا لکھتے ہیں کہ راوی نے نقل کیا ہے کہ جن ایام میں اسیران کربلا کو شام میں پھرایا جا رہا تھا، ان ہی دنوں مجھے وہاں کا سفر درپیش ہوا۔ راستے میں ایک جگہ میں نے دیکھا کہ درخت کے نیچے بہت سے بچے جمع ہیں اور ہر ایک بچہ کہ شیطان کی اولاد سے تھا، اس درخت پر پتھر مار رہا تھا۔

جب میں اس درخت کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک سر جو نور و ضیا میں مثل آفتاب کے ہے، درخت میں لٹکا ہوا ہے اور وہ بچے اس پر پتھر مار رہے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کس بزرگ کا سر ہے اور اس سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس نے سر پیٹ لیا اور رو رو کر کہا یہ حسینؑ ابن علی کا سر ہے۔ ہائے یہ سنتا تھا کہ میں تڑپ گیا اور اتنا رویا کہ غش آ گیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

☆☆☆

سولھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ○ (صلوٰۃ)

(اے رسولؐ!) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں تم سے تبلیغ رسالت کا اپنے اقربا کی محبت کے سوا اور کوئی صلہ نہیں مانگتا ہوں۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر شخص اپنے معیار کے مطابق اُجرت مانگتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی ایک کام کی اُجرت پانچ روپیہ مانگتا ہے۔ دوسرا اسی کام کو تین روپے میں کرنے کو تیار ہے اور تیسرے کو آپ سات روپے دے رہے ہیں مگر وہ دس روپے سے کم میں آمادہ نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جس کا معیار بلند ہو وہ اُجرت بھی زیادہ لے گا۔

رسولؐ اللہ نے تبلیغِ رسالت کا اجر طلب فرمایا ہے۔ رسالت کے معیار میں حضورؐ سب سے بلند ہیں اور تمام دینوں میں اسلام سب سے بلند ہے جیسا کہ خدا نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام۔ کلام کا طریقہ بتا رہا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا اور کوئی دین نہیں ہے۔ جب تبلیغ اور تبلیغ کا کرنے والا دونوں بلند ہیں تو ان کا اجر بھی بلند ہونا چاہیے۔

لیکن اجر ہے محبت۔ جو دیکھنے میں بہت آسان ہے۔ یعنی کرنا کچھ نہیں پڑتا۔ بس محبت کو دل میں رکھ لیا اور فارغ ہو گئے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ اتنے معیاری کام کے لئے اتنی سستی اُجرت کیسے مانگی گئی ہے۔

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ صاحبِ معرفت لوگوں سے پوچھیے کہ محبت آسان ہے یا مشکل۔ وہ آپ کو محبت کے درجے بتائیں گے۔ ایک محبت ہوتی ہے لالچ کی۔ جیسے گاہک اور دکاندار کی محبت۔ دکاندار اپنے گاہک سے بشاشت سے پیش آتا ہے۔ آیئے! جناب کو کیا چیز چاہیے۔ اور گاہک جو چیز کہتا ہے اس کے اشارے پر لا کر دکھاتا ہے، اخلاق سے بولتا ہے لیکن اگر گاہک اس کی قیمت کم لگا دے تو فوراً رویہ بدل جاتا ہے۔"

چل چل آگے بڑھ۔ ہمارے پاس تمہارے مطلب کی چیز نہیں ہے۔" کیوں سامعین ایسا ہوتا ہے کہ نہیں؟

دوسری محبت ہوتی ہے ساتھیوں کی۔ گاڑی میں مسافر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سہولتیں پہنچاتے ہیں۔ پیار سے بولتے ہیں، ہنستے ہیں، ملتے ہیں، جلتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کھلاتے پلاتے تک ہیں۔ مگر جب اسٹیشن آجاتا ہے تو ہاتھ ملا کر کہتے ہیں۔ "اچھا، خدا حافظ"۔ یعنی محبت رخصت ہوگئی۔

تیسری محبت ہوتی ہے منہ دیکھے کی۔ ایک شخص کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا۔ ہنس کر آگے بڑھے۔ آیئے! شاہ صاحب آیئے! مزاج تو بخیر ہیں۔ کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے، میں تو آپ ہی کو یاد کر رہا تھا اور یہ بات ہے اور وہ بات ہے۔ لیکن جب شاہ صاحب چلے گئے تو منہ بنا کر بولے (آپ بھی منہ بنا کر ادا کیجئے) پتہ نہیں یہ لوگ کہاں سے آ ٹپکتے ہیں۔ سارے پروگرام کا ناس پٹ گیا۔ فلاں جگہ جانا ضروری تھا مگر اب وقت ہی ختم ہو گیا۔

چوتھی محبت ہوتی ہے دباؤ کی۔ جس کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ وہ اپنا حکم منوا لیتا ہے۔ افسری کے زمانے میں ہر شخص مطیع ہوتا ہے، عزت کرتا ہے اور لحاظ کرتا ہے لیکن جیسے ہی افسر ریٹائر ہو جائے یا عہدے سے برطرف کر دیا جائے تو سب اس کی اطاعت سے روگردانی کر لیتے ہیں۔

پانچویں محبت ہوتی ہے صفات کی جیسے شاگرد اُستاد سے محبت کرتے ہیں۔ مرید پیر سے محبت کرتے ہیں۔ جو چیز خوبصورت اور بھلی معلوم ہوتی ہے اس کی طرف بھی دل کھنچ جاتا ہے۔ لیکن نہ تو ایک اُستاد تمام لوگوں کا اُستاد ہوتا ہے اور نہ ایک پیر کو سب لوگ پیر مانتے ہیں۔ اسی طرح ایک چیز کسی کو اچھی معلوم ہوتی ہے مگر دوسرے کو بُری لگتی ہے۔

چھٹی محبت ہوتی ہے ماں کی۔ یہ بے لوث محبت ہوتی ہے۔ ماں بچے سے نہ کسی لالچ کی وجہ سے محبت کرتی ہے اور نہ کسی دباؤ اور خوف سے اس پر نثار ہوتی ہے۔ بچہ اگر ماں پر پیشاب بھی کر دے تو ماں کو اس سے نفرت نہ ہوگی اور بچے کو اپنے سے جدا نہ کرے

گی بلکہ ماں خود گیلے میں لیٹ جائے گی اور بچے کو سوکھے میں لٹائے گی۔ ماں ہر وقت اس جستجو میں رہے گی کہ چاہے مجھے تکلیف پہنچے یا دکھ اُٹھاؤں مگر بچہ خوش رہے۔ وہ بچے کو خوش رکھنے کے لئے ہر قسم کے کام پر آمادہ ہوگی۔

(سنبھل کر ذرا چست ہو کر بولئے) معلوم ہوا جتنی اطاعت دباؤ لالچ نہیں کرا سکتا، وہ محبت کرا سکتی ہے۔ دباؤ سے آدمی مستقل مطیع نہیں بنایا جاسکتا اور نہ لالچ کے ذریعے ہمیشہ کے لئے آدمی خریدا جاسکتا ہے۔ یہ تو محبت ہی ہے کہ ہمہ وقت آدمی مطیع ہے چاہے اطاعت کرانے والے سامنے ہوں یا غائب ہوں۔ جب تک اس کے دل میں محبت ہے، سفر حضر، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، تنہا ہو یا لوگوں میں ہو، خشکی میں ہو یا تری میں ہو، میدان میں ہو یا پہاڑ پر ہو، سمندر میں ہو یا ہوا پر ہو۔ وہ ہر حال اور ہر مقام پر اطاعت کرتا رہے گا۔

کیا آپ روزانہ نماز میں سورۃ الحمد نہیں پڑھتے اور یہ نہیں کہتے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ اے خدا ہمیں سیدھی راہ پر قائم رکھ جو سیدھی راہ تیرے ان بندوں کی ہے جن پر تو نے انعام نازل فرمایا ہے۔ کسی کی راہ پر چلنا یا چلنے کی خواہش رکھنا، اس کی اطاعت نہیں تو اور کیا ہے۔ (صلوٰۃ)

خدا نے تین راہیں بتائی ہیں۔ ایک نعمت والوں کی راہ جو سیدھی ہے دوسری مغضوب لوگوں کی راہ اور تیسری گمراہ لوگوں کی راہ جن سے بچنے کے لئے دعا کی گئی ہے۔ خدا نے اپنی نعمت کے متعلق ایک اور آیت میں کہا ہے: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ آج تمہارے لئے میں نے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو ختم کر دیا اور تمہارے دین اسلام سے راضی ہو گیا۔ "اَلْيَوْم" کا لفظ زمانے کی سرحد بتا رہا ہے کہ جو کچھ آج ہوا ہے وہ اس سے پہلے نہ تھا۔ آج تمہارے دین کو مکمل کیا۔ یعنی آج سے پہلے دین تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ جو دین حضرت آدمؑ لائے تھے اس کی پرورش ہوتے ہوتے یہ زمانہ آیا کہ آج وہ دین مکمل ہو گیا۔

اب اگر دین سے کوئی چیز نکال دی جائے تو دین میں نقص آجائے گا اور اگر کوئی چیز بڑھادی جائے تو وہ دین کے احکام سے زائد ہوگی۔ لہٰذا جو بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد آئے گا وہ دین کی حفاظت اور نگرانی کرسکتا ہے مگر دین کے احکام میں تبدیلی کا مجاز نہ ہوگا۔

اس کے بعد اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔۔ یعنی تم پر اپنی نعمت کو ختم کردیا۔ اب تک خدا کی طرف سے جو نعمتیں آرہی تھیں، آج کی نعمت ان میں سے آخری نعمت ہے اور کوئی نعمت باقی نہیں رہی جو آئندہ کسی کو دی جاسکے۔ پھر ارشاد ہے: وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ۔ اور تمہارے دینِ اسلام سے راضی ہوگیا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک جو اسلام تھا وہ تکمیل کے مراحل میں تھا۔ اس لئے وہ میری مرضی کے مطابق نہ تھا۔ آج دین مکمل ہونے سے میری مرضی کے مطابق ہوگیا ہے۔ لہٰذا اب جو اس پچھلے نامکمل دین پر باقی رہے گا، اس سے خدا راضی نہ ہوگا۔

اس اَلْیَوْمَ پر دین کا دارومدار ہے۔ اگر اَلْیَوْمَ سے پہلے والے دین پر باقی رہا تو نامکمل دین کی تابع ہوگی اور اگر اَلْیَوْمَ کے بعد دین کے احکام بڑھادیئے تو وہ نہ جزو اسلام ہوں گے اور نہ نعمتِ خدا بلکہ زائد از اسلام ہوں گے جن کو اسلام اور خدا کی نعمت ہونے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر دین کا کوئی قانون گھٹا دیا تو گھٹانے والا مجرم ہوگا لہٰذا ضروری ہوا کہ اَلْیَوْمَ کی تاریخ معلوم ہونی چاہیئے۔

چونکہ اس دن دین کی تکمیل ہوئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خوشی کا دن ہے اور غم کا دن نہیں ہوسکتا۔ جب ہم دیکھتے ہیں تو مسلمانوں میں خوشی کے صرف دو دن نظر آتے ہیں۔ ایک عید قرباں اور دوسرا عید الفطر کا دن۔

عید قرباں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے شروع ہوئی ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ اگر اَلْیَوْمَ سے مراد عید قرباں ہے تو لازم آتا ہے کہ دین حضرت ابراہیمؑ کے زمانے مکمل ہوگیا تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ دین تو حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں مکمل ہوا ہے۔

اگر اَلْیَوْم سے مراد عید الفطر لے لی جائے تو عید الفطر اس زمانے میں بھی تھی جب حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ بچے تھے اور رسولؐ اللہ عیدگاہ پر ان کے لئے ناقہ بنے تھے۔ دین کو مکمل مان لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ اس کے بعد نئے احکام اور وحی نازل نہیں ہونی چاہیئے حالانکہ قرآن اس کے بہت بعد تک نازل ہوتا رہا۔

دین کی تکمیل سے یہ بات ظاہر ہے کہ واقعہ رسولؐ اللہ کے آخری زمانے کا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب رسولؐ اللہ آخری حج کر کے مدینے واپس ہوئے تو راستے میں غدیر کے مقام پر جبرائیلؑ نازل ہوئے، عرض کیا۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ **یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْتَ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ** ؕ اے رسولؐ! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے رسالت ہی نہیں پہنچائی۔

رسولؐ اللہ وہیں ٹھہر گئے اور فرمایا۔ جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں ان کا انتظار کرو اور جو آگے بڑھ گئے ہیں ان کو واپس بلا لیا جائے۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو اونٹ کے پالان کا منبر بنایا اور حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر اس پر بلند کیا اور فرمایا۔ کیا میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ سب نے کہا۔ بے شک آپ ہم سب سے افضل ہیں۔ پھر فرمایا **مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ** جس کا میں مولا ہوں، اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔

تمام مجمع پکار اٹھا "مبارک ہو، مُبارک ہو"۔ ایک طرف سے بلند آواز آئی **بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ**۔ اے ابو طالب کے بیٹے علیؑ! تمہیں مبارک ہو کہ تم مومنین کے مولا ہو گئے۔

سامعین! اگر حضرت ابو طالب معاذ اللہ کافر ہوتے تو حضرت علیؑ کو مولا ہوتے وقت ابو طالب سے نسبت دینا بُرا لگتا کیونکہ بہادر کو بزدل کا بیٹا کہہ کر شاباش دینا یا عالم کو جاہل کا بیٹا کہہ کر داد دینا بیہودگی کہلاتا ہے۔ حضرت علیؑ کو مولا ہوتے وقت ابو طالب کا بیٹا کہہ کر مبارک دینا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابو طالب مسلمان تھے۔ ہاں البتہ یہ کہنا کہ "تم مومنین کے مولا ہو گئے ہو۔" اس سے کچھ دور کا مطلب نکل سکتا ہے کہ کہنے والے

نے "مومنین" کی شرط لگا کر اپنے آپ کو بچایا ہو کہ ہم تو مومن نہیں ہیں، اس لئے آپ مولا ہوں گے تو مومنین کے ہوں گے ہمارے نہیں ہو سکتے۔

آیت کا دوسرا ٹکڑا اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ہے۔ یعنی آج میں نے تم لوگوں پر اپنی نعمت تمام کردی۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی نعمت ہے جو رسولؐ اللہ کو ملی ہے اور کسی دوسرے کو نہیں ملی۔ کیا وہ نعمت سلطنت اور حکومت ہے، لیکن سلطنت اور حکومت تو اب بھی دوسروں کو مل رہی ہیں۔ کیا وہ نعمت اولاد ہے، لیکن اولاد بھی اوروں کے یہاں رسولؐ اللہ سے زیادہ ہے۔ کیا یہ نعمت مال وزر ہے۔ لیکن زرودولت تو اب بھی دنیا والوں میں تقسیم ہو رہا ہے۔ پھر یہ نعمت کیا ہے؟

کیا یہ نعمت رسالت اور قرآن تو نہیں۔ کیونکہ اب نہ کوئی رسولؐ آئے گا اور نہ کسی پر قرآن نازل ہوگا۔ یہی وہ نعمتیں ہیں جو رسولؐ اللہ کو دے کر ختم کردی گئی ہیں۔ لیکن آیت میں تمام صیغے جمع کے آئے ہیں۔ لَكُمْ اور عَلَيْكُمْ جمع کے صیغے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نعمتیں صرف رسولؐ اللہ پر ہی ختم نہیں ہوئیں بلکہ ایک گروہ ہے جس پر خدا نے اپنی نعمتیں ختم کردی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کئے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا جس طرح کہ اس نے ان سے پہلے والے لوگوں کو خلیفہ بنایا ہے۔ معلوم ہوا کہ رسالت تو رسولؐ اللہ پر ختم ہو جائے گی مگر اللہ اس کے بعد خلیفہ بنائے گا۔ اور جن لوگوں کو وہ خلیفہ بنائے گا ان سے خدا نے وعدہ بھی کرلیا ہے۔

اب اگر خدا انھیں خلیفہ نہ بنائے تو وعدہ خلافی ہوتی ہے اور اگر دین مکمل ہونے کے بعد بنائے تو خلافت اندرونِ اسلام نہ ہوگی بلکہ زائد بر اسلام ہوگی اور خدا کی نعمت بھی نہ ہوگی۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یا تو کوئی خلیفہ اسلام میں ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو اس آیت سے پہلے اس کا تقرر ہونا ضروری ہے۔

رسولؐ اللہ کے وصال کے بعد تو بڑی بات ہے اگر اس آیت کے بعد بھی خلافت

مرتب کی جائے تو اس کو اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو گا بلکہ وہ زائد بر اسلام ہو گی اور اس کا چھوڑنا ضروری ہو گا اور اس کا ماننا بدعت ہو جائے گا۔

اگر کوئی ایسا اسلام ہے جس میں اس آیت کے بعد خلافت کا تقرر ہوا ہو تو وہ اسلام خدا کو پسند نہ ہو گا۔ کیونکہ اس آیت کے آنے پر خدا اسلام سے راضی ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس آیت سے پہلے جن لوگوں کو خلافت کے عہدے مل چکے ہیں، وہی رسولؐ اللہ کے گروہ میں شامل ہیں جن پر نعمتیں ختم ہو چکی ہیں اور ان ہی کی خلافت جزو اسلام ہے۔ اگر کوئی انھیں خلیفہ نہیں مانے گا تو اس کا اسلام نامکمل ہو گا۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ خلافت کے عہدہ پر تقرر کرنے کا صرف اور صرف مجھے اختیار ہے اور کوئی دوسرا اس کا مجاز نہیں۔ ارشاد ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ بے تحقیق کہ میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ جَاعِلٌ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اگر خدا یہ کہتا کہ "میں خلیفہ بناؤں گا یا بناتا ہوں یا میں نے خلیفہ بنایا" تو اس سے حالت میں تبدیلی آسکتی تھی۔ یعنی اگر بنائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی نہیں بنایا ہے اور اگر کہتا کہ بنایا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ آئندہ نہیں بنائے گا۔ مگر یہاں تو ارشاد ہے کہ خلیفہ کو تقرر کرنے والا میں ہوں، جس کے معنی یہ ہیں کہ آج بھی وہی تقرر کرے گا۔ پہلے بھی اسی نے تقرر کیا تھا اور آئندہ بھی وہی تقرر کرے گا۔ (صلواۃ)

ارشاد ہے: وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوۃِ وَکَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ۝ اور ہم نے ان لوگوں کو امام مقرر کیا ہے، وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان پر عمل خیر، نماز اور زکوٰۃ کے لئے وحی کی ہے اور وہ سب ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔

جَعَلْنَا ماضی کا صیغہ ہے یعنی خدا نے امام مقرر کر دیے ہیں۔ اب آئندہ امام مقرر نہیں ہوں گے۔ پھر اَوْحَیْنَا کا لفظ ہے کہ ہم نے ان پر وحی کی ہے لہٰذا امام کی پہچان یہ بھی ہے کہ اس پر وحی آئی ہو۔ آئے گی کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وحی آچکی ہے۔

جس طرح رسولؐ اللہ کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح رسولؐ اللہ

کے جانشین پر بھی ایمان لانا ضروری ہے ورنہ خدا کا بنایا ہوا عہدۂ خلافت بیکار ہو گا۔ اور اگر خدا کے بنائے ہوئے کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ مانے گا تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

اب اگر خلافت کا عہدہ اقربا کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس ہو تو اقربا اور خلیفہ کے درمیان تضاد اور فساد لازم آئے گا۔ یعنی لوگ یا تو اقربا ہی کی اطاعت کرسکیں گے یا خلیفہ کے حکم کی تعمیل کر پائیں گے۔ خدا کی ذات اس قسم کی خامیوں سے پاک ہے کہ وہ دو متضاد حاکم بنا دے لہٰذا چار و ناچار ماننا ہی پڑے گا کہ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ ۔ جس کا میں مولا ہوں، اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔ رسولؐ اللہ کے بعد حضرت علیؑ ہی کو مولا ماننا پڑے گا۔

معلوم ہوا خدا نے اقربا اور خلیفہ انہی شخصوں کو بنایا ہے اور تضاد کی راہ مسدود کر دی ہے۔ لیکن اگر لوگ خود ہی سیدھی راہ سے فائدہ نہ اُٹھانا چاہیں تو یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔ تب ہی تو اسلام میں تفرقہ پر تفرقہ پڑتا چلا گیا یہاں تک کہ ۷۳ فرقے ہو گئے۔ اگر دنیا اقربا کی خلافت تسلیم کر لیتی تو آج سب مسلمان ایک پلیٹ فارم پر ہوتے اور اسلام مضبوط ہوتا۔ اس تفرقہ بازی ہی نے تو اسلام کو کمزور کیا ہے۔

یزید کے زمانے میں یہی تو صورت تھی کہ اگر خلیفہ کی اطاعت کریں تو اقربا کے دشمن بنتے ہیں اور اگر اقربا سے محبت کریں تو خلیفہ کا عتاب ہوتا ہے۔ اب بتائیے! یہ کیسے ممکن ہے کہ خلیفہ کی اطاعت بھی کریں اور اقربا سے محبت بھی رہے۔ اقربا سے محبت کوئی معمولی چیز تو ہے نہیں کہ اگر نہ کریں گے تو گنہگار رہوں گے۔ یہاں تو صورت یہ ہے کہ تبلیغ کا معاوضہ ہی ادا نہ ہو گا اور جب معاوضہ نہ دیا تو اعمال کا ثواب بھی نہ ملے گا۔ جن لوگوں نے یزید کی اطاعت اختیار کی اور اقربا کے دشمن بنے۔ میرے خیال میں تو انھیں کوئی بھی مسلمان حق پر نہ کہے گا۔

کیونکہ جن لوگوں پر اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ خدا کی نعمتیں ختم ہوئی ہوں جو سورۃ الحمد میں اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے مفہوم ہوں اور جن کی محبت کو تبلیغ رسالت کا معاوضہ دیا گیا ہو، ان کے ستانے والے اگر مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ نہ ہوں گے تو اور کون

ہوں گے؟

آیئے! ذرا جائزہ لیں کہ اقربا سے محبت کرنے والے کون ہیں۔ اسلام کے تمام فرقے رسولؐ اللہ کو مانتے ہیں۔ ان کی پیدائش کے دن خوشی میں میلاد کرتے ہیں۔ ان کے معراج میں جانے کی تاریخ کو خوشیاں مناتے ہیں لیکن ان کی وفات کے دن کوئی تعزیت کی مجلس نہیں کرتے۔ جس طرح خوشی میں شریک ہوتے ہیں اسی طرح غمی میں بھی تو شریک ہونا چاہیئے۔ بلکہ زیادہ یادگار تو وفات کی ہونی چاہیئے کہ آج ہمارے پیارے رسولؐ دُنیا سے اُٹھ گئے۔ یہ حق جو ادا کرتا ہے وہ صرف آپ کا فرقہ ہے۔ صرف آپ کا فرقہ ایسا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ہر معصوم کی پیدائش پر میلاد کرتا ہے اور ان کی وفات پر مجلسِ عزا کرتا ہے۔ اِسی لئے رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا۔ مَنْ بَكٰى عَلَى الْحُسَيْنِ اَوْ اَبْكٰى اَوْ تَبَاكٰى وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ "جو حسینؑ پر روئے یا رُلائے یا رونے کی صورت بنائے اُس پر جنت واجب ہے۔" رسولؐ اللہ نے محبت دیکھ کر ہی رونے والوں کو جنت کا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ ورنہ رونے سے کون کسی کو جنت میں بھیجتا ہے۔ یہ تو آلِ محمدؐ ہی کی محبت ہے جس میں رونا جنت میں لے جائے گا۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: مَنْ مَاتَ عَلٰى حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِيْدًا۔ جو شخص محبت آلِ محمدؐ میں مرا وہ شہید مرا۔ شہید کے لئے یہ ہے کہ وہ ضرور جنت میں جائے گا لہٰذا آلِ محمدؐ سے محبت رکھنے والا ضرور جنت میں جائے گا۔

رسولؐ اللہ کی ایک اور حدیث ہے: مَنْ مَاتَ عَلٰى بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ كَافِرًا ۔ جو شخص بغضِ آلِ محمد میں مرا وہ کافر مرا۔ یعنی بغضِ آلِ محمد خدا کو اس قدر ناگوار ہے کہ اسے کافر قرار دے دیا۔ اور کافر دوزخ کا ایندھن ہے لہٰذا آلِ محمد سے بغض رکھنے والا کبھی جنت میں نہیں جاسکے گا۔

سامعین! جس طرح محبت کی حد یہ ہے کہ محبوب کو مرنے کے بعد بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دشمنی کی بھی حد یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی دشمنوں کا ظلم سے پیٹ نہیں

بھرتا۔ تاریخیں بتاتی ہیں کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد لوگ انھیں لوٹنے کے لئے ان کی لاش پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے پاجامہ لوٹا، کوئی جوتا اُتار کر لے گیا۔ کسی نے قمیض کھینچی، کوئی امام کی اُنگلی انگوٹھی کے لئے کاٹ کر لے گیا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے وحشیانہ ظلم کہیں نہیں ملیں گے کہ مرنے کے بعد مقتولین کے سر اُتارے گئے ہوں، لاشے پامال کئے گئے ہوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو تشہیر کیا گیا ہو۔

جب کربلا سے یزید کی فوج کو کوچ کا حکم ہوا۔ انھوں نے امام حسینؑ کی عورتوں اور بچوں کو لے جانے کے لئے بے محمل و بے کجاوہ اونٹ بھیجے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا، ان کے ہاتھ پشت کی طرف کر کے باندھے اور اونٹوں پر بٹھا کر لے چلے۔ ابن سعد نے چھانٹ کر بڑے ظالم لوگ بھیجے تھے یہ آدمی اہلِ حرم کے اونٹوں کو اس طرف سے لائے جہاں ان کے عزیزوں کے لاشے، سر کٹے ہوئے اور بے گور و کفن پڑے تھے۔ جب عورتوں نے یہ حال دیکھا تو چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ رونے کا اتنا شور و غل مچا کر یزید کی فوج کے آدمی بھاگ کر اُدھر دیکھنے کے لئے آگئے اور جمع ہو گئے۔

"قرہ ابن قیس تمیمی بیان کرتا ہے کہ میں بھی اپنا گھوڑا بڑھا کر ان عورتوں کے پاس آگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اتنی معزز عورتیں تھیں کہ اس سے پہلے میں نے ایسی معزز عورتیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ خدا کی قسم وہ بہت ہی نورانی بیبیاں تھیں۔ ہائے بیبیاں اپنے اپنے عزیزوں کی لاش سے لپٹی ہوئی رو رہی تھیں اور لوگ ان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ بُرا حال جناب زینبؑ کا تھا، وہ اپنے بھائی کی لاش پر بے قراری کے عالم میں وامحمداہ! وامحمداہ کہہ کر آہ و نالہ کر رہی تھیں اور حال یہ تھا کہ لوگ کھڑے ہوئے ان کو دیکھ بھی رہے تھے اور ان کے دلخراش نالوں کے ساتھ خود بھی رو رہے تھے۔

ہر لاشے پر کوئی نہ کوئی بی بی رو رہی تھی مگر دو بچوں کی لاشیں الگ پڑی تھیں اور ان پر کوئی عورت نہیں رو رہی تھی۔ کسی نے پوچھا۔ کیا ان بچوں کی ماں مرگئی ہے؟ یہ فقرہ جناب زینبؑ نے سن لیا۔ ہائے روتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ فرمایا نہیں۔ ان بچوں کی ماں نہیں مری ہے۔ ارے ان بچوں کی ماں میں ہوں۔ پھر لاشوں کی طرف رُخ کر کے کہا۔ ارے

میرے لاڈلو، عونؑ و محمدؑ! میں تمھیں نہیں روؤں گی۔ میں نے تمھیں حسینؑ پر قربان کر دیا ہے۔ میں حسینؑ کی لاش پر رو رہی ہوں۔

جب گریہ و ماتم کا شور کسی طرح کم نہ ہوا تو ظالموں نے مار مار کر عورتوں اور بچوں کو لاشوں سے جدا کیا اور انھیں اونٹوں پر بٹھا کر لے چلے۔ انھوں نے راستے میں اونٹوں کو اتنا تیز چلایا کہ اگر کوئی بچہ اونٹ سے گر جاتا تھا تو ظالم اسے اٹھاتے نہ تھے بلکہ اونٹوں کو ہنکائے ہی جاتے تھے۔۔۔ ہائے جناب زینبؑ کیا کرتیں۔ خود کو اونٹ سے گرا دیتی تھیں۔ ظالموں کو مجبوراً اونٹ روکنے پڑتے تھے اور بچے کو بٹھایا جاتا تھا۔

اسی طرح اسیروں کا یہ قافلہ باحالِ تباہ کوفے لایا گیا۔ کوفے کا گورنر ابنِ زیاد تھا۔ اسے قافلہ پہنچنے کی اطلاع دی گئی۔ اس نے حکم دیا کہ جب تک دربار کو سجا نہ لیا جائے اُس وقت تک قیدیوں کو شہر سے باہر ہی روکے رکھو۔ کئی گھنٹے قیدی شہر سے باہر رُکے رہے۔ دربار سجایا گیا۔ سفارتی نمائندوں، حکومت کے بڑے بڑے افسروں اور شہر کے امیروں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں بچھائی گئیں تھیں اور ان کے سامنے ابنِ زیاد کا تخت لگایا گیا تھا۔ جب دربار پوری طرح آراستہ ہوگیا تو خادم نے اطلاع دی۔ ابنِ زیاد آ کر دربار میں اپنے تخت پر بیٹھا۔ لوگ آتے جاتے تھے اور اسے مبارکباد دے کر بیٹھتے جاتے تھے۔ جب دربار کھچا کھچ بھر گیا تو قیدیوں کو دربار میں لانے کا حکم ہوا۔

مومنین! یہ وہی دارالامارہ تھا جہاں حضرت علیؑ اپنی خلافت کے زمانہ میں رہتے تھے اور جناب زینبؑ اس کے گوشے گوشے سے واقف تھیں۔ ایک وقت تھا کہ وہ اس قصر میں شہزادی کی حیثیت سے رہتی تھیں لیکن ہائے افسوس آج وہ اپنے کنبے کی عورتوں کے ساتھ قیدی بنا کر لائی جا رہی تھیں۔ جناب زینبؑ کا اس وقت دل بھر آیا قریب تھا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ مگر انھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ سرکش حاکم کے سامنے بزدلی کے ساتھ روتی ہوئی جائیں۔ وہ باوقار طریقے سے دربار میں وارد ہوئیں۔

تاریخیں لکھتی ہیں کہ اس وقت جناب زینبؑ بنتِ فاطمہؑ کے جسم پر سفر سے میلا، ایک بوسیدہ اور معمولی سا لباس تھا مگر وہ اس شان اور جلال سے محل میں داخل ہوئیں کہ

کنیزیں آپ کو گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔ جناب زینبؑ نے ابن زیاد کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر ہی زمین پر بیٹھ گئیں۔ جب ابن زیاد نے دیکھا کہ یہ عورت تو مجھ سے اجازت لئے بغیر ہی بیٹھ گئی ہے تو دریافت کرنے کے لئے اُٹھا اور رعب سے کہا کہ تم کون ہو؟ جناب زینبؑ نے اس ذلیل شخص کو جواب دینا بھی پسند نہ کیا اور خاموش بیٹھی رہیں۔ اس نے پھر اکڑتے ہوئے پوچھا: تم کون ہو۔ جناب زینبؑ خاموشی اختیار کئے رہیں۔ اس نے تیسری تیز آواز میں پوچھا: تم کون ہو، بتاتی کیوں نہیں؟ جناب فضہ ایک دم کھڑی ہوئیں اور کہا۔ یہ جناب زینبؑ بنتِ فاطمہؑ ہیں ذرا ادب سے بات کرو۔

اس پر ابن زیاد نے قہقہہ لگا کر کہا! شکر ہے اس خدا کا جس نے تمھیں قتل اور رُسوا کیا۔ جناب زینبؑ نے ایک دم اس کی طرف رُخ کیا اور برجستہ جواب میں فرمایا۔ رسوا اور جھوٹا وہ ہوتا ہے جو فاسق و فاجر ہو۔ ہمیں تو خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سبب سے فضیلت عطا فرمائی ہے اور ہمیں ہر قسم کی آلائش سے پاک و پاکیزہ قرار دیا ہے۔

اس پر پسر زیاد ذلیل کے لہجے میں بولا: پھر یہ بتاؤ کہ خدا نے تمہارے خاندان والوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ جناب زینبؑ نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ مشیت ایزدی میں یہی تھا کہ وہ شہید ہوں۔ پھر اُنھوں نے ان کی تعریف میں کہا کہ وہ بڑی بہادری سے لڑ کر اپنی منزل کی طرف چلے گئے۔ البتہ اب تو بتا کہ خدا کے حضور میں ان کی فریاد کا کیا جواب دے گا؟

جناب زینبؑ کے یہ جواب سُن کر ابن زیاد تملا گیا۔ اس نے غصے کی حالت میں وہی حربہ استعمال کرنا چاہا جو طاقتور کمزور کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ یعنی مارنے کے لئے چھڑی اُٹھائی۔ فوراً دربار میں ایک شخص عمرو بن حریث کھڑا ہو گیا اور کہا!! اے امیر! عورت کے ساتھ کسی بات یا سخت کلامی کا مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اس پر وہ رُک گیا اور جناب زینبؑ کو سزا تو نہ دے سکا مگر بڑبڑانے لگا اور زبان سے بڑے سخت اور دل کو چیرنے والے کلمے کہنے لگا۔

اس نے گرج کر کہا: تمہارے خاندان کے سرکشوں اور نافرمانوں کے قتل سے خدا نے میرے دل کو ٹھنڈا کر دیا۔ جنابِ زینبؑ تڑپ گئیں۔ ان کے دل میں یہ کلام تیر کی طرح لگا۔ بے ساختہ رو پڑیں اور روتے ہوئے ابنِ زیاد کو جواب دیا: "ہاں، ہاں! تُو نے اپنے دل کو ٹھنڈا کر لیا۔ ہمارے مردوں کو قتل کر کے اور اہلِ بیتؑ کو تباہ کر کے اپنے دل کو ٹھنڈا کرتا ہے! تو نے ہماری شاخوں کو کاٹ ڈالا اور جڑ کو اُکھاڑ دیا۔" اور کوئی ہوتا تو ایسے ظالموں کے سامنے اُس کی زبان بند ہو جاتی اور ایسی بے کسی میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکل سکتا تھا۔ لیکن یہ جنابِ زینبؑ ہی تھیں جنہوں نے کوفہ و شام کے بازار فتح کر لئے۔

جب ابنِ زیاد نے اپنے آپ کو ذلیل اور ناچیز ہوتے دیکھا اور اُسے کوئی جواب نہ بن آیا تو اپنی سُبکی مٹانے کے لئے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہنے لگا: دیکھو یہ عورت کتنی دلیر ہے اور اپنے باپ کی طرح کیسی مسجّع اور مقفّیٰ الفاظ میں باتیں کرتی ہے۔ جنابِ زینبؑ نے مظلومیت کے لہجے میں جواب دیا: عورت کو قافیہ بندی سے کیا مطلب اور دلیر سے کیا واسطہ۔ کیا اس حال میں میرا یہ وقت ہے کہ میں قافیہ بندی ملاؤں؟

ابنِ زیاد شرمندہ ہو کر ان کی طرف سے ہٹ گیا مگر اس کی نظر امام زین العابدینؑ پر پڑی، وہ بیڑیاں پہنے بیٹھے تھے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ تمہارا کیا نام ہے۔ اُنھوں نے آہستہ سے کہا میں علیؑ بن الحسینؑ ہوں۔ اس پر وہ حیرانی سے آنکھیں چیر کر کہنے لگا کیا علیؑ بن حسینؑ کو خدا نے قتل نہیں کیا؟ مولا اس ظالم کو کیا جواب دیتے، خاموش ہو رہے۔ پھر غصّے سے کہنے لگا، جواب کیوں نہیں دیتے؟ امامؑ نے نرم لہجے میں فرمایا: میرے بھائی علی اکبرؑ کو بھی لوگ علی بن الحسینؑ کہتے تھے، انھیں کربلا میں لوگوں نے قتل کر دیا۔ ایک دم ابنِ زیاد بولا۔ لوگوں نے نہیں، انھیں خدا نے قتل کیا ہے۔ امامؑ نے سر جھکا کر یہ آیت تلاوت فرمانی شروع کر دی: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ ہی موت کے وقت لوگوں کو وفات دیتا ہے اور کوئی شخص خدا کے حکم کے بغیر مر ہی نہیں سکتا۔

یہ مظلومیت سے لبریز اور ایسا معقول جواب تھا کہ ابن زیاد کو بھرے دربار کے سامنے شرمندگی محسوس ہوئی۔ مزاج میں تلخی آئی۔ حکومت کے زعم میں حکم دیا کہ یہ لڑکا جواب بہت دیتا ہے اسے باہر لے جا کر قتل کردو۔ یہ سُنتا تھا کہ جناب زینبؑ بیقرار ہوگئیں اور دوڑ کر ان سے لپٹ گئیں۔ رو رو کر کہنے لگیں۔ "جب تک مجھے بھی قتل نہ کردیا جائے، کوئی انھیں قتل نہیں کرسکتا۔" پھر ابن زیاد کی طرف مخاطب ہو کر فریاد کی۔ اے ابن زیاد! کیا اب بھی تو ہمارے خون بہانے سے سیر نہیں ہوا۔ ارے کیا تو نے ہمارے مردوں میں سے کسی کو باقی چھوڑا ہے؟

ابن زیاد سکتے والوں کی طرح حیران کچھ دیر انھیں اسی حالت میں دیکھتا رہا پھر اس نے لوگوں کی طرف مڑ کر تعجب سے کہا کہ اِس خون کے جوش پر تعجب ہوتا ہے واللہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بی بی تو اپنے بھتیجے کے ساتھ قتل ہونے کو تیار ہے۔! یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ اچھا! لڑکے کو چھوڑ دو اور یہی اپنی عورتوں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ رہیں گے۔

کچھ دیر دربار میں خاموشی رہی پھر ابن زیاد نے حکم دیا کہ اسیروں کو شہر میں تشہیر کیا جائے اور کوفے کے بازاروں کو سجایا جائے۔ جب بازار سج گئے اور کوٹھوں پر تماشا دیکھنے کے لئے عورتیں جمع ہوگئیں تو قیدیوں کا قافلہ بازاروں میں سے گزارا گیا۔ حال یہ تھا کہ آگے آگے نیزوں پر سر تھے اور پیچھے پیچھے بے کجاوہ اونٹوں پر بیبیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ پشت کی طرف باندھ رکھے تھے اور ان کی ردائیں اُتار کر سر برہنہ کر رکھا تھا۔ بیبیاں بال بکھرائے ہوئے چہروں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چاروں طرف آدمی ہی آدمی قیدیوں کا تماشا دیکھنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ کسی نے پوچھا۔ یہ کون ہیں۔ ایک افسر نے جواب دیا۔ یزید کے خلاف ایک شخص نے بغاوت کی تھی یہ ان باغیوں کے سر ہیں اور یہ ان کی عورتیں ہیں۔ جناب زینبؑ کا اونٹ قریب ہی تھا اُنھوں نے سُن لیا۔ ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے، گھٹنوں کے بل اونٹ پر کھڑی ہوئیں اور اس طرح مجمع کو خطاب کیا۔: يَا اَهْلَ الْكُوْفَةِ "اے کوفیو! کیا تم جانتے ہو کہ تم نے کس کا خون بہایا ہے؟ کس

کے جگر کو پارہ پارہ کیا ہے؟ کس کے اہلِ حرم کو بے پردہ کر رہے ہو؟ تم نے رسولؐ کے نواسے کو قتل کیا ہے؟ تم نے حسینؑ ابنِ علیؑ کا خون بہایا ہے اب اسے باغی کہہ کر اپنے جرم کو چھپا رہے ہو۔ یاد رکھو! تم نے اپنے عہد کو توڑ ڈالا ہے۔ تم کفر کی طرف لوٹ گئے ہو۔ تمہارا رونا اب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ تم نے فرزندِ خاتم الانبیاءؐ کو قتل کیا ہے۔ ہائے وہ فرزند۔ جو معدن الرسالت اور سردار جوانانِ جنت تھا۔ ہائے جو تمہارے لئے دلیلِ واضح تھا۔ روشن مینار تھا اور جائے پناہ تھا۔

دیکھو! آسمان سے خون برس رہا ہے۔ کیا آسمان سے خون برسنے پر تمہیں تعجب ہے۔ یہ خدا کی ناراضگی تم پر ظاہر ہو رہی ہے۔ تم ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہو گے۔ تم نے ایسا بُرا کام کیا ہے کہ قریب ہے کہ آسمان اور زمین پھٹ جائیں اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ خزیمہ اسدی نے خود جناب زینبؑ کا یہ خطبہ سُنا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی قسم میں نے ان سے زیادہ فصیح بولنے والا نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علیؑ بول رہے ہیں۔ مجمع کا یہ عالم تھا کہ تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ آدمیوں میں رونے کا کہرام برپا ہو گیا۔ لوگ دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کوٹھوں پر عورتوں کا تو یہ حال تھا کہ اپنے گریبان چاک کر کے چیخیں مار مار کر بُری طرح رو رہی تھیں۔ تماشہ کیا تھا کوفے کا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ جب شمر نے یہ دیکھا تو ابن زیاد کے پاس آدمی بھیجا۔ اس نے حکم دیا کہ جلدی جلدی تشہیر کیا جائے اور قیدیوں کو کہیں روکا نہ جائے تاکہ تقریر کرنے کا موقع نہ ملے۔

جب یہ قافلہ کوفے میں خوب تشہیر کرا لیا گیا تو ابن زیاد نے حکم دیا کہ تمام قیدیوں اور سروں کو یزید کے پاس دمشق میں لے جایا جائے اور امام زین العابدینؑ کو پاؤں سے گلے تک زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ شمر ملعون اور ایک اور بے رحم شخص نے انہیں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنائیں۔ گلے میں خاردار طوق پہنایا۔ پھر قافلے کو دمشق کی طرف یزید کے پاس لے چلے۔ بیمار امامؑ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ راستے میں انہیں اونٹ سے باندھ دیا گیا۔ پھر یہ ظالم اونٹوں کو بھگاتے ہوئے لے کر چلے۔

تاریخ طبری میں یہ لفظ لکھے ہیں کہ اتنے لمبے سفر میں بیمار امام سیدِ سجادؑ نے ان

دونوں میں سے کسی ایک سے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وجہ یہ تھی کہ سفر میں انھیں طوق اور زنجیروں سے جو تکلیف پہنچ رہی تھی اس میں سہولت کے لئے انھیں شمر اور اس دوسرے بے رحم آدمی سے کوئی اُمید ہی نہ تھی۔ ہائے بیمار امام تمام راستے صبر سے تکلیفیں برداشت کرتے چلے گئے۔

جب یہ قافلہ دمشق پہنچا تو شمر نے قافلے کو شہر سے باہر روک لیا اور یزید کو قافلہ آنے کی اطلاع بھجوائی۔ یزید نے اپنا دربار آراستہ کروایا۔ اور اپنے تخت کے سامنے سفارتی نمائندوں، بڑے بڑے افسروں اور شہر کے امیروں کے بیٹھنے کے لئے سات سو کرسیاں بچھوائیں۔ جب دربار آراستہ ہوگیا اور لوگ آ آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے تو آلِ محمدؐ کے اسیروں کو دربار میں بلایا گیا۔

ہائے مخدراتِ عصمت وطہارت کو سر برہنہ دربار میں لایا گیا۔ ایک ہی رسّی سے سب کے گلے بندھے ہوئے تھے۔ ساتھ میں بیمار کربلا تھے جن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور گلے میں خاردار طوق پہنایا گیا تھا۔ ان سب کو دربار میں داخل کرکے زمین پر بیٹھا دیا گیا۔ عورتیں جن کے گھر سے پردہ نکلا تھا۔ شرم سے گردن جھکا کر بیٹھ گئیں۔

تماشائیوں میں سے کچھ تو حیادار تھے، اُنھوں نے شرم سے اپنی نظریں جھکا لیں مگر کچھ اس قدر بے حیا تھے کہ عورتوں کو دیکھنے میں مشغول ہوگئے کہ اچانک ایک لرزہ خیز منظر دیکھنے میں آیا۔ اپنی کرسی پر سے ایک بے حیا شامی سردار کھڑا ہوگیا۔ اس کا رنگ سُرخ اور خوب موٹا تازہ تھا۔ اس نے جناب سکینہؑ کی طرف اشارہ کرکے یزید سے کہا۔ اے یزید! یہ لڑکی مجھے دے دے۔ جناب سکینہؑ نے جو یہ سُنا تو ڈر کر تھر تھر کانپنے لگیں اور دوڑ کر جناب زینبؑ سے لپٹ گئیں۔ اُنھوں نے بچی کو اپنی آغوش میں دبا لیا۔ اور وہیں بھرے دربار میں شامی کو جھڑک کر کہا: تو نے کمینہ پن کیا ہے۔ تو بیہودہ بکتا ہے۔ ارے تیری کیا ہستی ہے اور یزید کی کیا مجال ہے کہ ایسا کرسکے۔

اس پر یزید جوش میں کھڑا ہوگیا اور غصے سے بولا۔ تم غلط کہتی ہو۔ مجھے اختیار ہے،

اگر میں ایسا کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ فوراً جناب زینبؑ نے دندان شکن جواب دیا۔: ہاں تو ایسا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ تو ہمارے دین سے نکل جائے اور ہمارے دین کو چھوڑ دے۔ تب تو ایسا کر سکتا ہے۔

جب یزید نے دین کی بات سُنی تو حکومت کے زعم میں برہم ہو کر کہنے لگا۔ تم مجھ سے اس طرح گفتگو کرتی ہو۔ حالانکہ تمہارے ہی باپ اور بھائی نے دین کو چھوڑ دیا۔ جناب زینبؑ نے اُسے جواب دیا نہیں بلکہ تو نے اور تیرے باپ دادا نے ہی میرے بھائی، باپ اور نانا سے خدا کے دین کی ہدایت پائی ہے۔

یزید کے پاس کوئی دلیل تو تھی نہیں۔ یوں ہی جھلاہٹ سے دبانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے جھلاہٹ دیکھی تو صبر کے لہجے میں اس طرح جواب دیا۔ تو حاکم ہے اور غالب ہے۔ اپنی حکومت کے زعم میں گالیاں دیتا ہے۔ اور زبردستی کرتا ہے۔ درباریوں کے سامنے اس پر یزید کو حیا آگئی۔ اور اس نے کوئی جواب نہ دیا کچھ دیر کے لئے دربار میں خاموشی طاری رہی۔

پھر وہ ملعون شامی اُٹھا اور وہی کلمہ دہرایا: اے یزید اس کنیز کو مجھے دے ڈالئے۔ یزید نے ایک دم ڈانٹ کر کہا۔ دُور ہو۔ خدا تجھ کو موت دے کہ تیرا قصہ پاک ہو جائے۔

اس وقت یزید کے تخت کے نیچے ایک طلائی طشت رکھا ہوا تھا۔ اس نے طشت سے پردہ اُٹھایا۔ امام حسینؑ کا سر اس میں رکھا نظر آیا۔ یزید نے اپنی چھڑی سے امامؑ کے دانتوں کے ساتھ بے ادبی کرتے ہوئے فخر سے کہا: اے کاش! کہ آج میرے وہ بزرگ زندہ ہوتے جو جنگِ بدر میں مارے گئے تو دیکھتے کہ میں نے ان کا کیسا انتقام لیا۔

یہ دیکھ کر رسولؐ اللہ کے ایک بوڑھے صحابی ابوبرزہ اسلمی اُٹھ کھڑے ہوئے اُنھوں نے غصے سے تھرتھراتے ہوئے کہا: اے یزید! تیری چھڑی اور حسینؑ کا دانت! ارے یہ وہ جگہ ہے جہاں کے رسولؐ مقبول بوسے لیتے تھے۔ یزید اپنی سُبکی مٹانے کے لئے بے حیائی سے کہنے لگا۔ اگر تم رسولؐ کے صحابی نہ ہوتے تو تمہیں اسی وقت قتل کرا دیتا۔ اس پر صحابی نے رو کر کہا۔ ارے صحابی کا یہ احترام، اور دُخترِ نبیؐ کو قیدی بنا رکھا ہے۔

اسی اثنا میں ہندہ زوجہ یزید کو خبر ہو گئی کہ آلِ رسولؐ قیدی بنا کر دربار میں لائی گئی

ہیں۔ اس وقت وہ سنگھار میں مصروف تھی۔ بے قراری کے عالم میں روتی پیٹتی دوڑی ہوئی آئی اور سر برہنہ دربار یزید میں آ کھڑی ہوئی اور سر و سینہ پیٹ پیٹ کر نالہ و زاری کرنے لگی۔ یزید نے گھبرا کر فوراً اس کے سر پر ردا ڈالی اور سمجھاتا ہوا محل میں لے جانے لگا۔ یہ حال زینبؑ سے دیکھا نہ گیا۔ بے تاب ہو کر فرمایا:۔ اے آزاد کردہ غلاموں کی اولاد! کیا تیرا یہ انصاف ہے کہ تو اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو پردے میں رکھے اور رسولؐ زادیوں، ہائے فاطمہؑ کی بیٹیوں اور اُن کی ذریت کو بے پردہ کرکے اور قیدی بنا کر بازاروں میں پھرائے۔۔ ہائے! ان کے چہرے کھلے رکھے۔۔ اور ان کو سر برہنہ اونٹوں کی پشت پر ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے شہر سے تیسرے شہر تشہیر کرائے تاکہ لوگ ان کا تماشہ دیکھیں۔ یزید اور اُس کے درباریوں نے شرم سے اس طرح سر جھکا لئے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہوں۔

اَلَا لَعْنَتُ اللّٰہِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْن ہ

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْن ہ

☆☆☆

تمت الخیر

☆☆☆☆☆

حدیث خوانی کے لئے بہترین کتب

ذخیرۃ المجالس ۴ جلدیں ۔/۳۰۰ از حکیم غلام حیدر کرار	ریاض القدس فضائل ومصائب ۲ جلدیں ۔/۵۵۰	دمعۃ الساکبہ ۲ جلدیں ہدیہ ۔/۵۵۰
نعیم الابرار مولانا غلام حسین آف ساہیوال ۵ جلدیں فی جلد ۔/۱۵۰	مصائب آلِ محمد از مولانا محمد موسیٰ بیگ مدرس ہدیہ ۔/۲۰۰	نسیم المجالس علامہ نسیم عباس ۲ جلدیں ۔/۲۵۰
کفایت الواعظین علامہ حافظ کفایت حسین مرحوم ۳ جلدیں ۔/۲۲۵	دُر المصائب از مولانا محمد موسیٰ بیگ مدرس ہدیہ ۔/۲۰۰	گوہر غم از ذاکرہ غدیر فاطمہ مرحومہ ۲ جلدیں ۔/۱۱۰
نفس المہموم (از شیخ عباس قمی) ہدیہ ۔/۳۰۰	معالی السبطین فضائل ومصائب ۲ جلدیں ۔/۲۵۰	اسرار الٰہیہ تقاریر علامہ حافظ تصدق حسین ۔/۱۲۵
خطبات محسن (از محسن نقوی) ۲ جلدیں ۔/۲۵۰	اسرار کبریا علامہ غضنفر عباس تونسوی ۔/۱۵۰	ولائت معصومینؑ تقاریر علامہ حسن ظفر نقوی ہدیہ ۔/۱۲۵

افتخار بک ڈپو (رجسٹرڈ) اسلام پورہ لاہور۔ پوسٹ کوڈ 54000

مجلسوں کے کورس کی پہلی کتاب

ذخیرۃ المجالس حصہ اوّل

مرتبہ

جناب حکیم سیّد غلام حیدر کرار مرحوم

جلسہ ہائے سالانہ درگاہ نجف الہند جوگی پورہ ضلع بجنور ۵۲-۱۹۵۱ء میں ملک کے ممتاز علماء کی ہزاروں کے مجمع میں پڑھی ہوئی چودہ مقبول مجلسوں کا مجموعہ ہے۔ ضخامت ۱۳۲ صفحات قیمت

تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلی، ساتویں اور نویں مجلس	جناب قبلہ وکعبہ مولانا سید عدیل اختر طاب ثراہ۔ پرنسپل مدرسۃ الواعظین، لکھنؤ
دوسری، گیارھویں اور چودھویں مجلس	جناب قبلہ وکعبہ مولانا کلب حسین صاحب مجتہد مرحوم، لکھنؤ
تیسری، چھٹی، آٹھویں گیارھویں اور تیرھویں مجلس	جناب قبلہ وکعبہ مولانا علی نقی صاحب مجتہد، لکھنؤ
چوتھی اور دسویں مجلس	مولوی شمس الحسن صاحب کوئیلی۔ بجنور۔
پانچویں مجلس	مجتبیٰ حسین صاحب بارھوی

ملنے کا پتہ

افتخار بکڈپو (رجسٹرڈ) اسلام پورہ، لاہور نمبر ۱

امامیہ جنتری (رجسٹرڈ)

ہر سال نئے سنہ عیسوی، ہجری و بکرمی کی مکمل تقویم اور نوروز عالم افروز کا
زائچہ اور پیش گوئیاں، دنیاوی حالات، قمر در عقرب کا سال بھر کا نقشہ،
فہرست تعطیلات، سیاسیات عالم، بارہ برجوں کے سعد و نحس کے علاوہ ہر
سال نئے نئے مضامین تقویم و نجوم، مذہبی، علمی، ادبی، فنی، معاشی اور دیگر
ضروری موضوعات پر نہایت مفید مضامین پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر سال
زیر طبع ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر بہت جلدی ختم ہو جاتی ہے۔
آفسٹ طباعت، عمدہ کاغذ، بہترین کتابت، دیدہ زیب رنگین ٹائٹل۔

اپنے شہر کے قریبی بک سٹال سے خریدیئے۔

ناشر
افتخار بک ڈپو (رجسٹرڈ) اسلام پورہ، لاہور۔

MAIN BAZAAR, ISLAMPURA, LAHORE.
92 42 722 3686 ALADIN@BRAIN.NET.PK